حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

قرآنی افادات



جمع و ترتیب : احمد حقانی ندوی

محمد الحسنی ٹرسٹ

طبع چہارم

ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ ——— جنوری ۲۰۰۸ء

نام کتاب ——— قرآنی افادات
نام مؤلف ——— مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
نام مرتب ——— ر۔ احمد حقانی ندوی
کمپوزنگ ——— ناشر کمپیوٹر لکھنؤ
صفحات ——— ۵۶۸
طباعت ——— کاکوری آفسیٹ پریس لکھنؤ
تعداد ——— ۱۱۰۰
طابع وناشر ——— محمد الحسنی ٹرسٹ، تکیہ کلاں، رائے بریلی
اسٹاکسٹ ——— ندوی بکڈپو لکھنؤ

ہدیہ -/140 روپے

﴿ملنے کے پتے﴾

(۱) مجلس تحقیقات ونشریات اسلام پوسٹ بکس 119 لکھنؤ
(۲) مکتبہ ندویہ، پوسٹ بکس 93 لکھنؤ

عرض ناشر

کچھ ہی دن پہلے ایم حسنی ٹرسٹ قائم کیا گیا۔اس کے پیش نظر جہاں اور مقاصد ہیں ان میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ مولانا محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ (جن کے نام پر یہ ٹرسٹ بنایا گیا) کی کتابیں اور رسالے خاص طور پر شائع کیے جائیں جس کی ابتداء انہی کے ایک رسالہ "آج بھی دنیا اسی در کی محتاج ہے" کی اشاعت سے کی گئی جو بیک وقت اردو ہندی اور انگریزی میں شائع ہو کر مقبول ہوا۔ اب اللہ تعالٰی کے فضل اور توفیق سے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کے قرآنی افادات شائع کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے جو مولوی ر۔احمد حقانی ندوی نے بڑی عرق ریزی محنت اور شوق سے جمع کیے ہیں۔ اللہ تعالٰی افادات سے استفادہ کو عام فرمائے اور ٹرسٹ کو قبول فرمائے اور اس کے تمام کاموں کو باعث اجر و ثواب بنائے۔ آمین

عبداللہ حسنی ندوی
دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
یکم محرم ۱۴۲۰ھ

عرض ناشر

(طبع دوم)

الحمد للہ قرآنی افادات کا پہلا اڈیشن ختم ہوا۔ جس کی تعداد اشاعت دو ہزار تھی، ضرورت کے تحت ضمنی اڈیشن (تعداد ایک ہزار) بھی طبع ہوا۔ کتاب میں پروف ریڈینگ کی کچھ غلطیاں تھیں ان کی درستگی کا کام کرا کے دوسرا اڈیشن پیش خدمت ہے۔

پہلے اڈیشن کو ہر اعتبار سے پسند کیا گیا۔ نفس کتاب کی افادیت کا خاص و عام نے اعتراف کیا۔ ٹرسٹ اس حوصلہ افزائی پر احسان مند ہے اور شکر گزار ہے۔ خاص طور پر ہمارے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے دعاؤں سے نوازا تھا۔ اب حضرت مولانا ہمارے درمیان نہیں رہے۔ اللہ تعالٰی اس کام کو آپ کے حق میں رفع درجات کا ذریعہ بنائے اور ہم سب کو توفیق دے کہ ان کے کاموں کو آگے بڑھائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ خلق خدا کو نفع پہنچے۔

ہم اللہ تعالٰی سے دعا کرتے ہیں کہ اس اڈیشن کو بھی قبول عام عطاء فرمائے۔ آمین۔

محمد الحسنی ٹرسٹ
تکیہ کلاں میدان پور، رائے بریلی
یوپی، انڈیا۔

رجب/۱۴۲۱ھ
اکتوبر/۲۰۰۰ء

فہرست ابواب ومضامین

باب (۲) دعوت و عزیمت ۵۹-۹۶

باب (۳) ایمان واستقامت ۹۷-۱۴۶

باب (۴) دین و عبادت ۱۴۷-۱۹۲

باب (۵) تہذیب ومعاشرت ١٩١-٢٤٠

باب (٦) تعلیم وتربیت ٢٤١-٢٧٦

باب (۷) احکام و مطالبات ۲۷۷-۳۳۴

باب (۸) فرائض اور ذمہ داریاں ۳۳۵-۳۹۸

باب (۹) نبی رحمت اور مقدس مقامات ۳۹۹-۴۳۰

باب(۱۰) مادی افکار و نظریات ۴۳۱-۴۶۰

باب(۱۱) قانون مکافات ۴۶۱-۵۰۰

باب (١٢) عبرت و موعظت ٥٠١-۵۴٧

باب (١٣) قصص وواقعات ۵۴٩-٥٦٨


بسم الله الرحمن الرحيم

کلمۂ دعا

الحمد لله والصلاة والسلام علی رسول الله ﷺ و آله وصحبه وسلم ۔اما بعد:

خاکسار راقم نے عزیز گرامی قدر مولوی ر۔ احمد حقانی ندوی اطال اللہ عمرہ و زادہ توفیقا کی مرتب کردہ کتاب "قرآنی افادات" پر نظر ڈالی جو تمام تر اس راقم کی تحریروں، دعوتی تقریروں، اور تصانیف ورسائل کے اقتباسات پر مشتمل ہے، تو اپنی ہی مستور و مخفی اور منتشر و منقسم توفیقات و بیانات کی دستیابی کی اطلاع اور ان کو مجموعی شکل میں یکجا دیکھ کر وہ خوشی ہوئی جو کسی کو اپنی عزیز ترین متاع کی گمشدگی یا پردہ پوشی کے بعد دوبارہ مل جانے پر خوشی ہوتی ہے۔

عزیز موصوف کی یہ محنت، ذوق سلیم، قدر شناسی، اور حسن انتخاب خود اس راقم کی طرف سے (جس کی تحریروں اور تقریروں کے یہ اقتباسات ہیں) موجب حیرت بھی ہے اور باعث مسرت بھی اور الحکمۃ ضالۃ المؤمن" کا مصداق بھی۔

یہ خود راقم کے حق میں ایک گمشدہ یا منتشر و مستور حقائق قرآنی اور تعلیمات ایمانی کا مجموعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ سے زیادہ نفع پہنچائے اور بہت سے فراموش کردہ اور فراموش شدہ حقائق و عبرتوں اور مواعظ و حکمتوں کو ذہنوں میں تازہ اور دل ودماغ میں جاگزیں بنائے۔

وماذلك علی الله بعزیز۔

ابوالحسن علی ندوی
دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی
۲۵/ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ

تأثرات

از : جناب مولانا شمس الحق صاحب ندوی
اڈیٹر تعمیر حیات واستاذ ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

زمانۂ طالب علمی کے ابتدائی درجات ہی سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ العالی کے ہفتہ واری تفسیری درس میں -جو مرکز دعوت و تبلیغ کچہری روڈ پر ہوا کرتا تھا۔ حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، یہ زمانہ اگرچہ ہماری کم عمری اور کم علمی کا زمانہ تھا- لیکن حضرت مولانا مدظلہ کی ذات سے عقیدت و محبت روز اول ہی سے دل میں رچ بس گئی تھی، جس کی تاویل محض فضل خداوندی کے سوا کچھ اور سمجھ میں نہیں آئی-!

دل کی سادہ تختی پر اس بندہ خود آگاہ کی محبت ثبت ہو گئی جو اپنے معاصر کے سارے اولیاء اللہ اور علماء ربانیین کا منظور نظر اور ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک رہا۔

اتانی ھواھا قبل ان اعرف الھوی

فصادف قلبا خالیاً فتمکنا

حضرت مولانا مدظلہ کا طرز کلام اور اسلوب بیان چونکہ علم کلام اور منطق و فلسفہ کے بکھیڑوں سے پاک، سادہ و دلکش ہوتا۔ اس لئے ایک کم سن کی عقل بھی اس کو قبول کرتی جاتی گو اس کو بیان نہ کر سکے۔

جیسے جیسے عقل و شعور ترقی کرتے گئے مولانا مد ظلہ کی تحریروں سے تعلق و مناسبت نے عشق و وارفتگی کا درجہ حاصل کر لیا۔ ضخیم اور مفصل کتابوں کے پڑھنے کے لئے تو وقت و استعداد دونوں کی ضرورت تھی۔ لیکن رسالوں اور مضامین کا پڑھنا۔ خواہ عربی کے ہوں یا اردو کے۔ معمول بنا رہا۔!

مولانا مد ظلہ کے مضامین و رسالوں میں وقت اور موضوع کی مناسبت سے کسی نہ کسی آیت کی تشریح سب میں نہیں تو بیشتر میں ضرور ہوتی جو اپنے اندر ایک اچھوتا اور مطابق حال انداز رکھتی۔ اور ادھر دس پندرہ سالوں میں تو شاید ہی کوئی تقریر ہوتی ہے جس کا مرکزی مضمون موضوع کی مناسبت سے کوئی آیت کریمہ نہ ہوتی ہو۔!

پڑھ پڑھ کر دل میں خیال آتا تھا کہ ان تفسیری آیتوں کو جمع کر کے کتابی شکل میں لانے کی سعادت حاصل کروں۔ لیکن یہ خیال...... خیال ہی بن کر رہ گیا۔! کئی بار حضرت مولانا مد ظلہ سے عرض کیا کہ حضرت قرآن کا مطالعہ کس طرح کروں؟ ہر بار یہی جواب ملا کہ۔ "قرآن کی تلاوت اپنے کو مخاطب سمجھ کر کرو۔ معانی کھلتے جائیں گے۔" کبھی یہ بھی فرما دیتے کہ "ہمارے مضامین قرآن کا مجموعہ"، "مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی"۔ دیکھ لو"!

ہم حضرت مولانا مد ظلہ کے مضامین قرآن کی ترتیب و جمع کا خیال ہی باندھتے رہے۔ کہ معلوم ہوا عزیز خوش نصیب مولوی رسال الدین احمد حقانی ندوی نے یہ کام شروع کر دیا ہے۔ بڑی مسرت ہوئی۔ وقفہ وقفہ سے ان سے پوچھتا بھی رہا کہ کام کہاں تک پہونچا۔

اور اب خدا کا شکر ہے کہ وہ اس کام کو تکمیل تک پہونچا چکے ہیں اور وہ کتابی شکل میں شائع ہونے جا رہا ہے...... ان مضامین کے جمع و ترتیب میں (مولانا محمد الحسنیؒ جو حضرت مولانا مد ظلہ کی اکثر تحریروں کے مترجم بھی رہے اور عربی رسالہ "البعث الاسلامی" اور اردو میں پندرہ روزہ "تعمیر حیات" کے مؤسس و بانی بھی، کے فرزند ارجمند) عزیز مکرم مولانا سید عبد اللہ حسنی ندوی کے مشورے اور رہنمائی دونوں برابر شریک رہے۔ جس سے یہ کتاب "حسین گلدستہ قرآن" کے قالب میں ڈھل گئی!

اس کا مطالعہ نہ صرف یہ کہ ہر خاص و عام کی اصلاح و تربیت کے لئے مفید ہے بلکہ علماء و طلباء کے

لئے قرآن فہمی سے مناسبت پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ وسیلہ ہے جزاہ اللہ خیراً -!

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ عزیز موصوف کا یہ شوق علم برابر بڑھتا رہے اور ان کو مفید خدمات کی توفیق مزید ملے! (آمین)

خاکسار

شمس الحق ندوی

۱۰/ ۳/ ۱۴۱۸ھ

تعارف

از: مولاناسید عبداللہ حسنی ندوی
استاد حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

الحمدللہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سیدالمرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین ومن تبعھم باحسان الی یوم الدین.

اما بعد!

قرآن مجید ایک زندہ جاوید اور عالم گیر کتاب ہے۔ اس میں ہر عہد، ہر نسل، اور ہر حالات کے لئے رہنمائی ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو معجزہ کے طور پر عطا فرمایا۔ تمام انبیاء علیہم السلام کو معجزے عطا کئے جن میں زمانہ کے حالات اور تقاضے، لوگوں کے جذبات و رجحانات اور زمان و مکان کے حدود و قیود کا خیال رکھا گیا۔ اسی لئے اس وقت ان معجزات کا وجود نہیں، جو آسمانی کتابیں تھیں وہ تحریف کا شکار ہو چکی ہیں۔ جس کا اعتراف خود یہودی اور عیسائی محققین و مصنفین نے کیا ہے، لیکن جو معجزہ حضرت رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا وہ ایک ایسا لازوال، دائمی، تازہ اور تابندہ ہے جو آج تک اسی طرح جدید اور زندگی سے لبریز، اور قیادت و رہنمائی کی صلاحیت سے بھرپور ہے۔ انسانی عالمی مشکلات اور پیچیدگیوں کا بہترین حل پیش کرتا ہے، زندگی کا آئینہ اور مرقع ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں:

قرآن مجید مجموعی حیثیت سے بھی معجزہ ہے اور جزوی حیثیت سے بھی معجزہ ہے۔ یعنی اس کی ایک ایک آیت معجزہ ہے، ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید معجزہ ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں کی اس پر نظر ہے

کہ قرآن مجید کی ہر آیت مستقل ایک معجزہ ہے اور اس کا اعجاز مختلف زبانوں میں اور مختلف زمانوں میں اور مختلف حالات میں اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ آفتاب کی مثال دینا بھی بے ادبی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی خصوصیت ہے کہ ایک مرتبہ نہیں سو مرتبہ نہیں ہزاروں مرتبہ پڑھا جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ قرآن آج ہی نازل ہوا ہے"

قرآن مجید ایک خزانۂ عامرہ ہے، ایک بحر عمیق ہے، جس میں آبدار اور بیش بہا موتیوں کی کمی نہیں، آدم کے سارے کنبہ کو عالم انسانی کے ہر ہر فرد کو اس میں سے تقسیم کیا جائے تو بھی کمی واقع ہونے والی نہیں۔

حضرت مولانا مدظلہ العالی دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں "بڑے بڑے فرمانرواؤں، سرمایہ داروں اور دولت مندوں کو دینے کے لئے اگر کوئی چیز ہے اور جو اضافہ کر سکتی ہے، دنیا بدل سکتی ہے، قسمت چمکا سکتی ہے وہ قرآن مجید کی بھیک ہے"۔

قرآن مجید تحت الثریٰ سے اٹھا کر افلاک و ثریا پر پہونچا سکتا ہے اور جو لوگ اس پر عمل نہیں کرتے ہیں ان کو منھ کے بل گرا دیتا ہے، یہی قرآن مجید ہے جس نے عرب کے خانہ بدوشوں، صحرا نشینوں جن کے پاس پیٹ بھرنے کو کھانا تھا، نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا۔ کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ جو ساربان تھے ان کو جہاں بان بنا دیا۔

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

یہی قرآن مجید ہے جس نے عرب کے بدووں کو، خانہ بدوشوں کو جن پر دنیا کی توجہ بھی نہ ہوتی تھی۔ ع

"جہاں بان و جہاں دار و جہاں آرا"

بنا دیا، انھوں نے قیصر و کسریٰ کے تاج کو پاؤں سے روندا اور ان کے تخت سلطنت پر ایسے بے تکلف بیٹھے جیسے بوریے پر بیٹھے ہیں۔

در شبستان حرا خلوت گزید　　قوم و آئین و حکومت آفرید

ماند شبہا چشم او محروم نوم　　تا بہ تخت خسروی خوابیدہ قوم

غار حراء میں ایک کمبل پوش نے چند راتیں گذاریں، ایک قوم پیدا کر دی، ایک آئین دیا، ایک حکومت بنا دی، اس کی آنکھیں چند راتیں نیند سے محروم رہیں لیکن اس کی قوم تخت خسروی پر سونے کے لائق ہو گئی۔ اس نبیؐ امی کے غلام قیصر و کسریٰ کے تخت پر قابض ہو گئے۔

قرآن مجید مٹی کو اکسیر بناتا ہے اور جو اسکی ناقدری کرتا ہے وہ اکسیر ہوتا ہے تو اس کو مٹی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ اللہ کا بے لاگ قانون ہے، یہ دو دھاری تلوار ہے اگر اس کا استعمال صحیح نہیں ہوا، ناقدری کی گئی تو قوموں کا کام تمام کر سکتی ہے۔ اللہ کا قانون بے لاگ ہوتا ہے اور ہر غیور قانون کسی حد تک بے لاگ ہوتا ہے، ہر باعزت شخص کی بات کی لاج ہوتی ہے، احترام ہوتا ہے حکومتوں کا قانون جب جب نافذ ہو جاتا ہے تو اس کا احترام لازمی ہو جاتا ہے"۔

ان اقتباسات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا مدظلہ نے قرآن مجید کا مطالعہ ایک زندہ جاوید کتاب، ایک ہدایت نامہ بلکہ ایک ذاتی کتاب کی طرح کیا ہے جو براہ راست ان سے مخاطب ہے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"میں نے قران مجید کو اس نظر سے پڑھا کہ وہ ایک زندہ کتاب اور ایک بولتا ہوا مرقع اور آئینہ ہے، جس میں افراد بھی اپنے چہرے دیکھ سکتے ہیں، قومیں بھی اپنی صورتیں دیکھ سکتی ہیں اور قوموں، سلطنتوں، تمدنوں کی ترقیات و عروج کے انجام بھی اس کتاب میں دیکھے جا سکتے ہیں"۔

اسی لئے دوسرے تلاوت کرنے والوں اور پڑھنے والوں کو مشورہ دیتے ہیں:

"قرآن مجید کو اپنی ذاتی کتاب سمجھا جائے، یہ کتاب ابدی ہے، آسمانی ہے، لیکن میری ذاتی کتاب بھی ہے، میرا ذاتی ہدایت نامہ بھی ہے، اس میں میری ذاتی کمزوریاں بھی بیان کی گئی ہیں، میرے ذاتی امراض کی نشاندہی کی گئی ہے، قرآن مجید میں ہر آدمی اپنے کو تلاش کر سکتا ہے، یہ جب ہوگا کہ آپ اس کو زندہ کتاب سمجھیں، یا اپنی کتاب سمجھیں، اور آپ میں اپنی اصلاح کا جذبہ ہو، لوگوں کی اصلاح تو بعد

میں ہو گی پہلے اپنی اصلاح ہو جائے"۔

اس طرح قرآن مجید کے مطالعہ نے حضرت مولانا مدظلہ کو قران مجید کے خزانہ عامرہ کی دولت سے مالامال کر دیا، مفسر قران حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمہ اللہ کے اسباق میں حاضری اور استفادہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں سالہاسال قرآنی اسباق کے درس اور افادہ نے قرآن کا ذوق پیدا کیا، مزید عربی زبان وادب میں مہارت اور دستگاہ کامل نے اس کا ذائقہ بھی پیدا کر دیا، جس کے بغیر عربی زبان کی لطافت ووسعت، اس کی گہرائی اور گیرائی کا سمجھنا بہت مشکل اور دشوار ہوتا ہے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"میں قرآن مجید کا ایک حقیر طالب علم ہوں، اور واقعہ یہ ہے کہ میری تمام فکر، تحریر و تقریر اور اظہار خیال کا مظہر اور مرکز بلکہ اس کا سرچشمہ قرآن مجید کا محدود مطالعہ ہے، چھوٹا منہ بڑی بات ہو گی لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ:

آنچہ کردم ہمہ از دولت قرآن کردم

اللہ تعالیٰ نے جو کچھ لکھنے پڑھنے کی توفیق دی اور اپنے مطالعہ کا حاصل پڑھنے والوں کے سامنے رکھ دیا، وہ سب قرآن مجید ہی کا فیضان ہے"۔

جو حضرات اس خزانہ عامرہ کی دولت پارہے تھے، اور اس بحر کی غواصی میں لگ چکے تھے وہ حضرت مولانا کی اس صفت اور ذوق سے واقف اور آگاہ تھے، جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ بانی جماعت تبلیغ نے خاص موقع پر خاص انداز سے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "جایئے دولت قرآن مبارک ہو"۔

جہاں تک خوردوں کا تعلق ہے وہ ایک عرصہ سے قرآن کے ذوق آشنا اور اس کے معانی اور مفاہیم سے گہری واقفیت و آگہی رکھنے والے کی حیثیت سے مولانا سے تفسیر لکھنے کی درخواست کرتے چلے آرہے ہیں، لیکن ابھی تک درخواست قبول نہ ہو سکی، وجہ اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو جتنا عظمت و جلال کلام الٰہی سے واقف ہوتا ہے اتنا ہی اس کے لئے اس کا بیان اور تفسیر دشوار ہوتی ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ رمضان المبارک میں درس قرآن کا سلسلہ شروع ہو گیا جو الحمدللہ جاری ہے، اور

کئی پارے ٹیپ ہو چکے ہیں اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مد ظلہ کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور درس پایۂ تکمیل کو پہونچے، اس سے افادۂ قرآنی کی ایک اچھی شکل سامنے آسکتی ہے۔

ایک عرصہ سے یہ خیال تھا کہ مولانا کی تقریروں اور تحریروں میں سے ان مختصر آیات قرآنی کو یکجا کر دیا جائے، جن میں مولانا نے اپنے البیلے اور اچھوتے انداز سے کلام کیا ہے، اور نئے نئے نکتے پیدا کئے ہیں، ان میں ایسی آیات ہیں جو بار بار دہرائی گئی ہیں، لیکن ہر تقریر اپنے اندر نئے نئے نکتے، ہر تحریر اپنے جلو میں نئے نئے اشارے رکھتی ہے، اگر ان کو سلیقے سے جمع کر دیا جائے، تو ایک حسین گلدستہ تیار ہو سکتا ہے، کیوں کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض بڑے اہم نکات، بڑی اہم اور ضروری ہدایات اور تعلیمات پرچوں اور ماہناموں کی فائلوں میں، پمفلٹس اور کتابچوں کے انبار میں اور بڑی کتابوں کے اوراق میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔

محبّ عزیز مولوی رسال الدین احمد حقانی ندوی (ناظم ادارہ شباب اسلامی۔ دہرہ دون) سب کی مبارکباد کے مستحق ہیں جن کے سپرد یہ کام کیا گیا، انھوں نے بڑی محنت و کاوش اور تلاش و جستجو سے حضرت مولانا مد ظلہ کے اکثر و بیشتر کتابچے، مختلف پرچوں میں شائع شدہ تقریریں دیکھیں، اور کچھ چیزیں ٹیپ سے بھی نقل کیں، اور نہایت سلیقہ مندی سے یہ مجموعہ تیار کر دیا، جن میں ایسے مضامین آگئے ہیں جو جدید نسل کے لئے رہنما اصول کی حیثیت رکھتے ہیں، جن میں تہذیب جدید کے چیلنجوں کا جواب بھی ہے، جاہلیت کی تصویر کشی بھی ہے، دور جدید کی جاہلیت اور جاہلیت اولیٰ کا موازنہ بھی ہے، اس میں عقائد و ایمانیات کی اہمیت بھی بتائی گئی اور اصلاح حال کا سبق بھی دیا گیا ہے۔ غرض کہ یہ ایک ایسا حسین گلدستہ ہے جس میں ہر طرح کے پھول ہیں۔ ایک ایسا منارہ نور ہے جو گم گشتہ راہوں اور فکری بے راہ روی کے شکار لوگوں کے لئے ایک نعمت ہے۔

اللہ تعالیٰ اس محنت کو قبول فرمائے اور اس سے استفادہ کو عام فرمائے۔

عبد اللہ حسنی

دائرہ شاہ علم اللہ

۲۰/۱/ ۱۴۱۸ھ

(استاد حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

تقدیم

از : مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی
مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ کے تفسیری افادات

جمع و ترتیب

از - مولوی رسال الدین احمد حقانی ندوی

قرآن مجید وہ آخری آسمانی صحیفہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے آخری نبی حضرت محمد مصطفی ﷺ پر نازل فرمایا اور اس کیلئے طے فرمایا کہ یہ بغیر کسی تبدیلی و تغیر کے قیامت تک باقی رہے گا، اس کو گذشتہ آسمانی صحیفوں کی طرح بگاڑا یا بدلا نہ جاسکے گا، بد باطن اور بد خواہ لوگ اس میں وہ رد و بدل نہ کر سکیں گے جو انھوں نے تورات و انجیل جیسے عظیم آسمانی صحیفوں کے ساتھ کیا اور صحیفوں کو ضائع بھی کر دیا۔

چونکہ تورات و انجیل کے بعد قرآن آنے والا تھا اس لئے گذشتہ صحیفوں میں کئے گئے رد و بدل کا نقصان قائم و جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ کیونکہ ان کے رد و بدل سے جو خرابی صحیح دین و شریعت میں آرہی تھی وہ نئے رسول محمد ﷺ اور نئی کتاب قرآن مجید سے دور کر دی جانے والی تھی اور چونکہ محمد ﷺ کے بعد قیامت تک کوئی نیا رسول نہیں آنا ہے اور نہ قرآن مجید کے بعد کوئی نئی آسمانی کتاب آنی ہے اس لئے حضرت محمد ﷺ قیامت تک کے لئے رسول بنائے گئے اور قرآن مجید قیامت تک کے لئے معتبر آسمانی کتاب قرار دی گئی اس طرح ان دونوں سے حاصل ہونے والی شریعت قیامت تک قائم و دائم

رہنے والی شریعت ہوئی اور ان دونوں سے حاصل ہونے والا دین قیامت تک رہنے والا دین ہوا اور جب یہ دونوں آخری اور قیامت تک قائم رہنے والے قرار پائے تو ان میں تغیر و تبدل اور فناء کی گنجائش باقی نہیں رہی، ان کے ذریعہ تا قیامت انسانوں کے لئے صحیح شریعت اور صحیح دین جاننے کا موقع باقی رہے گا اور کسی کو کہنے کا موقع نہ ہوگا کہ ہمارے سامنے صحیح دین و شریعت موجود نہ تھی، لہٰذا اب یہ دین صرف یہی نہیں کہ محفوظ ہے اور تا قیامت کام دینے والا ہے بلکہ یہ اپنے ایک ایک جزء کے لحاظ سے بعینہ وہی دین ہے جو آج سے چودہ سو سال قبل تھا، نماز وہی ہے جو صحابہ کرام پڑھتے تھے اور حضور ﷺ نے پڑھنے کو بتایا تھا اور پڑھ کر دکھایا تھا۔ روزہ وہی ہے جو آپ نے رکھا اور بتایا تھا اسی طرح دوسری عبادات سب اول عہد کی انہی شکلوں میں ہیں جن کو حضور ﷺ نے بتایا تھا اور خود بھی عمل کیا اور آپ کے صحابہ نے کیا تھا، ان کے بعد ان کے دیکھنے والوں نے، پھر ان کو دیکھنے والوں نے کیا تھا، ایمان و اخلاق اور مومنانہ اور منافقانہ و کافرانہ صفات کا جو تذکرہ قرآن مجید میں کیا گیا ہے وہ اسی طرح آج بھی اس میں پایا جاتا ہے اور اسی طرح پڑھا اور سمجھا جاتا ہے جس طرح عہد اول میں پڑھا اور سمجھا جاتا تھا، اس محفوظیت اور بقاء کامل کی صورت میں دین کے مختلف معاملات اور اعمال کے انجام دینے میں آج زمانہ کے طویل ہو جانے پر اگر کوئی فرق ملے گا تو وہ صرف اخلاص نیت اور جذبہ ایمانی کا ملے گا، یہ وہ بات ہے جو ایمان کے فرق کے لحاظ سے ایک شخص میں دوسرے شخص کے مقابلہ میں ہو سکتا ہے، اس کی بنا پر جس میں جذبہ اور ایمانی کیفیت جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی اس کی عبادت درجہ قبول تک پہونچے گی اور یہ کیفیت جتنی کم ہوگی اتنی ہی وہ عبادت نا قابل قبول ہوگی۔

قرآن و حدیث کی ہدایات کے مطابق عبادات و اعمال کی شکلیں اور طریقہ سب عہد اول سے متعین ہو چکے ہیں اور ان پر عمل کرنے والوں کے عمل میں نظر آتے ہیں اور اگلوں کو دیکھ کر پچھلوں میں منتقل ہوتے ہیں اور قرآن و حدیث کے ارشادات سے ان کے صحیح شکل میں رہنے کی نگرانی ہوتی رہتی ہے۔

قرآن و حدیث کے باقی رہنے کا یہ اثر ہے کہ دین اسلام پورا پورا اپنی تفصیلات کے ساتھ باقی ہے اور یہ بات صرف دین اسلام کے ساتھ مخصوص ہے ورنہ دنیا میں اس وقت کوئی دین اپنی اصلی شکل میں

باقی نہیں ہے، کیونکہ کسی دین کی صحت کی نگرانی کے لئے اس کی شریعت کو تفصیل سے بتانے والی کوئی اولین کتاب اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں ہے۔

قرآن مجید کی اس اہمیت کے ساتھ کہ وہ دین اسلام کے بقاء و حفاظت کا تاقیامت ذریعہ ہے اس کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ اللہ رب العالمین کا کلام ہے، قرآن مجید کے علاوہ کوئی اور اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہیں ہے، ایک تو ہر آسمانی صحیفہ میں ردوبدل ہوتا رہا ہے، پھر اس کو ایک زبان سے دوسری زبان میں دوسری سے تیسری میں ترجمہ کیا گیا ہے، اور ترجمہ میں اصل اپنی صحیح حالت میں منتقل نہیں ہوپاتی اس طریقہ سے صاحب کلام کے تقدس کی کیفیت بھی ترجمہ شدہ کلام میں باقی نہیں رہتی ہے۔

لیکن قرآن مجید وہ کلام الٰہی ہے جو خود اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے استفادہ کے لئے انسانی الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے تاکہ انسان اس کو سمجھ سکے اور اپنی زبان سے اس کو ادا کرسکے، اللہ رب العالمین کا کلام ہونے کی وجہ سے اس کو عظمت و تقدس کا اس کے لائق مقام حاصل ہے اس کے اس اعلیٰ مقام کو کہیں تو اس طرح بتایا گیا ہے کہ "ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَارَيْبَ فِيْهِ، هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" کہ یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شبہ نہیں، یہ تقوی اختیار کرنے والوں کے لئے ہدایت ہے، اور کہیں فرمایا "لَايَمَسُّهٗ إِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ" (اس کو نہیں چھوئے مگر پاکیزگی والے لوگ) اور کہیں فرمایا کہ "إِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ، لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ۔ الخ۔ (اس کو ہم نے قدر کی رات میں اُتارا اور جانتے ہو کہ قدر کی رات کیا ہے، قدر کی رات ہزار مہینوں سے افضل ہے، اس میں فرشتے اور رُوح القدس اُترتے ہیں اور یہ سلسلہ ساری رات فجر کے طلوع ہونے تک رہتا ہے۔)

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مقدس کو بندوں کی ہدایت کے خاطر اتارا ہے اور اس کو انسانی الفاظ میں اتارا ہے، کیونکہ انسانوں کو بات سمجھانے کا ذریعہ الفاظ ہی ہوتے ہیں۔ الفاظ ان آوازوں کو کہتے ہیں جو معین معانی و مطالب کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہی ان کی زبانوں کے الفاظ کہے جاتے ہیں عربوں کی زبان کے الفاظ ان کے اپنے طریقہ کے ہیں جو عربی زبان سے موسوم ہیں قرآن مجید انہی کے الفاظ میں اتارا گیا۔

زندگی کے مختلف مطالب کو سمجھانے کے لئے ان الفاظ کا جاننا ضروری ہوتا ہے جن سے وہ

مطالب ادا ہوتے ہیں، انسان اپنی تمام ضرورت کی باتوں، بلکہ حال و کیفیت کو بتانے اور انہی الفاظ میں باتوں کو پہونچانے، کسی امر کی طرف توجہ دلانے اور اپنا تاثر ظاہر کرنے کے لئے اپنی زبان کے الفاظ کو استعمال کرتا ہے چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بتانے اور سمجھانے کے لئے انہی کے الفاظ میں اپنا کلام اتارا ہے، مخاطبین اولین چونکہ عرب تھے اس لئے عربی میں اپنا کلام اتارا، یہ کلام جن الفاظ میں اتارا گیا ان الفاظ کے مطالب سے پوری طرح واقف ہوئے بغیر اللہ تعالیٰ کے کلام کو بہت خوبی کے ساتھ نہیں سمجھا جا سکتا، قرآن مجید کو سمجھنے اور سمجھانے والے اس کو اتنا ہی سمجھتے اور سمجھا سکتے ہیں جتنا اچھا وہ اس کے الفاظ کے مطالب کو سمجھتے ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ کو عربی زبان کے الفاظ و تعبیر کو سمجھنے کا اعلیٰ ادبی ذوق حاصل ہے۔ وہ قران مجید کی آیات کی تشریح کرتے ہوئے ان کے بعض الفاظ کی ایسی دلنواز و دل گداز تشریح و وضاحت کرتے ہیں کہ قرآن مجید کا اعجاز کھل کر سامنے آجاتا ہے اور اس کیفت سے آشنائی ہوتی ہے جو لفظ کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے اور انسانی زندگی کی نفسیاتی کیفیت سے بڑی مطابقت رکھتی ہے، مولانا مدظلہ کی یہ خصوصیت بڑی امتیازی خصوصیت ہے جو کم اہل علم میں پائی جاتی ہے۔

مولانا کی اس خصوصیت کا اظہار ان کی بہت سی تقریروں اور مضامین میں مختلف آیات کی تشریح میں ہوتا ہے جو بڑا معنی خیز اور ذہن کشا اور دلنواز ہوتا ہے۔

مولوی رسال الدین ندوی نے مولوی سید عبداللہ حسنی ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی رہنمائی میں ایسے مضامین و خطابات کا ایک انتخاب کیا ہے جن میں مختلف آیات کی تشریح مولانا مدظلہ نے اپنے نہایت عالمانہ انداز اور زبان و ادب کی نبض شناسی کے ساتھ کی ہے، مولوی رسال الدین صاحب ندوی نے اس طرح ایک بہت اہم کام انجام دیا ہے جو دین کی روح اور قرآن مجید کی معجز بیانی کا ایک موثر عکس پیش کرتا ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور برکت دے۔ آمین۔

محمد رابع حسنی ندوی

۲۵/۱۲/۱۴۲۰ھ

باب ۱

تعارف و ہدایات

❖

قرآن کے مطالعہ اور تفہیم کو زمانہ کے محدود پیمانوں کا پابند نہیں بنانا چاہئے، کیونکہ زمانے آتے جاتے رہتے ہیں، غور و فکر کے انداز بھی بدلتے رہتے ہیں، اشیاء کی قدر و قیمت کو بھی کبھی قرار نہیں۔ یہ چڑھتی اُترتی رہتی ہے، ایک زمانہ میں جو نظریہ پیدا ہو یا جو اصطلاح وضع کی جائے، جائز نہیں کہ اسی نظریہ یا اصطلاح کو اگلے زمانہ یا اگلے پر بھی جوں کا توں منطبق کر دیا جائے۔

قرآن ایک آسمانی کتاب ہے، مستقل ہے، اپنی منفرد حیثیت رکھتی ہے، علوم انسانی کا پورا خزانہ اور اس کے سارے نظریات ریت کے پھسلتے ہوئے ٹیلے کی مانند ہیں، جو بکھرتا بھی ہے اور پھیلتا بھی، سمٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی، اس پر کسی چیز کی بنیاد رکھنا درست نہیں، پھر یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ :

قرآن اپنے بلند آسمانی مقام اور اپنے مستقل مضبوط اور ابدی بنیادوں سے گر کر ریت کے اس بے ثبات ٹیلے پر آ رہے؟

(منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین)

❖

میرے مطالعۂ قرآن کی سرگزشت

الحمدلله نحمده ونستعينه ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادی له ونشهد ان لاالٰه الاالله وحده لا شريك له ونشهد ان محمدا عبده ورسوله صلی الله تعالیٰ علیه وعلیٰ اله واصحابه وسلم تسليما كثيراً كثيراً.

اعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم بسم الله الرحمٰن الرحيم.

اَللّٰهُ يَجْتَبِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَيَهْدِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ.

قرآن مجید ہر موقع پر مشکل کشائی اور دست گیری کرتا ہے

قرآن مجید کے معجزات میں سے جن کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا یہ بھی ہے کہ وہ ہر موقع پر مشکل کشائی اور دست گیری کرتا ہے، مجھے بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ میں کسی تقریر کے موقع پر یہ طے نہ کر سکا کہ اپنی بات کہاں سے شروع کروں گا اور مجھے آج کیا کہنا ہے اور قاری نے قرآن مجید کی تلاوت کی اور مجھے معلوم ہوا کہ دوسرے لوگوں کے سننے سے پہلے وہ آیتیں مجھے سنائی جا رہی ہیں اور ان آیتوں کا

انتخاب میرے لئے کیا گیا ہے، مجھے اپنے غیر ملکی دوروں میں بھی اس کا تجربہ ہوا کہ دن بھر کی مصروفیتوں اور نقل و حرکت میں اس پر غور کرنے کی نوبت ہی نہ آئی کہ کس موضوع پر تقریر ہوگی، کہیں تو موضوع کا تعین ہو جاتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا تو میں نے اس کو خدا پر چھوڑ دیا کہ وہ وقت پر رہنمائی فرمائے گا، چونکہ جو چیز اس کی طرف سے آتی ہے، اس کو عارفین "وارد" کہتے ہیں، یعنی ایک عزیز مہمان جس کا ورود ہوا ہے، اس میں اپنے ارادہ اور انتخاب کو کوئی دخل نہیں۔

مطالعۂ قرآن مجید سے علمی زندگی کا آغاز

میں اپنا تھوڑا سا تعارف کرانا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں قرآن شریف کا ایک حقیر اور ادنیٰ طالب علم ہوں، میری علمی زندگی قرآن مجید ہی کے مطالعہ سے شروع ہوئی، میں نے کئی جگہ لکھا ہے کہ مجھے اللہ نے ایک ایسا استاد عطا کیا جس کو ذوق ایمانی اور ذوقِ قرآنی ملا تھا(۱)۔ وہ قرآن پڑھتے تھے اور روتے تھے، پہلا نقش جو مجھ پر پڑا وہ ان کی آواز کا، جو درد میں ڈوبی ہوئی تھی، یہ میری خوش نصیبی تھی، اور قرآن مجید کا اصل مزاج بھی یہی ہے۔

قرآن مجید کا مزاج صدیقی ہے

قرآن مجید کا مزاج صدیقی ہے۔ جب حضرت ابو بکر صدیقؓ سے کہا گیا کہ نماز پڑھاؤ اور حضور ﷺ کے مصلے پر کھڑے ہو جاؤ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے

---

(۱) شیخ خلیل بن محمد یمانی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" مستقل مضمون۔

عرض کیا کہ ابو بکرؓ کو اس سے معاف رکھا جائے کہ وہ "رجل بکاء" ہیں جب وہ قرآن شریف پڑھنے لگتے ہیں تو پڑھ نہیں سکتے، ان پر گریہ غالب ہو جاتا ہے اور لوگ سن نہیں سکتے ہیں اور یہی شکایت کی تھی مشرکین قریش نے جب حضرت ابو بکرؓ کو نماز پڑھانے کی اجازت دی گئی اور انھوں نے اپنے گھر کے سامنے ایک مسجد بنائی، جب تک کہ وہ سِرّی نماز پڑھتے رہے تو لوگ وہاں جمع نہیں ہوتے، لیکن جب وہ قرأت کرنے لگے اور مرد و عورتیں اور بچے وہاں جمع ہونے لگے۔ پھر وہ رقت کے ساتھ قرآن مجید پڑھنے لگے تو پتھر بھی موم ہونے لگے تھے اور دلوں پر ایسا اثر ہونے لگا کہ قریش کو یہ فکر پڑ گئی کہ کہیں مکہ معظّمہ کی زندگی میں تہلکہ نہ مچ جائے اور زمام کار ان کے ہاتھوں سے نہ نکل جائے، اصل میں قرآن کا مزاج ہی یہی ہے کہ درد کے ساتھ، ایمانی حلاوت کے ساتھ پڑھا جائے۔ حدیث میں آتا ہے "اَلْإِیْمَانُ یَمَانٌ وَالْفِقْهُ یَمَانٌ وَالْحِكْمَةُ يَمَانِيَّةٌ" یہ میری خوش نصیبی ہے کہ پہلا معلم جو مجھے عطا کیا گیا وہ رقیق القلب تھا، دل دردمند رکھتا تھا اور ہم لوگوں کو حسرت رہتی تھی کہ وہ دیر تک قرآن شریف پڑھیں اور ہم سنیں، وہ ہمارے محلّہ کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھاتے تھے۔ شاذ و نادر کبھی ایسی نوبت آتی تھی کہ وہ پوری سورہ پڑھ سکیں، پڑھنا شروع کیا کہ گریہ طاری ہوا، آواز بھر آ گئی، ان کا روزانہ کا یہ معمول تھا، انھوں نے مجھے قرآن مجید کی کچھ سورتیں پڑھائیں، توحید کی صورتیں خاص طور پر انھوں نے مجھے پڑھانی شروع کیں، سورہ زمر سے شروع کیا، پھر وہ وقت آیا کہ زبان و ادب کی تعلیم غالب آ گئی اور اسی میں مشغول ہو گیا، لیکن قرآن مجید کا جو ذوق تھا وہ وقتاً فوقتاً سامنے آتا تھا اور اثر کرتا تھا۔

اس کے بعد جب میری تعلیم ختم ہوئی تو قرآن مجید کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، مدارس کے نصاب میں جو کتابیں پڑھی جاتی ہیں، ان سے زیادہ پڑھیں، پھر یہاں لاہور آکر مولانا احمد علیؒ سے قرآن مجید پورا پڑھا، یہاں بھی جس چیز نے متاثر کیا وہ ان کی قرانی زندگی تھی جس کو قرآن ناطق کہا گیا ہے، اس سے قلب میں جلا محسوس ہوتی تھی، مولانا کی زاہدانہ زندگی، درویشانہ معاشرت اور عمل بالسنّت کا مجھ پر وہ اثر پڑا جس کو "برکت" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند میں بھی رہا۔ میں نے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے وقت مانگا کہ خاص خاص آیات جن میں مجھے اشکال محسوس ہوتا ہے جو عام تفسیروں سے حل نہیں ہوتیں وہ میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ مولانا مدنیؒ اپنے زمانہ کے بلند ترین علماء میں تھے اور علوم و فنون اور حدیث کے علاوہ (جس کے وہ مانے ہوئے استاد اور شیخ تھے) ان کو قرآن مجید کا خاص ذوق تھا اس کا رنگ ان کی زندگی اور مزاج پر چھا گیا تھا۔ انھوں نے مجھے جمعہ کا دن دیا، مجھے یاد ہے کہ ان آیات کو منتخب کر لیتا تھا جو حل نہیں ہوتی تھیں، مولانا کثرت سے سفر کرتے تھے اور وہ تحریک کا زمانہ تھا لیکن مجھے پھر بھی استفادہ کا کچھ موقع ملا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ اور علوم قرآن

اس کے علاوہ مجھے مولانا سید سلیمان ندویؒ سے قرآن مجید کی بعض آیات کی تفسیر اور بعض آیتوں پر ان کی تقریر سننے کا موقع ملا اور میرا تاثر یہ ہے کہ میں نے قرآن مجید کے بارے میں کسی کا فہم اتنا عمیق نہیں پایا جتنا کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا۔ یہ ایک تاریخی انکشاف ہے، لوگ سید صاحب کو مورخ اور سوانح نگار کی حیثیت

سے جانتے ہیں، متکلم کی حیثیت سے جانتے ہیں، لیکن میرے نزدیک فہم قرآن میں ان کا پایہ اتنا بلند تھا کہ مجھے ہندوستان ہی نہیں بلکہ تحتی برا عظم میں بھی کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس کا مطالعۂ قرآن اتنا وسیع اور عمیق ہو اور اس غائر مطالعہ کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان و ادب اور بلاغت اور اعجازِ قرآنی کا مطالعہ ان کا بہت وسیع و عمیق تھا، پھر مولانا حمید الدین فراہیؒ (جو اس فن کے گویا امام تھے) کی صحبت میں رہ کر ان کی گفتگو، ان کی تحقیقات اور ان کے مطالعۂ قرآن سے پورا استفادہ کیا، مجھے یاد ہے کہ ایک بار ہم لوگ دارالمصنفین گئے ہوئے تھے تو انھوں نے سورۂ جمعہ پر تقریر کی، میں نے ایسی عالمانہ، ایسی محققانہ اور ایسی نکات سے بھری ہوئی تقریر ابھی تک نہیں سنی تھی، کاش کہ وہ محفوظ ہو جاتی۔ تو مجھے سید صاحب سے مختصر استفادہ کا موقع ملا، پھر جب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت استاد میرا انتخاب ہوا تو خاص طور سے قرآن مجید کا درس میرے سپرد ہوا، وہاں قرآن کے درس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو متن قرآن پڑھایا جاتا ہے اور یہ سلسلہ غالباً دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی سے شروع ہوا، پھر اور مدارس میں اس کی تقلید کی جانے لگی اور یہی صحیح طریقہ ہے کہ ابتدا میں متن کو سامنے رکھ کر پڑھایا جائے بغیر کسی تفسیر کی مداخلت کے، استاد تیار ہو کر آئے اور وہ اپنا مطالعۂ قرآن پیش کرے، تو مجھے کئی سال تک قرآن مجید کی خدمت کا موقع ملا، تفسیر بھی پڑھائی لیکن زیادہ متن قرآن پڑھایا، جو مضامین میرے سپرد ہوئے تھے ان میں سب سے زیادہ اہم تفسیر والا مضمون تھا، میں نے اپنا تعارف اس لئے کرا دیا کہ آپ یہ سمجھیں کہ میں قرآن مجید کا ادنیٰ طالب علم ہوں، اس کے بعد جو کچھ بھی اللہ نے توفیق دی اس میں قرآن مجید کا سب سے بڑا حصہ ہے ؎

"آنچہ کردم ہمہ از دولتِ قرآں کردم"

جن لوگوں نے میری ناچیز تحریریں اور تصنیفات دیکھی ہیں ان کو اندازہ ہوگا کہ میری تحریروں کا تانا بانا قرآن مجید ہی سے تیار ہوتا ہے، میں نے سب سے زیادہ قرآن سے مدد لی ہے اور پھر تاریخ سے، اور میں تاریخ کو قرآن مجید ہی کی تفسیر سمجھتا ہوں۔(۱)

(۱) تلخیص از "حدیث پاکستان" صفحہ ۱۴۶ تا صفحہ ۱۵۲۔

قرآن مجید کا اعجاز

ہم اگر غنی ہیں تو اسی قرآن مجید کے خزانۂ عامرہ سے، قرآن مجید کے مطالعہ سے کچھ موتی ہاتھ لگ جائیں تو ہم آپ کو پیش کریں، یہ انسانیت اور آدمؑ کے پورے کنبے کو دینے کے لئے کافی ہے۔

بڑے بڑے فرمانرواؤں، سرمایہ داروں اور دولت مندوں کو دینے کے لئے اگر کوئی چیز ہے اور جو اضافہ کر سکتی ہے، دنیا بدل سکتی ہے، قسمت چمکا سکتی ہے، وہ قران مجید کی بھیک ہے۔

قرآن مجید تحت الثریٰ سے اُٹھا کر افلاک و ثریا پر پہنچا سکتا ہے، اور جو لوگ اس پر عمل نہیں کرتے، ان کو منھ کے بل گرا دیتا ہے۔ یہی قرآن مجید جس نے عرب کے خانہ بدوشوں، صحرا نشینوں کو جن کے پاس پیٹ بھرنے کو کھانا تھا نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا۔ کہاں سے کہاں پہنچا دیا، جو ساربان تھے ان کو جہانبان بنا دیا ؎

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

یہی قرآن مجید ہے جس نے عرب کے بدوؤں کو، خانہ بدوشوں کو جن پر دنیا کو

توجہ بھی نہ ہوتی تھی۔

"جہاں بان و جہاں دار و جہاں آرا"

بنا دیا انھوں نے قیصر و کسریٰ کے تاج کو پاؤں سے روندا اور ان کے تختِ سلطنت پر ایسے بے تکلف بیٹھے جیسے بوریئے پر بیٹھتے ہیں ؎

در شبستان حرا خلوت گزید　　قوم و آئین و حکومت و آفرید

ماند شبہا چشم او محرومِ نوم　　تا بہ تخت خسروی خوابیدہ قوم

غارِ حرا میں ایک کملی پوش نے چند راتیں گذاریں، ایک قوم پیدا کر دی، ایک آئین دیا، ایک حکومت بنادی، اس کی آنکھیں چند راتیں نیند سے محروم رہیں لیکن اس کی قوم تختِ خسروی پر سونے کے قابل ہو گئی، اس نبی اُمّیؐ کے غلام قیصر و کسریٰ کے تخت پر قابض ہو گئے۔

قرآن مجید مٹی کو اکسیر بناتا ہے، اور جو اس کی ناقدری کرتا ہے، وہ اکسیر ہوتا ہے تو اس کو مٹی میں تبدیل کر دیتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا بے لاگ قانون ہے، یہ دودھاری تلوار ہے، اگر اس کا استعمال صحیح نہیں ہوا، ناقدری کی گئی تو قوموں کا کام تمام کر سکتی ہے، اللہ کا قانون بے لاگ ہوتا ہے اور ہر غیور قانون کسی حد تک بے لاگ ہوتا ہے، ہر باعزت شخص کی بات کی لاج ہوتی ہے، احترام ہوتا ہے، حکومتوں کا قانون جب نافذ ہو جاتا ہے تو اس کا احترام لازمی ہو جاتا ہے۔(۱)

(۱) تحفۂ انسانیت ص ۱۴۳ تا ص ۱۴۵

قرآنی مطالعہ اور اس کے آداب

اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ.

''اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کر لیتا ہے، اور وہ ان کو ہدایت دیتا ہے
جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں''۔ (سورہ شوریٰ۔ ۱۳)

اجتباء خاص، ہدایت عام

اس آیت میں دو چیزیں بیان ہوئی ہیں، ایک مقامِ اجتباء اور دوسرے ھدایت، اجتباء کے لئے اللہ تعالیٰ نے صاف صاف کہہ دیا ہے ''اَللّٰہُ یَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِہٖ مَنْ یَّشَآءُ'' سارا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے وہ اجتباء سے سرفراز کرے اور اس کو قبولیت و اجتباء کا درجہ عطا کرے، لیکن ہدایت کی سب انسانوں کو ضرورت ہے۔ ''یَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ'' وہ ان کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، ہدایت کے طالب ہوتے ہیں، اور جن میں انابت کی، تواضع کی اور بندگی کی اور اپنے کو کچھ نہ سمجھنے کی کیفیت پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان کو راستہ پر لگا دیتا ہے اور آخر تک پہنچا دیتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں انابت کی صفت پائی جائے ''یَھْدِیْ

الَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ“ میں اسی ٹکڑے پر عرض کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن مجید کے دو پہلو ہیں، ایک اس کا تعلیمی اور تبلیغی پہلو ہے، یعنی وہ عقائد جن پر ہر شخص کو ایمان لانا چاہئے اور سمجھنا چاہئے اور قرآن سے اخذ کرنا چاہئے، اس کے متعلق تو قرآن مجید کا اعلان ہے کہ ”بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْن“ (روشن اور واضح عربی میں ہے) اس سے زیادہ واضح الفاظ میں بتا دیا ”وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّکْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّکِرْ“ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے، کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟

قرآن مجید پڑھ کر انسان مشرک نہیں ہوسکتا

کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ خدا اس سے کیا چاہتا ہے اور اس کی ہدایت کے لئے کیا شرائط ہیں اور توحید ورسالت اور معاد کا قرآنی تصور کیا ہے؟ قرآنی عقیدہ کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے کہ دنیا میں ہدایت اور آخرت میں نجات مل سکے؟ اس کے لئے قرآن مجید آسان ہے اور کسی کو یہ کہنے کا یہ عذر نہیں کہ ہم قرآن مجید سے ان باتوں کو سمجھ نہیں سکے، اور قرآن ہمارے لئے حجت نہیں، توحید کے بارے میں واضح سے واضح، صریح سے صریح، طاقتور سے طاقتور دوٹوک بات جو کہی جا سکتی ہے قرآن مجید میں موجود ہے، قرآن مجید پڑھ کر آدمی سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن مشرک نہیں ہو سکتا۔ میں یہ علی الاعلان کہتا ہوں کہ وہ ٹھوکریں کھا سکتا ہے، بے عمل ہو سکتا ہے، وہ فسق کی راہ اختیار کر سکتا ہے، لیکن جہاں تک توحید و شرک کا تعلق ہے تو قرآن مجید بالکل سورج کی طرح روشن اور سورج کیا چیز ہے اس میں کسی قسم کے

اشتباہ کی گنجائش نہیں، اور جہاں تک رسالت کے عقیدہ کا تعلق ہے کہ نبوت کیا چیز ہے؟ انبیاء کیا ہیں؟ ان کے ذمہ کون سی چیز سپرد کی گئی؟ ان کو کیا حکم ہوتا ہے؟ وہ کیا تعلیم دیتے ہیں؟ ان کی سیرت کیسی ہوتی ہے؟ ان کی زندگی کیسی پاکبازانہ اور بلند ہوتی ہے؟ یہ قرآن مجید میں صاف طور سے بیان کر دیا گیا ہے، وہ اپنا تعارف بھی کراتے ہیں، وہ شبہوں کو بھی دور کرتے ہیں، آپ سورۂ اعراف پڑھئے، سورۂ ہود پڑھئے، سورۂ شعراء پڑھئے، اس میں ایک ایک نبی کا نام لے کر تعارف کرایا گیا اور ثبوت دیا گیا ہے۔

ہدایت کے لئے قرآن آسان ہے

ہدایت کے لئے قرآن مجید آسان ہے، اس میں کہیں کوئی شبہ نہیں، لیکن جہاں تک اس کے علوم کا تعلق ہے، اس کے رفیع و دقیق مضامین کا تعلق ہے، اس میں کسی چیز کے متعلق دعوے کے ساتھ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہم جو کچھ سمجھتے ہیں، اس کے علاوہ سب غلط ہے، قرآن کے بارے میں سب سے الگ، منفرد و شاذ رائے قائم کرنا بڑی خطرہ کی بات ہے، حضرت ابو بکر صدیقؓ کا قول ہے "**ای سماء تظلنی وای ارض تعلنی اذا قلت فی کتاب اللہ مالا اعلم**" اے اللہ! "کس آسمان کے نیچے پناہ لوں گا اور کس زمین پر چلوں گا اگر میں کتاب اللہ کی آیت کے متعلق کوئی ایسی بات کہہ دوں جس کی کوئی بنیاد، کوئی تحقیق نہیں"۔ اور قرآن کے بارے میں صحابۂ کرام کا یہ عام رویہ تھا۔ حضرت عمرؓ خود کسی لفظ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کے کیا معنی؟ اور پھر خود ہی کہہ دیتے کہ "**ثکلتك امك یا عمر**" عمر تیری ماں

تجھ پر روئے، اگر تجھے اس ایک لفظ کے معنی نہیں معلوم تو کیا غضب ہوا''، صحابہؓ کرامؓ کا اندازِ فکر بتاتا ہے کہ پورے قرآن پر حاوی ہونے کو وہ نہ تو ممکن سمجھتے تھے اور نہ ضروری۔ میری یہ جرأت معاف کی جائے اور وہ یہ کہ قرآن کی جو اصل روح، اصل مدعا اور اصل مقصد ہے وہ حاصل ہونا چاہئے اور اس کے ساتھ معاملہ ہونا چاہئے ادب و خشوع کا، ہمیں بہت سی چیزوں کی حقیقتیں معلوم نہ ہونے کے باوجود ان سے پورا پورا فائدہ پہنچا ہے، اگر کسی شخص کو قرآن مجید کے حقائق و مطالب معلوم نہیں یہاں تک کہ پورے الفاظ کے معنی بھی معلوم نہیں، لیکن اس کے دل میں خدا کا خوف ہے، خشیت ہے، جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو یہ حالت ہوتی ہے جو اللہ نے فرمائی ''لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ''

اس کا حال یہ ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ لرز جاتا ہے اور اس کا رواں لرز جاتا ہے، کہتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے، یہ میرے رب کا کلام ہے، تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہدایت کے آخری مدارج تک پہنچ جائے اور اس کو قرب بالقرآن حاصل ہو، حدیث میں آتا ہے کچھ لوگ ایسے پیدا ہوں گے کہ قرآن مجید پڑھیں گے اور بہت تکلف سے پڑھیں گے، مگر ان کے حلق سے نہیں اترے گا، تو جہاں تک مضامین کا تعلق ہے میں ایک طالب علم کی حیثیت سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ایک ایسا سمندر ہے جس کی کوئی انتہا نہیں اور بڑے سے بڑا آدمی اس کی وسعت کے سامنے لرزہ بر اندام رہتا تھا اور سمجھتا تھا کہ اللہ کی ہدایت اور توفیق کے بغیر وہ ایک قدم نہیں چل سکتا۔

افادہ اللہ کی طرف سے

پہلی بات تو یہ سمجھئے کہ افادہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور یہ افادہ ہوتا ہے ان قلوب پر جو اللہ کی خشیت سے اور کلامِ ربانی کی ہیبت سے اور اس کے جلال سے معمور ہوتے ہیں، ان پر اللہ کی طرف سے علوم کا ورود ہوتا ہے، دوسری بات یہ کہ قرآن مجید کو نوافل میں پڑھے اور یہ تصور کرے کہ جیسے قلب پر اسی وقت نزول ہو رہا ہے اور اس کا لطف لے اور اس میں گم ہو جانے کی کوشش کرے۔ قرآن مجید دماغی زور آزمائی کی چیز نہیں ہے کہ اپنا پسندیدہ مطلب قرآن مجید سے زور آزمائی کر کے نکالا جائے۔

تیسری بات یہ کہ دورانِ مطالعہ جو مطلب و معانی سمجھ میں آئیں تو یہ کہے کہ میری ناقص سمجھ میں یہ بات آئی ہے، ایسا سمجھ میں آتا ہے اور یہ دعویٰ ہرگز نہ کرے کہ آج تک قرآن کو کسی نے سمجھا نہیں، میں نے ہی سمجھا ہے، یہ بالکل صحیح نہیں ہے، اور میں نے بارہا کہا اور لکھا بھی ہے کہ اگر قرآن مجید اپنے کو تیرہ سو برس میں نہیں سمجھا سکا تو یہ قرآن مجید پر بہت بڑا الزام ہے۔ وہ تو کہتا ہے "لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ، اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ" اور آپ کہتے ہیں کہ ایک ہزار برس تک، بارہ سو برس تک قرآن مجید کے فلاں لفظ کی حقیقت آج تک کسی نے سمجھی نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کا افادہ اتنے دنوں تک بند رہا۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک سیمنار میں اس کی اختتامی تقریر میں، میں نے کہا تھا کہ اہلِ علم اپنی کسی تحقیق کو یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں کہ ہمیں مطالعہ کا جتنا موقع ملا، اس کے نتیجہ

میں ہمارا خیال یہ ہے...... میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں...... لیکن یہ طریقہ کہ کوئی شخص اپنے نتائجِ فکر کو سو فیصد صحیح ثابت کرنے پر اصرار کرے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے سب کو غلط قرار دے صحیح نہیں۔ قرآن مجید کے سلسلہ میں آتا ہے کہ اس کا نیا پن، تازگی پرانی نہیں ہوگی اور اس کے عجائب کی کوئی انتہا نہیں تو اگر آپ کو عمرِ نوحؑ بھی ملے اور وہ قرآن مجید کے تدبر میں صرف ہو تو ہر روز نئے نئے معانی کھلنے لگیں۔ ہماری عمر کا یہ محدود وقت، محدود قوت اور صلاحیت اور اس کے بعد ہمارا یہ دعویٰ کہ قرآن مجید اب تک سمجھا ہی نہیں گیا، یہ بہت بڑی غلطی ہے۔

میری ذاتی کتاب

آخری بات یہ ہے کہ قرآن مجید کو اپنی کتاب سمجھا جائے، یہ کتابِ ہدایت ہے، یہ کتاب ابدی ہے، کتاب آسمانی ہے لیکن میری ذاتی کتاب بھی ہے، میرا ذاتی ہدایت نامہ بھی ہے، اس میں میری ذاتی کمزوریاں بیان کی گئی ہیں، میرے ذاتی امراض کی نشاندہی کی گئی ہے۔

قرآن مجید میں ہر آدمی اپنے کو تلاش کر سکتا ہے، یہ جب ہوگا جب کہ آپ اس کو زندہ کتاب سمجھیں یا اپنی کتاب سمجھیں، اور آپ میں اپنی اصلاح کا جذبہ ہو، لوگوں کی اصلاح تو بعد میں ہوگی پہلے اپنی اصلاح ہو جائے۔

انبیاء کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے میری ہدایت ہو جائے پھر میں دوسروں سے کچھ کہوں، ہم میں سے بہت سے لوگ قرآن مجید کو اس لئے پڑھتے ہیں کہ یہ حجت بنے، دوسروں کو شرمندہ کیا جائے، دوسروں پر حجت قائم کی جائے، حالانکہ صحابۂ کرامؓ

قرآن پڑھتے تھے اپنی اصلاح کے لئے۔ ایک آیت پڑھی اس پر عمل کرنا شروع کیا۔ سورۂ بقرہ بعض اوقات مہینوں میں ختم ہوئی۔

یہ چند باتیں ایک طالب علم کی حیثیت سے میرے ذہن میں تھیں وہ سب میں نے آپ کے سامنے رکھ دیں۔ "یَهْدِیْ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ" کے میدان میں جہاں تک ہم کوشش کر سکتے ہیں کریں، اللہ جس کو چاہے مقامِ اجتباء تک پہنچائے ہم اس کے مکلّف نہیں ہیں، ہم سیکھنا چاہیں، ہم ہدایت حاصل کرنا چاہیں، ہم بننا چاہیں اور اپنی زندگی میں انقلاب لانا چاہیں تو قرآن مجید موجود ہے جو ہماری رہنمائی بھی کرے گا اور منزلِ مقصود پر بھی پہونچائے گا، ہم میں ہدایت کی طلب، اپنی احتیاج کا احساس اور اپنی بے بضاعتی کا اعتراف ہونا چاہئے۔ اسی کے مجموعہ کا نام "انابت" ہے۔ میں دعا کرتا ہوں، آپ بھی دعا کریں۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ.(۱)

(۱) ماخوذ از حدیث پاکستان ص ۱۴۶ تا ص ۱۵۷

پیغامِ ہدایت

"وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۝ قَالُوْا أَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ. قَالَ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ۝ وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلٰئِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُوْنِیْ بِأَسْمَاءِ هٰؤُلَاءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۝ قَالُوْا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا. اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ۝ قَالَ یٰآدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَائِهِمْ. فَلَمَّا اَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ، وَاَعْلَمُ مَاتُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ۝

"اور جب ایسا ہوا تھا کہ تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا:- میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں! فرشتوں نے عرض کیا:- کیا ایسی ہستی کو خلیفہ بنایا جارہا ہے جو زمین میں خرابی پھیلائے گی اور خوں ریزی کرے گی؟ حالانکہ ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہوئے تیری پاکی اور قدوسی کا اقرار کرتے ہیں! (تیری مشیت برائی سے پاک اور تیرا کام نقصان سے منزہ ہے) اللہ نے کہا میری نظر جس حقیقت پر ہے تمھیں اس کی خبر نہیں! (پھر جب ایسا ہوا کہ مشیت الٰہی نے جو کچھ چاہا ظہور میں آگیا) اور آدم نے (یہاں تک معنوی ترقی کی کہ) تعلیم الٰہی سے تمام چیزوں کے نام معلوم کر لئے تو اللہ نے فرشتوں کے سامنے وہ (تمام حقائق) پیش کر دیئے اور فرمایا:- اگر تم (اپنے شبہ میں) درستی پر ہو تو بتاؤ ان (حقائق) کے نام کیا ہیں؟ فرشتوں نے عرض کیا:- خدایا ساری پاکیاں اور بڑائیاں تیرے ہی لئے ہیں ہم تو اتنا جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں سکھلا دیا ہے! علم تیرا علم ہے اور حکمت تیری حکمت ہے! (جب فرشتوں نے اس طرح اپنے عجز کا اعتراف کرلیا تو) حکمِ الٰہی ہوا: اے آدم! تم (اب) فرشتوں کو ان

(حقائق) کے نام بتادو۔جب آدم نے بتادیئے تو اللہ نے فرمایا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمان وزمین کے غیب مجھ پر روشن ہیں؟ اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی میرے علم میں ہے، اور جو کچھ تم چھپاتے تھے وہ بھی مجھ سے مخفی نہیں ہے!(سورہ بقرہ: ۳۰ تا ۳۳)

ہم آپ سب قرآن مجید کے اس مکالمہ کو پڑھتے ہیں، جس کا قرآن مجید نے تذکرہ کیا ہے، جو خدا اور اس کے فرشتوں کے درمیان ہوا، جب خدا نے یہ فیصلہ کیا کہ نسلِ انسانی کے مورث اعلیٰ آدم کو اس دنیا میں اپنا خلیفہ (نائب) بنائے گا، اور اس کائناتِ ارض کا چارج دے گا۔ اس کو صحیح رخ پر لگانے، کائنات کی مختلف طاقتوں کو متحد و منظّم کرنے، اس کائنات کو بامقصد اور اس زندگی کو بامعنیٰ بنانے کے لئے، انسانوں کا خدا سے رشتہ جوڑنے، اور انسانوں کے درمیان اخوت و تعاون کا رشتہ استوار کرنے، اور خدا کی نعمتوں سے اس کے احکام و تعلیمات کے مطابق فائدہ اٹھانے کے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ کا فیصلہ ہوا کہ اس کے لئے ایسے انسان کو پیدا کرے، جو اقبال کے الفاظ میں ؏ خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات!...... ہو۔

تو فرشتوں نے عرض کیا "نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ" ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہوئے تیری پاکی اور قدوسی کا اقرار کرتے ہیں۔

کیا آپ کے خادم و غلام اس کام کے لئے موزوں نہ تھے؟ ہم تو آپ کی تسبیح و تقدیس میں ہر وقت لگے رہتے ہیں!

اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: ابھی تم کو معلوم ہو جائے گا، جس جگہ کے انتخاب کے لئے اس ہستی کا میں انتخاب کر رہا ہوں، وہ کتنا برمحل اور حق بجانب ہے، چنانچہ حضرت آدم اور فرشتوں کا امتحان لیا گیا، پہلے حضرت آدم کی فطرت میں ان ناموں

کے سیکھنے، اور جن کے نام ہیں ان سے آشنا ہونے، ان کی صلاحیتوں، طاقتوں سے واقف ہونے اور ان سے فائدہ اٹھا سکنے کی صلاحیت اور ان کی فطرت میں ان کی ضرورت کا احساس پیدا کیا گیا، ان کے اندر یہ طاقت ودیعت کی گئی کہ ان کا رشتہ اس مادّی کائنات کی چیزوں سے بآسانی قائم ہو سکے، اور وہ ان سے کام لے سکیں۔

پہلے حضرت آدمؑ کو تعلیم اسماء ہوئی۔ "ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلآئِكَةِ" پھر وہ چیزیں ان کو پیش کی گئیں اور انھوں نے صحیح جواب دیئے، ملائکہ کے سامنے لایا گیا، تو انھوں نے اپنی شان کے مطابق اس کا اعتراف کیا کہ ان کا علم خدا کی تعلیم کے اندر محدود ہے۔ اور ان کو صرف اپنے فرائض منصبی کا علم ہے، "قَالُوْا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ" تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ ثابت کر دیا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے نائب بن کر اس کائنات سے فائدہ اٹھانے کے لئے جس ہستی کا انتخاب کیا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

فکر انگیز مکالمہ

قرآن مجید نے یہ ایک بڑا معنی خیز و فکر انگیز مکالمہ نقل کیا ہے، جو تخلیق آدم کے وقت اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے درمیان ہوا تھا۔ جس کا آغاز اس طرح ہوا ہے:-

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ إِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِيْفَةً.

اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔

پھر فرمایا گیا:-

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا.

اور اللہ نے آدم کو تمام اسماء کی تعلیم دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو اس دنیا کا جو کچھ ضروری علم دیا گیا ہے، اور اس مادی دنیا سے اس کا جو تعلق ہے، اور حیات و کائنات سے نفع اٹھانے کی اسے جتنی طاقت و صلاحیت دی گئی ہے، وہ اسے خلافتِ الٰہی کے نتیجے میں ملی ہے۔ اور یہ سب اس کی ماتحتی نہ کہ خود مختاری کی حیثیت سے ملی ہے۔ اور اس منصبِ خلافت کے طفیل ہے۔ جو ملائکہ کے بجائے اسے دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اشارۃً کہا گیا:۔

وَأَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ. اور خرچ کرو اس مال میں سے جس میں تمھیں

(سورۃ الحدید-۷) اس نے خلیفہ بنایا ہے۔

قرآن مجید خلافتِ الٰہی کو بڑی ذمہ داری کی چیز سمجھتا ہے جو عدل و رحمت اور سخت محاسبے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اور خلافت و خود مختاری کا فرق بتانے کی کوئی ضرورت نہیں، "خلیفہ" ہمیشہ اپنے مالک سے مربوط اور اس کا تابعدار، ذمہ داری میں امانت دار، اپنے ماتحتوں کا ہمدرد، اپنے مالک و آقا کا شکر گزار اور ہر فضل و کرم اس کی طرف منسوب کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ غرور و تکبر میں مبتلا نہیں ہوتا۔ اور نہ قوت و حکومت اسے آپے سے باہر کرتی ہے۔

لیکن مغرب نے اس حقیقت کو بھلا دیا۔ جس کے نتیجے میں نہ صرف علم و تحقیق کی تاریخ میں بلکہ پوری انسانی تاریخ کی سب سے بڑی غلطی سامنے آئی، اور یہ کسی ایک فرد یا چند افراد یا کسی ایک فکر و فلسفہ کی بھول نہ تھی۔ بلکہ پوری علمی دنیا اور عالمی قیادتوں کی بھول تھی۔ جس کے ہاتھ میں انسانیت کا مستقبل اور دنیا کے رجحانات تھے۔ اس طرح یہ بڑی بدبختانہ بھول اور بہت بھاری غفلت و جہالت تھی، جو تاریخ کے اسٹیج پر ظاہر ہوئی۔ اور ایسی غلطی تھی جس نے غلطیوں کے بہت سے طویل دور

پیدا کر دیئے۔ کسی دانشور نے صحیح کہا ہے کہ "غلطی سے زیادہ کسی اور مخلوق کی افزائش نسل میں نے نہیں دیکھی"۔ دنیا ابھی تک اس خط مستقیم سے انحراف کے نتائج بھگت رہی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کے ذریعہ (آدم کو عطائے خلافت اور علم کی تعلیم کا واقعہ سنا کر) عاقل انسانوں کے لئے قائم کیا تھا۔

ان آیات کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ یہاں پر انسان خدا کا نائب ہے، انسان یہاں پر اصل نہیں، وہ Original حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ وہ خدا کا نائب ہے، خدا کا منشاء پورا کرنے کے لئے اس دنیا میں آیا ہے......!

اگر انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کا نائب ہے تو اسے خدا کا منشاء معلوم کرنا چاہئے جو پیغمبروں کے ذریعہ اور پیغمبروں کے لائے ہوئے صحیفوں کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے، اُس کو اپنے اندر اُن صفات کا پَر تو پیدا کرنا چاہئے۔ وہ خدائے رب العالمین ہے۔ (سارے جہانوں کا پروردگار ہے) رحیم و کریم (نہایت رحم والا عزت والا) ہے۔ عادل و حلیم (منصف اور بردبار) ہے۔ رحمٰن و رحیم (بے حد مہربان نہایت رحم والا) ہے۔ اس لئے خدا کے دیئے ہوئے علم کو، اس کی ربوبیتِ عامہ، رحمانیت تامہ اور عدلِ کامل کے مطابق استعمال کرے۔

اگر اس علم کا استعمال نفسانی و شیطانی اغراض کے لئے کیا گیا تو یہ "خلافتِ الٰہی" کے مقصد و منصب کے ساتھ غداری اور اپنے مورثِ اعلیٰ (آدمؑ) کے ساتھ بے وفائی و ناخلفی ہوگی۔(۱)

---

(۱) "تعمیر حیات" شمارہ ۲۵ر ستمبر ۱۹۸۵ء جلد ۳۳ اور "انسانی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی و تعمیری کردار" ص ۵۸ تا ص ۶۱ سے مشترک اخذ و تلخیص۔

ہدایت کا ذریعہ صرف انبیاء و مرسلین ہیں

وَقَالُوْا الْحَمْدُلِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا، وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَا أَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ، لَقَدْ جَاءَ تْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ. (سورہ اعراف: ۴۳)

قرآن مجید فرماتا ہے کہ جنت تک پہونچنے والے خوش نصیبوں نے کتنی سچی بات کہی کہ "اَلْحَمْدُلِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا" سب شکر خدا کا ہے جس نے ہم کو یہاں (جنت) تک پہونچایا۔ اس میں انہوں نے ایک بڑی حقیقت بیان کی۔ وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَا أَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ، ہم (اپنی خداداد ذہانت و ذکاوت، کسی علمی مہارت اور ذاتی تلاش و جستجو سے) اس مقام تک نہیں پہونچ سکتے تھے اگر خدا کی رحمت اور رہبری ہماری یاوری نہ کرتی۔

ہم جو یہاں تک پہونچے، عقل و دانش کی راہ سے نہیں پہونچے، تجربہ کی راہ سے نہیں پہونچے، اشراقیتِ نفس کشی اور ریاضت و مجاہدہ کی راہ سے نہیں پہونچے، فلسفہ و حکمت کی راہ سے بھی نہیں پہونچے۔ پہلے تو انھوں نے اجمالاً کہا ہے وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَا أَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ، (ہماری رسائی یہاں تک نہ تھی اگر خدا ہمیں یہاں تک نہ پہونچا دیتا)

پھر انھوں نے اس حقیقت کو بیان کیا کہ خدا ایک ایک کی ہدایت کے لئے زمین پر نہیں اترتا، اور وہ ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر راستہ پر نہیں لگاتا، لیکن خدا کے پہونچانے کے طریقے ہوتے ہیں، اس کا بھی ایک ذریعہ ہوتا ہے، تو اس کا ذریعہ کیا ہوا؟ "لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالحَقِّ" "ہمارے رب کے قاصد لے کر آئے۔"

یعنی اس کا ذریعہ پیغمبروں کی بعثت اور ان کی ہدایت و رہبری ہے، وہی دنیا میں اللہ کا پیغام، ہدایت و نجات کا سامان، اور منزلِ مقصود کا نشان لے کر آتے ہیں، اور وہی گم کردہ انسانیت اور بھٹکے ہوئے افراد بنی آدم کو راہ پر لگاتے اور منزلِ مقصود پر پہونچاتے ہیں۔

جانِ سخن یہ ہے کہ خدا کے ایلچی اور سفیر حق لے کر نہ آتے تو ہم یونہی بھٹکتے رہتے اور جنت کے بجائے ہمارا کوئی دوسرا مقام ہوتا۔

تو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ جس چیز نے ہم کو اس قابل بنایا، وہ چیز دانشوروں، فلسفیوں اور سیاست دانوں اور تجربہ کاروں سے اخذ کی ہوئی نہیں ہے، پیغمبروں سے اخذ کی ہوئی ہے، اور اس کا کوئی ذریعہ نبوت و رسالت اور اس کے حاملین (انبیائے کرام) کے علاوہ نہیں ہو سکتا۔ ہم نے اس کو قبول کرلیا تو اس قابل ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ان نعمتوں سے، ان سعادتوں اور صداقتوں سے فیضیاب اور بہرہ اندوز ہوں، اور دوسروں تک بھی ان کو پہونچائیں۔

ہم داعی یا مبلغ ہوں، یا دین کے شارح یا ترجمان، ہمیں یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہئے کہ یہ دین اور دعوت ہم نے انبیائے کرامؑ سے اخذ کی ہے۔ اگر انبیاء علیہم السلام یہ دعوت لے کر نہ آتے تو ہم کو اس کی ہوا بھی نہ لگتی۔

یہ رہبر کامل اور فرستادۂ خدا، انبیاء و مرسلین ہیں، جو انسانوں کی رہنمائی کے لئے دنیا میں آتے رہے۔ اور گم کردہ اور حیران و سرگرداں انسانی قافلوں کو اپنے اپنے وقت اور زمانہ میں خدا تک پہونچاتے اور جنت کا مستحق بتاتے رہے۔ تنہا انہیں کے ذریعہ صحیح معرفتِ الٰہی، مقصد تخلیق کا علم اور زندگی گزارنے کا صحیح راستہ مل سکتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت کا یہی واحد راستہ ہے۔ جو جہالت و ضلالت، سوءِ فہم و غلطیٔ تعبیر سے محفوظ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے راستے کے سوا معرفتِ الٰہی کا کوئی اور راستہ نہیں، نہ اس سلسلہ میں عقل رہنمائی کر سکتی ہے، نہ تنہا ذہانت کام آ سکتی ہے، نہ علم و فن، نہ سلامتِ فکر و حسنِ فطرت، ذہن کی تیزی، قیاس آرائی، تجربہ کاری مدد کر سکتی ہے!

اللہ تعالیٰ نے اسی حقیقت کا اظہار اہل جنت کی زبان سے کیا ہے۔ اہل جنت جو صادق القول بھی ہیں، اور یہ ان کے ذاتی تجربہ کا معاملہ بھی ہے۔ اور یہ موقعہ بھی کسی غلط بیانی اور مبالغہ آمیزی کا نہیں۔ تو انھوں نے پہلے تو اس کا اعلان کیا کہ "اگر خدا ہماری ہدایت کا سامان نہ کرتا تو ہم یہاں (جنت) تک نہیں پہونچ سکتے تھے"۔ "وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللهُ" پھر اس حقیقت کا انکشاف اور اقرار کیا کہ اس ہدایت کا ذریعہ تنہا انبیاء و مرسلین ہیں؛" لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ"! (بے شک ہمارے پروردگار کے رسول حق بات لے کر آئے تھے)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے کرامؑ کی بعثت ہی کی وجہ سے ان کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ وہ اللہ کی صحیح معرفت حاصل کریں، اور اس کی مرضی اور اس کے

احکام معلوم کریں، اور ان پر عمل پیرا ہوں، اور اس کے نتیجے میں جنت میں داخلہ ممکن ہوا......!

اللہ تعالیٰ نے قرآن کی ایک عظیم الشان سورہ "الصّافّات" (جس میں مشرکین کی گمراہی، ان کی بداعتقادی، اور اللہ کی طرف ان امور کی نسبت کی تردید کی گئی ہے۔ جو ذات باری تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں ہیں) کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے:-

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں، تمہارا پروردگار جو صاحب عزت ہے، اس سے پاک ہے۔ اور پیغمبروں پر سلام، اور سب طرح کی تعریف خدائے رب العالمین کو سزاوار ہے۔ (سورہ الصافات۔ ۱۸۰۔۱۸۲)

یہ تینوں آیتیں ایک طلائی زنجیر کی کڑیاں ہیں، جو ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔ کیونکہ جب اللہ نے اپنی ذات کو مشرکین کی لغو اور بیہودہ باتوں سے منزہ فرمایا تو اس کی تکمیل انبیائے کرام علیہم السلام کے ذمہ کی، جنہوں نے خدا کی کامل و تقدیس کو اجاگر کیا، اور اللہ کے صحیح اوصاف بیان کئے۔ اللہ نے ان پر سلام بھیجا، اور ان کی تعریف کی۔ کیونکہ مخلوق سے خالق کے صحیح تعارف اور خالق کے صحیح صفات سے روشناس کرانے کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ اور ان کی بعثت مخلوق پر احسانِ عظیم، انسانوں کے لئے نعمتِ عظمیٰ اور اللہ کی ربوبیت، رحمت اور حکمت کا تقاضائے بلیغ ہے۔ اس لئے اس سلسلہ کو ختم کرتے ہوئے فرمایا:-

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اور ساری تعریفیں اللہ ہی کو سزاوار ہیں جو سارے جہانوں کا رب ہے۔

اب بھی ہدایت و نجات کا راستہ پیغمبروں کی پیروی، اور اب قیامت تک خاتم

المرسلین سید الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرنے اور آپؐ کی سنت کی اتباع اور آپؐ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے۔(۱)

(۱)کاروانِ زندگی حصہ چہارم ص ۳۱ تا ص ۳۳۔ ۳۴۔ (۲) تحفہ کشمیر ص ۱۴۱ و ص ۴۲۔

(۳)اسلام کا انقلابی و تعمیری کردار ص ۳۶ تا ص ۳۹ سے مشترک ماخوذ ہے۔

قرآن کا پیغام

وَلَاتَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوْا اللّٰہَ فَاَنْسَاھُمْ اَنْفُسَھُمْ. (الحشر)

ترجمہ: ان لوگوں کی طرح نہ ہو جنھوں نے خدا کو بھلایا تو

خدا نے ان کو ایسا بنادیا کہ وہ اپنے کو بھول گئے۔

انسان کو سب سے زیادہ تعلق اپنی ذات سے ہے، تمام دلچسپیوں کا محور و مرکز انسان کی اپنی ذات ہے۔ گہری نظر رکھئے تو اس کو جس سے محبت ہے اپنی ذات کے لئے ہے جو اس سے محبت کرتا ہے اس سے وہ بھی محبت کرتا ہے، جس کو اس سے نفرت ہے اس میں ہزاروں خوبیاں ہوں اس سے دل کو لگاؤ نہیں پیدا ہوتا، زندگی کی ساری حرکت، چہل پہل دوڑ دھوپ اسی محبت کے دم سے ہے، جہاں جائے گا اسی کا ظہور پائے گا۔ ہر محبت کی تہہ میں اسی محبت کی کرشمہ سازی نظر آئے گی، دنیا کی ہر چیز فراموش ہو سکتی ہے، انسان ہر ایک سے غافل اور مشغول ہو سکتا ہے، لیکن نازک وقت میں اپنی ذات سے غفلت نہیں ہوتی اور کٹھن گھڑی میں جب اولاد، متعلقین، اعزاز واحباب سب فراموش ہو جاتے ہیں اپنی فکر رہتی ہے اور انسان اپنی خیر مناتا رہتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے، روز مرہ کا مشاہدہ ہے، فطرت انسانی کا خاصہ ہے، اس کے خلاف اگر دعویٰ کیا جائے تو کان کھڑے ہوتے ہیں، کیا واقعی انسان کبھی اپنے کو بھول جاتا ہے اور اس کو اپنی فکر نہیں ہوتی اور سب کی فکر ہوتی ہے؟ اس کو اپنا ہوش

نہیں رہتا اور ہر بات کا ہوش رہتا ہے، اس کو سارے جہاں کی فکر ہوتی ہے اور اپنی فکر سے غافل ہوتا ہے۔ اس کو سب کی جان عزیز ہوتی ہے، اور اپنی جان کے پیچھے ہاتھ دھوئے پڑا رہتا ہے؟ اور یہ کسی بلند مقصد کے ماتحت نہیں، کسی اصول اور کسی نظریے کے ماتحت نہیں، ایثار و قربانی کے جذبے سے نہیں بلکہ یہ خود فراموشی کے عالم میں اور ایک ذہنی طاعون کے طور پر!

خدا فراموشی کی سزا خود فراموشی ہے

قرآن مجید یہی دعویٰ کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ خدا فراموشی کی سزا خود فراموشی ہے۔ جب انسان خدا کو بھلاتا ہے تو وہ یہ دکھادیتا ہے کہ پھر اپنے کو بھولتا چلا جاتا ہے۔ اس کو خود فراموشی طاری ہوجاتی ہے، زندگی کا انہماک بڑھتا چلا جاتا ہے، ساری زندگی انسان کے گرد چکر لگاتی نظر آتی ہے، مگر انسان کسی اور چیز کے گرد طواف کرتا نظر آتا ہے، مقاصد نگاہوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں اور ذرائع ووسائل مقصود بن جاتے ہیں، اشیاء سے براہ راست ایسی دلچسپی پیدا ہوجاتی ہے کہ اپنی ذات بھی بیچ میں سے نکل جاتی ہے، پھر ایک ایسی بحرانی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے کہ احساسات ختم ہوجاتے ہیں، لذت و راحت جو دنیا میں ہمیشہ سے بڑے مقصود رہے ہیں، ذہن سے نکل جاتے ہیں، انسان ان سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے، اور اس محرومی کا احساس اور اس پر افسوس بھی ختم ہوجاتا ہے، خیالی چیزیں حقیقی چیزوں کی جگہ لے لیتی ہیں اور انسانی زندگی عجائبات کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے، اور یہ سب اس دور میں ہوتا ہے جب خدا کے بجائے انسان اپنی ذات کی پرستش کرنے لگتا ہے اور اپنے سوا ہر چیز کے انکار پر آمادہ ہوجاتا ہے، لیکن یہ خدافراموشی اور خدا سے یہ بغاوت جتنی ترقی کرتی ہے خود

فراموشی، خود دشمنی، خود کشی اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔

تمدن کے شاید کسی دور میں اس آیت کا ظہور اس طرح نمایاں اور صاف طریقے پر نہ ہوا ہو جتنا اس دور تہذیب وترقی میں، انسان کا اپنی ذات کے معاملات میں انہماک، اپنی ذات سے شیفتگی شاید اتنی کسی زمانے میں نہ پیدا ہوئی ہو جتنی اس زمانے میں، لذت وراحت کے وسائل شاید کبھی اتنے ایجاد نہ ہوئے ہوں جتنے اس دور میں، خود پرستی کا فلسفہ شاید کسی عہد میں ایسا مرتب نہ ہوا ہو اور اس کی اشاعت شاید کبھی اتنے بڑے پیمانے پر نہ ہوئی ہو جیسی اس زمانے میں، اپنے سوا ہر چیز کے انکار کا ذوق اور جوش شاید کبھی اتنا عام نہ ہوا ہو جتنا اس موجودہ سوسائٹی میں، لیکن واقعہ اور دن رات کا مشاہدہ کیا ہے؟ کیا یہ نہیں کہ انسان اپنے حقیقی مسائل سے سب سے زیادہ غافل ہے؟ اپنے انجام سے سب سے زیادہ بے فکر ہے؟ اپنی ذات سے سب سے زیادہ بے پرواہ ہے؟ حقیقت لذت وراحت سے سب سے زیادہ محروم ہے، زندگی کے ذخیرہ میں اس کا اپنا حصہ سب سے زیادہ کم ہے، وہ روپیہ ڈھالنے کی مشین بن کر رہ گیا جو اپنے ڈھالے ہوئے سکوں سے خود فائدہ نہیں اٹھاسکتی، اس کا حصہ زندگی میں صرف اتنا ہے کہ اس کو اتنا تیل دیا جاتا رہے جس سے وہ چلتی رہے، جذبات واحساسات سے عاری، لذت والم سے محروم، مسرت وکلفت سے بے خبر ایک بے جان مشین ہے۔

وہ تیلی کا بیل بن کر رہ گیا ہے جو ایک مقرر دائرہ کے اندر چکر لگاتا رہتا ہے، کام لینے والے سے چارہ پانی پاتا ہے اور بغیر شکوہ وشکایت کے چکر لگاتا ہے، آج تمدن وسوسائٹی کے اس چکر میں انسان بھی تیلی کے بیل کی طرح پھرکی کی طرح پھر رہا ہے، تمدن کے ضوابط میں جکڑا ہوا ہے، سوسائٹی کے معیاروں کا پابند ہے، دوسروں

کے لئے کماتا ہے، دوسروں کے لئے پہنتا ہے، اور زندگی قائم رکھنے کے لئے اس کو راتب یا راشن ملتا رہتا ہے، وہ ایک قلی بن کر رہ گیا جو دنیا کے اس بڑے کارخانہ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑتا پھرتا ہے، بوجھ ڈھوتا ہے، تمدن کی گاڑی چلاتا ہے اور تھوڑی سی مزدوری پاتا ہے۔ حقیقی لطف و مسرت، اچھی غذا، اچھی ہوا، روح کی شادمانی، دل کے سکون، ضمیر کے اطمینان پیدا کرنے والی معرفت و محنت کی لذت سے محروم ہے اور زندگی کا دھارا تیزی سے بہہ رہا اور تمدن کا چکر اس زور کا چل رہا ہے کہ اس کو ان مسائل پر سوچنے کی بھی فرصت نہیں، جسم اتنا تھکا، دماغ اتنا شل، ذہن اتنا مشغول اور دل اتنا مردہ ہو چکا ہے کہ اس کو اس محرومی اور مدہوشی کا بھی ہوش نہیں، وہ اس دھارے میں تنکے کی طرح بہا چلا جارہا ہے، وہ ایک ایسا سوار ہے جو سواری کے قابو میں ہے، سواری اس کے قابو میں نہیں۔

نے ہاتھ میں عنان ہے نہ پائے رکاب میں

خدافراموشی کی سزا خود فراموشی عجب عبرت ناک ہے۔ لاکھوں، کروڑوں افراد، پوری کی پوری قومیں، بڑی بڑی سلطنتیں اس خود فراموشی، خودکشی کا شکار ہیں، ایک ذہنی طاعون ہے جو سارے عالم پر مسلط ہے، مگر آنکھ نہیں کھلتی، بجائے خداشناسی کی دعوت کے خدا فراموشی کی تلقین بڑھتی جاتی ہے، خدا سے بغاوت کے جھنڈے ہر طرف بلند ہیں، خود پرستی کی جتنی تبلیغ کی جارہی ہے خود فراموشی بڑھتی جاتی ہے، زندگی کی نعمتیں اور قلب و روح کی لذتیں چھنتی چلی جارہی ہیں، مقاصد اٹھائے جاتے ہیں اور وسائل میں الجھادیئے جاتے ہیں، دولت راحت کے لئے تھی، دولت رہ گئی، راحت لے لی گئی اور اس طرح لی گئی کہ اس کا کہیں نشان نہیں ملتا اور اب لوگوں نے

اس کی خانہ پوری بھی دولت ہی سے کرنی شروع کردی، غذائیں اور دوائیں بڑھ گئیں اور صحت سلب کرلی گئی۔ تیز رفتار سواریاں اور وسائل سفر راحت وسہولت کے لئے تھے، اب سرعت ہی مقصود بن گئی اور راحت مفقود ہو گئی، قدرتی دشواریاں دور ہوئیں تو قانونی اور مصنوعی دشواریاں خود پیدا کرلیں اور اپنے اوپر مسلط کرلیں، سفر آسان ہوا تو مقصد سفر مشکل ہو گیا، پہلے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا مشکل تھا اب پہنچنا آسان ہے لیکن منزل ڈراؤنی اور مقصد سفر بھیانک ہے، پہلے ایک شہر کے آدمی کا دوسرے شہر کے آدمی سے بات کرنا مشکل تھا اب بات کرنا آسان ہے لیکن اس بات میں کوئی دلکشی اور دل آویزی نہیں رہی۔ محبت کافور ہو گئی، خون سفید ہو گیا، اغراض کا ہر طرف دور دورہ ہے اس لئے بات کر کے کیا دل خوش ہو، پہلے دور افتادہ اور دور دراز کے لوگ آواز کو ترستے تھے مگر اب آواز سننے سے بیزار اور ریڈیو کے جھوٹ اور پروپیگنڈہ سے عاجز ہیں، غرض یہ کہ مقاصد کی خرابی یا طریق استعمال کی خرابی نے ان وسائل وآلات کو بھی بے کار بلکہ عذاب جان اور بلائے بے درماں بنادیا ہے اور انسانی زندگی بے معنیٰ، بے مقصد، بے روح، بے کیف بے لذت اور بے حس ہو کر رہ گئی ہے۔

قرآن کا پیغام یہ ہے کہ یہ خود فراموشی نتیجہ ہے خدا فراموشی کا، اس کا علاج صرف خدا شناسی اور خدا طلبی ہے۔ فرار کے بجائے واپسی، وحشت کے بجائے انس، انکار کے بجائے اقرار وایمان، بغاوت کے بجائے صلح، اور سرکشی کے بجائے اطاعت وانقیاد، اور خدا سے بھاگنے کے بجائے خدا کی طرف بھاگنے کی ضرورت ہے۔

"فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ اِنِّیْ لَکُمْ مِنْہُ نَذِیْرٌ"

(ماخوذ ماہنامہ بانگ درا لکھنؤ۔ اگست ستمبر ۱۹۹۸ء بحوالہ "صبح صادق" ۱۹۵۳ء)

پڑھو قرآں سمجھ کر اور عمل دل سے کرو اس پر
فنا ہو حق کی مرضی میں، بنو محبوبِ سبحانی

قرآن مجید کے فہم کا دروازہ

"ان علمی تجربات میں اب اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ ...... قرآن مجید کے فہم کا اصل دروازہ جب کھلتا ہے جب آدمی بغیر کسی انسانی حجاب کے اس کلام کے ذریعہ صاحبِ کلام سے ہمکلام ہو، اس کا راستہ قرآن مجید کی بکثرت تلاوت ہے، اور نوافل یا بندگانِ خدا کی صحبت جو اس کتاب کے حقیقی لذت آشنا اور حقیقت شناس ہیں۔ اور جن کے رگ و پے میں یہ کلام بس گیا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ پڑھنے والا اس کتاب سے براہِ راست تعارف و اُنس حاصل کرے اور اس کو ایسا محسوس ہو کہ وہ براہِ راست مخاطب ہے......!

شاعر نے کچھ غلط نہیں کہا کہ ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف !

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی
(میرے مطالعہ قرآن کی سرگذشت۔ نئی دنیا قرآن نمبر)

باب ۲

دعوت وعزیمت

''دعوتِ دین بہت نازک کام ہے، اور اس کی وسعت کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، اس کے کچھ حدود مکانی ہیں اور کچھ زمانی۔ اور دونوں انتہائی وسیع اور پھیلے ہوئے، زمانے کے لحاظ سے دیکھئے تو اس کا زمانہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ کسی پیغمبر نے دعوت کا آغاز کیا یا غیر پیغمبر نے اس دعوت کی ابتداء کی اور اس کی انتہا کوئی بھی نہیں ہے، اسی طرح اس کا مقام (مکانی حدود) بھی متعین نہیں کیا جا سکتا، ہو سکتا ہے کہ داعی مشرق میں ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مغرب میں ہو یا مشرق سے مغرب یا مغرب سے مشرق منتقل ہو جائے، لہٰذا اگر صرف اہل مشرق کو سمجھانے کا طریقہ اس کو معلوم ہے تو مغرب میں وہ افہام وتفہیم کا کام انجام نہیں دے سکتا، اور اگر وہ صرف اہلِ مغرب کے طبائع اور نفسیات سے واقف ہے تو مشرق میں اس کی دعوت برمحل اور بار آور نہیں ہو گی''۔

(دعوت و تبلیغ کا معجزانہ اسلوب)

دعوت وتبلیغ کے اصول وآداب

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ﴾ (النحل: ۱۲۵)

حقیقت تو یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کے اصول و ضوابط کی تحدید نہیں کی جاسکتی، اس کا تعلق انسانی فہم و عقل اور بشری اذواق و جذبات، ماحول و معاشرہ پر ہے۔ ہاں عربی زبان کے وہ الفاظ جن کا کسی زبان میں بدل اور نظیر نہیں، ان میں سے ایک لفظ ہے "حکمت" اس کے تعارف کے لئے آپ ایک ضخیم کتاب لکھ ڈالیں، تمام تفاصیل و شروحات کو یہ لفظ جامع ہوگا، یعنی فہم کے مطابق، استعداد کے مطابق، معاشرہ کے مطابق، ماحول کے مطابق، علاقے کے مطابق، طبیعت کے مطابق، ذوق و وجدان کے مطابق، عصری مطالبات و مقتضیات کے مطابق، موضوع کی اہمیت کے مطابق، مخاطب کی عقلی سطح اور نفسیات کے مطابق ان کے افکار و معتقدات کے مطابق ...... گویا کہ "حکمت" میں ہر وہ چیز شامل ہوگئی جو کسی سے اپنی بات منوانے کے لئے ضروری اور ناگزیر ہوتی ہے۔

میں ایک جگہ محاضرہ دے رہا تھا، مجھ سے سوال کیا گیا کہ دعوت کے اصول و ضوابط اس کے حدود عمل اور دائرہ کار اور عنوانات و اصطلاحات کی تعریف و تعیین کر

دی جائے۔ میں نے کہا کہ اس سوال کا حال تو ویسے ہی ہے جیسے ایک شخص نے نوکر رکھا، اس نوکر سے جتنے کام لینے تھے اس نے اس کی ایک فہرست بنا کر اس نوکر کو دے دی ایک دن اس کا آقا گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا، جیسے ہی رکاب میں پاؤں رکھا پاؤں الجھ گیا۔ اور قریب تھا کہ وہ زمین پر آگرے۔ اس نے نوکر کو آواز دی تو اس نوکر نے دور ہی سے وہ پرچی دکھلائی جس میں اس کے کاموں کی فہرست درج تھی، اس نے کہا کہ اس فہرست میں کہاں درج ہے کہ جب گھوڑے پر سوار ہوتے وقت میرا پاؤں رکاب میں الجھے تو تم میرا تعاون کرنا۔ کچھ یہی حال دعوت کے اصول و قوانین کا بھی ہے کہ ہم لفظوں میں اس کی تحدید و تعیین نہیں کر سکتے، ہم خالقِ کائنات کے بندے اور اس کے غلام ہیں، جس چیز کی بھی ضرورت ہو۔ دین اسلام کو جس میدان میں ضرورت ہو۔ اسی کی تکمیل کا نام دعوت ہے۔

البتہ ''دعوت'' کی تاریخ، اس کے اغراض و مقاصد سے واقفیت ضروری ہے۔ قرآن و حدیث پاک کے حکیمانہ اسلوب کا مطالعہ بھی از حد ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ، تاریخ اسلام کے مجددین کے کارناموں، ان کے طریقۂ کار اور طرز عمل کو بھی نگاہ میں رکھیں، مثال کے طور پر میں قرآن کے ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہوں جس سے بہت سے اصول و آداب پر روشنی پڑے گی۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ. قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّيْ أَرَانِي أَعْصِرُ خَمْراً. وَقَالَ الآخَرُ إِنِّي أَرَانِيْ اَحْمِلُ فَوْقَ رَأسِيْ خُبْزاً تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ. نَبِّئْنَا بِتَأْوِيْلِهِ، إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ○ قَالَ لَا يَأتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأوِيْلِهِ قَبْلَ أَنْ يَّأتِيَكُمَا. ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ

بِالْآخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ۝ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِيْ إِبْرَاهِيْمَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ. مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ. ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ۝ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّا اَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوْهَا أَنْتُمْ وَآبَائُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ. اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ. اَمَرَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ. ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۝ (سورہ یوسف آیت ۳۵۔۴۰)

ترجمہ:- قید خانہ میں اس (یوسفؑ) کے ساتھ دو غلام بھی داخل ہوئے، ایک روز ان میں سے ایک نے اس سے کہا "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب کشید کر رہا ہوں" دوسرے نے کہا۔ "میرے سر پر روٹیاں رکھی ہیں اور پرندے اس کو کھا رہے ہیں"۔ دونوں نے کہا "ہمیں اس کی تعبیر بتایئے، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نیک آدمی ہیں" یوسف علیہ السلام نے کہا "یہاں جو کھانا تمھیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمھیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا، یہ علم ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، اپنے بزرگوں، ابراہیم، اسحاق، اور یعقوب (علیہم السلام) کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا کام یہ نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔ درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا) مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے زنداں کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے

سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آباء و اجداد نے رکھ لئے ہیں، اللہ نے اس کے لئے کوئی سند نہیں نازل کی۔ فرمانروائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔ (سورہ یوسف ۴۰)

دعوت اور حکمت وموعظت

قرآن پاک نے نہایت بلیغ اور حکیمانہ انداز میں حضرت یوسف علیہ السلام کے اسلوب دعوت کو بیان کیا ہے کہ انھوں نے کس احتیاط، حکمت، دانشمندی، معاملہ فہمی، موقع شناسی کے ساتھ قید خانہ میں دعوت کا کام کیا۔ اس کا خلاصہ ہم ذکر کرتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے کس طرح دعوت دی؟ تو قرآن پاک نے اپنے معجزانہ اور حکیمانہ اسلوب میں پوری منظر کشی کی ہے۔ اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سے کوئی سامان خریدتا ہے تو سب سے پہلے مناسب جگہ کا انتخاب کرتا ہے، تاکہ اطمینان خاطر ہو، دھوکہ اور فریب کا خطرہ نہ ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ کام جلدی ہو۔ (مثلاً دوا خریدنا ہو) اگر دوکان بند ہو رہی ہو اور وہ شخص اس وقت دوکان پر پہونچے اور سامان طلب کرے تو جواب میں وہ دوکاندار کہے کہ کل تشریف لائیے آج تو معاف رکھئے تو وہ شخص دوبارہ اس دوکان پر کبھی نہ جائے گا۔ اس لئے کہ وہاں تو مریض کی جان جارہی ہے، دوا کی اشد ضرورت

ہے، کل دوا لے جاکر وہ کیا کرے گا، مسئلہ موت وحیات کا ہے کوئی کھیل تماشہ نہیں، لہٰذا کام وقت پر ہونا چاہئے۔

تیسرے یہ کہ وقت کا تعین بھی قابل اطمینان ہو اس کے لئے سکون پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر دوکان پر گاہک آیا تو دوکاندار کہے کہ فلاں کام کرلوں تو سامان دوں گا، چار گھنٹہ بعد آنا فلاں شخص سے ملاقات کرلوں تب سامان دوں گا۔ ایسی صورت میں وہ شخص وہاں سے بھاگ جائے گا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ وہ شخص مطلوبہ چیز ہی پر اکتفانہ کرے بلکہ دیگر قابل نفع چیز کا بھی اضافہ کرے اگر ممکن ہو۔

پانچویں یہ کہ طالب کی خرابیوں کو دور کرے مثلاً ڈاکٹر کے پاس بخار کی دوا لینے گئے مگر ہمیں دوسرا بھی مرض ہے مگر ہمیں معلوم نہیں تو ڈاکٹر کا فریضہ ہے کہ بخار کی دوا دینے کے ساتھ اس دوسرے مرض کا بھی ازالہ کرے اور کہے کہ جناب آپ کی پیشانی کے خطوط بتاتے ہیں کہ آپ کو بلڈ پریشر کی بیماری ہے، آپ کا چہرہ بتاتا ہے کہ آپ کا گردہ خراب ہے۔

جن نکات کی جانب میں نے سطور بالا میں اشارہ کیا یہ تفسیروں اور شروحات میں نہ ملیں گی، یہ قرآن کے عمیق مطالعہ سے اور گہرے لگاؤ سے معلوم ہوتی ہیں۔ مذکورہ بالا وہ آیتیں جن میں حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو بیان کیا گیا ہے اگر انہیں پڑھ کر کوئی شخص ایمان لے آئے تو عین تقاضائے بلاغت کلام ربانی ہوگا۔ مثلاً غور کیجئے۔ دو آدمی اپنے خواب کی تعبیر پوچھنے آئے تو اولاً انھوں نے ان کی دیانت و امانت، علم و آگہی فضل و کمال کے بارے میں ضرور اطمینان کرلیا ہوگا وہ ضرور جان

رہے ہوں گے کہ یہ کوئی اور ہی عالم کے آدمی ہیں۔ نبوت سے وہ تو واقف نہ ہوں گے مگر ایک پیغمبر کے چہرے پر جو نورانیت، تقدس، عصمت و پاکیزگی کے آثار ہو سکتے ہیں۔ اسے انھوں نے ضرور دیکھا اور محسوس کیا ہوگا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ داعی ایسا ہو کہ دل خود اس کی جانب متوجہ ہو۔ اور وہ داعی بھی اپنے طالبین کی جانب زیادہ متوجہ ہوں، چنانچہ ان دونوں قیدیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی بات میں دلچسپی لی، اور انھوں نے ان کی بھی خاطر خواہ خبر گیری کی۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ داعی کا اپنا ایک معیار و تشخص ہونا چاہئے۔ اس کا ایک مخصوص شعار ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ اسے دیکھ کر اس کی جانب متوجہ ہوں۔ داعی کو ہر حال میں اپنا امتیاز برقرار رکھنا چاہئے۔

چھٹی بات یہ ہے کہ جیل میں داخل ہوتے ہی تمام قیدیوں نے اچھی طرح جان لیا ہوگا کہ حضرت یوسف علیہ السلام مجرم نہیں، یہ ضرور بے خطا ہیں انھیں ظلماً جیل خانہ میں محبوس کیا گیا ہے کیونکہ جیلر چہرے کا رنگ دیکھ کر بتا دیتا ہے کہ کون عادی مجرم ہے اور کون بے قصور ہے یہ ایک نفسیاتی بات ہے، ایک نظر پڑتے ہی لوگ آپ کے تقدس کے ضرور دل سے معترف ہوئے ہوں گے۔

ساتویں یہ کہ انھوں نے تعبیر پوچھی آپ نے تعبیر بتائی، آخر انھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ آپ صاحب علم و عمل ہیں، خواب کی تعبیر جانتے ہیں، لہٰذا ماننا پڑے گا کہ ضرور انھوں نے ظاہری حالت و ہیئت کو دیکھ کر اندازہ لگایا ہوگا، کیونکہ اس زمانہ میں ڈائری تو نہ تھی کہ جیل میں آنے والوں کے احوال ریکارڈ ہوتے۔

خیر و شر کی تمیز

اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں جاہل سے جاہل، پست سے پست انسان میں یہ قوت ودیعت فرمائی ہے کہ وہ خیر و شر کی تمیز کرے، قیافہ شناسی ہی تھی کہ لوگوں نے بھانپ لیا کہ یہ مجرم نہیں ہیں۔ چنانچہ انھوں نے برجستہ کہا "اِنَّا نَرٰكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ" یہ لفظ بھی عربی زبان میں نہایت وسیع و عمیق معنوں میں مستعمل ہے جن میں صاحب کمال، صاحب جاہ و جمال، شرافت و نجابت والا، اونچا آدمی وغیرہ شامل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ فلاں دوکان پر فلاں سودا ملتا ہے، ایسا نہ ہو کہ آپ کسی دوکان پر گئے۔ اور وہاں کے بارے میں معلوم ہی نہ ہو کہ کون سا سامان ملتا ہے تو صرف شرمندگی حاصل ہوگی۔

...... دوسری بات یہ ہے کہ ہر موقع تواضع و انکساری کا نہیں ہوتا ہے، کوئی شخص کسی علمی موضوع پر گفتگو کرے آپ ہمیشہ تواضعاً ہاں میں ہاں ملائیں، اس کی کسی بات کا جواب نہ دیں تو وہ آپ کو جاہل سمجھے گا۔ حضرت یوسفؑ سے صرف انھوں نے تعبیر پوچھی تھی مگر انھوں نے اپنی علمی سطح، اور مبلغ عقل و فکر کو اجاگر کرتے ہوئے کہا: قَالَ لَا يَأْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖ اِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّأْتِيَكُمَا۔ آپ نے گویا انہیں یہ اشارہ دے دیا کہ تمہیں جو سودا مطلوب و درکار ہے وہ میرے یہاں موجود ہے۔

اللہ کی وحدانیت و خالقیت کا درس

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اگر چاہتے تو کوئی وقت مقرر کر دیتے کہ تھوڑی دیر بعد آنا، مگر انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ موقع دوبارہ ہاتھ نہ آئے۔ لہٰذا داعی دوسروں کی دینی ضرورت کو فی الفور پوری کرنے کو غنیمت جانے۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے کھانے کا ذکر کیا، کیونکہ جیل کی محدود اور سخت زندگی میں کھانا بڑی مرغوب شئے ہوتی ہے، یہ ایک نفسیاتی جملہ تھا۔ اس سے ان قیدیوں کو ضرور کچھ سکون و اطمینان ہوا ہوگا۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ کہا تھا۔ کہ کھانا آنے سے قبل میں بتا دوں گا کہ تمھیں کون سا کھانا ملے گا۔ اس پر مستزاد ایک دوسرے مفسر نے یہ لکھ دیا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کو داروغۂ مطبخ بنا دیا گیا تھا۔ مگر واقعہ یہ ہے "تاویلہ" کی ضمیر کھانے کی طرف نہیں بلکہ خواب کی طرف راجع ہے۔ موقع کی نزاکت اس بات کی طالب تھی کہ وہ فخریہ کہتے کہ میں تو تمھاری تعبیر اپنی ذہانت و فطانت اور ذکاوت و فراست سے بتا سکتا ہوں۔ اور اس طرح کے تو میں نے بہت سے معرکے سر کئے ہیں، یہ کون سی بڑی بات ہے، مگر نہیں! انھوں نے ایسا کچھ نہ کہا۔ بلکہ انھیں اپنی ذہانت وفطانت سے مرعوب کرنے کے بجائے توحید کا سچا درس دیا خداوند قدوس کی خالقیت و رزاقیت، اس کی وحدانیت و پاکیزگی کا وعظ کہا۔ وہ بھی ایسا جامع وعظ کہ اگر اس سلسلے میں ایک مستقل ضخیم کتاب تیار کی جائے تو بجا ہے۔

مثلاً انھوں نے ان کے خداؤں کو بُرا بھلا نہ کہا، یا اور دوسرا کوئی سلبی پہلو نہ

اختیار کیا بلکہ ایجابی نقطۂ نظر پر عمل کرتے ہوئے، "ذلکما مما علمنی ربی" یہ تو میرے رب کا سکھایا ہوا ہے، نہ کسی قسم کی کوئی تعریض اور نہ کسی پر کوئی حملہ۔ دوسرے یہ کہ یہ بھی نہ کہا کہ ارے صاحب یہ تو میرے بھائی، چچا اور باپ دادا کا عطا کردہ ہے میرا گھرانہ علمی اور دینی گھرانہ ہے ان کی تربیت ہی کا اثر ہے کہ میں آپ لوگوں کو تعبیر بتانے کے قابل ہوا۔ بلکہ تمام معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا اور فرمایا "ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي، وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِيْ إِبْرَاهِيْمَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ" یہ اثباتی پہلو ہے، انھوں نے ان اسماء کا ذکر اس لئے کیا کیونکہ غالباً اس زمانہ کے لوگ ان ناموں سے پہلے ہی مانوس تھے، یہ اسماء ضرور پہلے سے وہاں پہونچے ہوں گے اور غالباً وہ اس کی ضرور عزت و تکریم بھی کرتے رہے ہوں گے۔ پھر اپنی ذات سے بڑائی اور ترفع کا انکار کیا، اور کہا یہ سب کچھ محض فضل الٰہی ہے اور قرآن نے اس کو ان الفاظ میں ادا کیا: ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَايَشْكُرُوْنَ. یہ خدا کا فضل ہے ہم پر بھی اور لوگوں پر بھی لیکن اکثر لوگ شکر نہیں ادا کرتے۔

اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور فرمایا۔ يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ میرے جیل خانہ کے رفیقو! بھلا کئی جدا جدا آقا اچھے یا ایک خدائے یکتا و غالب؟ واقعہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھانپ لیا تھا کہ اگر میرا یہ عقیدہ فاش ہو گیا اور بادشاہ کو معلوم ہو گیا کہ میں نیا دین اور نیا عقیدہ رکھتا ہوں اور پھر دوسروں کو اس کی تلقین بھی کر رہا ہوں تو اس کا انجام کچھ زیادہ اچھا نہ ہو گا۔ اس لئے اپنائیت اور رازداری کے انداز میں "صاحب" (ساتھی) کے لفظ سے مخاطب کیا۔ اور اس طرح کے اندیشے شانِ نبوت

کے خلاف نہیں۔

یہاں سلامت ایمانی اور فراست یوسفی نے اشارہ دیا کہ بس یہیں پر ٹھہر جائیں کیوں کہ خطرہ تھا کہ وہ دونوں گھبرا جائیں، اکتاہٹ محسوس کریں۔ اور کہیں کہ ہم تو صرف تعبیر پوچھنے کے لئے آئے ہیں، آپ کی لمبی چوڑی تقریر اور خطاب سماعت کرنے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ خوفناک تعبیر سن کر ویسے ہی طبیعت پریشان ہے اور ابھی تک ہم لوگوں نے کھانا نہیں کھایا ہے۔ لہٰذا آپ اپنے اس طویل وعظ سے معاف ہی رکھئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان نفسیاتی دواعی کا لحاظ کرتے ہوئے بات کو مختصر کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ دعوت کے سلسلے میں ہر چیز کی ایک حد مقرر ہے کہ مضمون و مادہ کتنی مقدار میں ہو، تاریخ کا کتنا حصہ ہو۔ ادب و زبان کی چاشنی کتنی مقدار میں ہو۔ تفہیم اور سلاست کتنی مقدار میں۔ ہر ایک کا ایک کوٹا مقرر ہے ان تمام باتوں کا لحاظ ایک نبی اور ابن نبی نہیں کرتا تو کون کرتا۔ اور تمام داعیانِ اسلام کے لئے بھی اس کی رعایت ملحوظ رکھنی چاہئے۔

اس پورے قرآنی ٹکڑے میں دعوت کا اسلوب، طریق کار، حکمت، انداز تخاطب، بالکل مجسم اور ناطق نظر آرہا ہے۔(۱)

---

(۱) "تعمیر حیات" لکھنؤ ۱۰ر جون ۱۹۹۸ء

دین حق و دعوتِ اسلام

ایک فلک بوس عمارت اور سدا بہار درخت

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ، تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ○

(سورہ ابراہیم۔ ۲۴-۲۵)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے پاک بات کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے؟ (وہ ایسی ہے) جیسے پاکیزہ درخت جس کی جڑ مضبوط (یعنی زمین کو پکڑے ہوئے) ہو، اور شاخیں آسمان میں، اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا (اور میوے دیتا) ہو اور خدا لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

کسی ملک اور کسی عہد میں بھی دین کا کام کیا جائے، دین کے تعارف کا کام کیا جائے، اسلام کی طرف دعوت دینے کا کام کیا جائے، اسلام کے محاسن کو پیش کرنے کا کام کیا جائے اور لوگوں کو زندگی اور زندگی کے بعد کے خطرات سے نکالنے کا کام کیا جائے، تو یہ آیت اس کی پوری تصویر کھینچ دیتی ہے۔

اس آیت میں مکانی رقبہ بھی آگیا اور زمانی رقبہ بھی آگیا اور اس کی بنیاد اور اس کا سرچشمہ بھی آگیا اور اس کے نقطۂ عروج اور جن بلندیوں تک اسلام کی دعوت پہنچ سکتی ہے اس کا ذکر بھی آگیا۔

آپ ایک درخت کی حقیقت پر غور کیجئے ﴿كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ﴾ پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ اچھا درخت ہو "شَجَرَة طَيِّبَة" ہو، اور یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں شرط ہے کام کی کامیابی کے لئے، کتنی ہی بڑی ذہانت اور کتنے بھی بُلند مقاصد، کتنے ہی وسیع وسائل، کتنی ہی بڑی جمعیت، کتنی ہی بڑی تنظیم، کتنی ہی اپنے عہد کی علمی و صنعتی ترقیاں سب ساتھ ہوں تو وہ اللہ کے یہاں معتبر نہیں ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ مقصد صحیح ہو، دافع اور محرک صحیح ہو اور وہ دعوت بذاتِ خود صحیح ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً. کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے پاک بات کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے؟

کلمۂ طیبہ ہونا چاہئے

پہلی شرط تو یہ ہے کہ کلمۂ طیبہ ہو، صرف کلمہ ہونا کافی نہیں، دنیا میں ایک بہت بڑی غلطی یہ ہوتی رہی ہے، ادبیات کی تاریخ بتاتی ہے، شاعری کی تاریخ بتاتی ہے، ذہانت و حکمت کی تاریخ بتاتی ہے، یونان کے فلسفہ و منطق کی تاریخ بتاتی ہے کہ لوگوں نے کلمہ کو کافی سمجھ لیا، کلمہ ہونا چاہئے اور اس کے اندر انسان کی ذہانت جھلکنی چاہئے، اس کے اندر مضمون آفرینی ہونی چاہئے، انسان کے مطالعہ کی گہرائی ہونی چاہئے، اظہارِ بیان کی طاقت ہونی چاہئے، دنیا میں زیادہ تر اسی پر زور دیا گیا ہے، آپ ساری دنیا کے ادبیات کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان سب میں "کلمہ" پر زور ہے "کلمۂ طیبہ" پر زور نہیں۔

پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ کلمہ طیبہ ہو، اس کا مقصد صحیح ہو، بات جو کہی جائے تو

صرف اتنا کافی نہیں کہ وہ فصیح و بلیغ ہے، بعض لوگوں نے اس کو کافی سمجھا ہے، اگر آپ مذہبی، دینی نفسیات کی تاریخ پڑھیں اور دعوتوں کی تاریخ پڑھیں، تو بہت جگہ ایسا ہوا ہے کہ بہت سے لوگوں نے کلمہ کو کافی سمجھا ہے کہ بات اچھی طرح (Tactfully) کہی جا رہی ہے، لیکن وہ خود بجائے خود صحیح ہے، اس کا رشتہ صحیح ہے، وہ خالقِ کائنات سے، الہام اور اس کی رہبری سے اخذ کی گئی ہے، وہ صُحُفِ سماویہ سے لی گئی ہے، وہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے ماخوذ ہے، یا صرف اس میں انسان کی فصاحت و بلاغت ہی ہے، اس کا زورِ بیان ہے، اس کی شاعری کی لطافت ہے؟

کلمۂ طیبہ کی مثال دینے کے لئے دنیا میں سیکڑوں، ہزاروں چیزیں ہو سکتی تھیں، موتی، جواہرات، سونا، چاندی، پھول، پھل سب سے تشبیہ دی جا سکتی تھی، لیکن "کلمۂ طیبہ" کے بار آور ہونے اور اس کے ثمر دار ہونے اور اخیر عہد تک اس کے کام کرتے رہنے کی مثال "درخت" سے بہتر نہیں ہو سکتی، درخت کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ وہ "شجرۂ طیبہ" ہو، یہ نہیں کہ آپ نیم کا درخت لگالیں اور آپ اس سے آم کی امید رکھیں، آپ کانٹے بوئیں اور آپ اس سے پھول کی توقع کریں، خود وہ شجرہ بھی طیبہ ہونا چاہئے جیسے کلمہ طیبہ ہوتا ہے۔ اس کی تعریف میں کہا گیا ہے "کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ" اب اس کے بعد قرآن کا اعجاز ہے وہ کہتا ہے:-

اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ. جس کی جڑ مضبوط ہو اور شاخیں آسمان میں۔

آپ ان الفاظ کی وُسعت اور ان کی لطافت پر غور کریں تو ان میں سب کچھ کہہ دیا گیا ہے، اس میں ادیان سماویہ کی تاریخ آگئی، اس میں نبوات اور پیغمبروں کی مساعی اور کوششوں کی تاریخ آگئی، اس میں ان روحانی تبدیلیوں اور انقلابات کی تاریخ آگئی

جس کا احاطہ اس وقت تک نہیں کیا گیا، اور احاطہ کرنا مشکل ہے، سیکڑوں نہیں، ہزاروں نہیں، لاکھوں مثالیں ایسی ہوں گی مخلصین کے کلام کی کہ جن کا کوئی ریکارڈ ہمارے سامنے نہیں ہے۔

ایک تو یہ کہ وہ ایسا شجرۂ طیبہ ہو کہ "اَصْلُهَا ثَابِتٌ" اس کی جڑ تو زمین میں ہوگی "وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ" اور اس کی شاخ آسمان سے بات کرتی ہوگی، ایک انسان کی زبان سے کلمہ نکلے گا، لیکن وہ قوموں کی تقدیر بدل دے گا، زمانہ کا رُخ بدل دے گا، سوچنے کا طریقہ بدل دے گا، قوموں کی قومیں دین حق میں داخل ہوں گی۔

ایک مثال ......

دل سے جو بات نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے!

اس کے لئے میں ایک مثال جو اس وقت میرے ذہن میں آئی آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں کہ آپ یہ دیکھیں کہ ایک چھوٹا سا کلمہ کیا کام کرتا ہے؟ اس کے لئے میں عرض کردوں اپنے فاضل دوستوں کے سامنے کہ محض مطالعہ، محض ذہانت، پیش کرنے کا بہتر سے بہتر طریقہ، الفاظ کا انتخاب، انشاء پردازی، اور خطابت کا زور تنہا کافی نہیں ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دل کی گہرائیوں سے نکلا ہو، اور اسلام کو جو اس وقت آپ دنیا میں پھیلا ہوا دیکھ رہے ہیں، اسلام کی جو فتوحات ہیں، ان میں ایک بہت بڑا عامل (Factor) یہ تھا کہ جو بات دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ ؏

ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد

تو قلق(۱) تیمور تاتاریوں کی ایک شاخ کا شاہزادہ تھا جس کا پایۂ تخت کاشغر تھا، آپ کو معلوم ہے کہ ساتویں صدی ہجری اور تیرہویں صدی عیسوی میں تاتاریوں نے ترکستان اور ایران پر حملہ کیا اور پھر اس کے بعد وہ بغداد تک پہنچ گئے، اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور عالمِ اسلام کی چولیں ہلا دیں، ایسا نظر آنے لگا کہ اب اسلام دنیا میں ایک طاقت کی حیثیت سے باقی نہیں رہے گا، ان کی ایک شاخ (وہ مختلف شاخوں میں تقسیم ہو گئے تھے) جو ترکستان پر حکمراں تھی، جس میں ایران بھی شامل تھا، اس کا وہ ولی عہد تھا، ابھی اس کی تاج پوشی نہیں ہوئی تھی تاج پوشی کے بعد وہ اس پورے قلمرو کا حکمراں ہوتا، وہ شکار کے لئے نکلا ......، ہر طرف پہرے بٹھا دیئے گئے کہ کوئی باہر کا آدمی شکار گاہ میں داخل نہ ہونے پائے، ایک ایرانی بزرگ شیخ جمال الدین کہیں جا رہے تھے، وہ نادانستہ اس شکار گاہ میں داخل ہو گئے، ان کو مشکیں باندھ کر شہزادہ کے سامنے حاضر کیا گیا، خان نے ان سے غضبناک ہو کر کہا کہ ایک ایرانی سے تو کتا ہی بہتر ہوتا ہے، شیخ نے کہا کہ ہاں یہ سچ ہے، اگر ہم کو اللہ تعالیٰ دین حق کی نعمت و عزت نصیب نہ فرماتا تو ہم سے کتا ہی بہتر ہوتا، خان نے شیخ سے پوچھا کہ دین برحق کیا چیز ہے؟ شیخ نے اسلام کے عقائد ایسی گرم جوشی اور ایسے دینی ولولہ سے بیان کئے کہ اس کا پتھر کا دل موم کی طرح پگھل گیا، شیخ نے حالتِ کفر کا بھی ایسا ہیبت ناک نقشہ کھینچا کہ خان پر لرزہ طاری ہو گیا، خان نے شیخ سے کہا کہ جب آپ سنیں کہ میری تاج پوشی ہو گئی تو آپ مجھ سے ضرور ملیں۔(۱)

---

(۱) غالباً یہی نام بعد میں تغلق کے نام سے پکارا جانے لگا، فیروز تغلق شاہانِ دہلی ترکی النسل تغلق خاندان ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ (۱) ملاحظہ ہو "دعوت اسلام" ترجمہ از ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ باب ہشتم ص ۲۳۵۔۲۳۶

یہ دل سے نکلی ہوئی بات تھی اس لئے اس میں کوئی منطقی اثر ہو یا نہ ہو لیکن اس کے دل پر اس کا اثر پڑا، اور یہ من جانب اللہ بات تھی، یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جب تک دعوت میں وہ دل شامل نہ ہو جو نورِ باطن سے منور اور دردمند ہے، اور وہ بات دل کی گہرائی سے نہ نکلی ہو تو اس کا وہ اثر نہیں ہو سکتا کہ زندگی میں انقلاب پیدا کردے۔

اس کے بعد وہ برابر اس کے انتظار میں رہے کہ یہ اطلاع ملے کہ تغلق تیمور کی تاجپوشی ہو گئی ہو تو میں جاؤں اور یہ واقعہ یاد دلاؤں، لیکن ان کی قسمت میں نہیں تھا، جب وہ عالمِ سکرات میں تھے، آخر وقت تھا تو انھوں نے اپنے صاحبزادہ شیخ رشید الدین کو بلایا اور کہا کہ دیکھو بیٹا! میری قسمت میں تو یہ سعادت نہیں تھی، لیکن شاید تمھاری قسمت میں ہو، جب سُنا کہ تو قلق تیمور کی تاج پوشی ہو گئی اور وہ بادشاہ ہو گیا تو اس سے ملنا اور یہ واقعہ یاد دلانا۔

جب شیخ رشید الدین نے سنا کہ تو قلق تیمور کی تاج پوشی ہو گئی تو وہ گئے، اس کے شاہی محل میں تو ان کو کون اندر جانے دیتا، جب ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو انھوں نے ذرا فاصلہ پر ایک درخت کے نیچے مصلّی بچھا لیا اور وہاں نماز پڑھنی شروع کی، جب نماز کا وقت آتا اذان دیتے اور نماز پڑھتے، اور وقتوں میں تو اذان کی آواز نہیں پہنچتی، لیکن فجر میں ایک دن جو کہ سناٹے کا وقت ہوتا ہے محل میں آواز آئی، اس نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ یہ کیسی مجنونانہ صدا ہے؟ یہ کیا صدائے بے ہنگام ہے؟ لوگوں نے کہا کہ بادشاہ سلامت! (وہ جس طرح بھی خطاب کرتے ہوں) ایک مجذوب سا شخص ہے، وہ کچھ اٹھتا بیٹھتا ہے، اور یہ آواز لگاتا ہے، اس نے کہا کہ پکڑ لاؤ

اُسے، وہ لائے گئے تو اس نے کہا تم کون ہو؟ اور یہ کیا آواز لگاتے ہو؟ انھوں نے کہا آپ کو کچھ یاد ہے ایک مرتبہ آپ شکار میں گئے تھے، تو ایک ایرانی عالم آپ کو ملے تھے شیخ جمال الدین، ان سے آپ کا کچھ مکالمہ ہوا تھا، اس نے کہا کہ ہاں یاد ہے، انھوں نے کہا کہ میں یہ شہادت دینے آیا ہوں کہ ان کا ایمان پر خاتمہ ہوا، اس نے اسی وقت کلمہ پڑھا، آرنلڈ نے بھی یہ لکھا ہے، اور ترکی فارسی کتابوں میں بھی یہی لکھا ہے، اس نے کلمہ پڑھا اور اپنے ایک رازدار اور سربر آوردہ امیر کو بلایا اور تنہائی میں کہا کہ دیکھو میں نے اپنے متعلق فیصلہ کیا ہے کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں اب تم اپنے متعلق سوچو، انھوں نے کہا کہ حضور میں تو بہت دنوں سے مسلمان ہوں، آپ کے ڈر سے ظاہر نہیں کرتا تھا، اس کے بعد پھر اس طرح پوری کی پوری شاخ سو فیصدی مسلمان ہو گئی(۱)۔

قرآن مجید میں کوئی لفظ اتفاقی نہیں ہوتا

میں عرض کر رہا تھا "كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ" یہ محض اتفاقی لفظ نہیں ہے، قرآن مجید میں کوئی اتفاقی لفظ نہیں ہوتا، پہلی شرط یہ ہے کہ "شجرۂ طیبہ" ہو، یہ نہیں کہ آپ برگد کا درخت لگا دیں، نیم کا درخت لگا دیں، کانٹے بو دیں اور آپ ان سے اچھے پھل پھول کی امید کریں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ "شجرۂ طیبہ" ہو، پھر اس شجرۂ طیبہ کی جو صفت خدا نے

---

(۱) تاتاری حملہ کی ہیبت ناکی اور پھر پوری تاتاری نسل و قوم کے قبول اسلام کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو، صاحب مقالہ کی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ اول کا باب "فتنہ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش" ص ۳۰۲۔ ۳۳۴

بیان کی وہ بالکل اس کے دین کی صفت ہے کہ "اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ" جڑ تمھیں نظر آئے گی زمین پر، اور شاخیں تمھیں نظر آئیں گی آسمان پر، اب آپ اسلام کی تاریخ پڑھیے کہ کس پستی کی حالت میں، کس بے سرو سامانی کی حالت میں، کس کمزوری کی حالت میں اس کی ابتدا ہوئی اور پھر اس کی شاخیں کہاں تک پہونچیں۔

"تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِّاِذْنِ رَبِّهَا" یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے، ہر زمانہ میں وہ اللہ کے حکم سے پھل دیتا رہے گا، یہ محض "شجرۂ طیبہ" نہیں "شجرۂ طیبہ خالدہ" ہے، یہ زمانہ کے تغیرات کا تابع نہیں ہے، بہت سے درخت ہیں، جو اپنی عمر پوری کر لیتے ہیں، اور ختم ہو جاتے ہیں، جانور ان کو تباہ کر دیتے ہیں، اور خود ان کا لگانے والا کبھی ان کو کاٹ دیتا ہے، تو اس میں بتایا کہ اس کی مکانی وسعت تو یہ ہے کہ وہ زمین سے اٹھتا ہے اور آسمان تک جاتا ہے، یہ تو اس کی مکانی وسعت ہے، اور زمانی وسعت یہ ہے کہ "تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِّاِذْنِ رَبِّهَا" وہ اپنے پھل ہر زمانہ میں اللہ کے حکم سے دیتا ہے۔

شجرۂ طیبہ جو آخری رسول نے لگایا تھا

آج آپ اپنی آنکھوں سے اس آیت کا تحقق دیکھ رہے ہیں کہ وہ شجرۂ طیبہ جو آخری رسول نے لگایا تھا اور جس کی جڑ زمین میں تھی، کہاں تھی؟ جزیرۃ العرب میں تھی، جو سیاسی حیثیت سے، فکری حیثیت سے، علمی حیثیت سے، اور مالی حیثیت سے، ہر حیثیت سے دنیا کا پسماندہ ترین علاقہ تھا، اور ساری دنیا سے کٹا ہوا تھا "اَصْلُهَا ثَابِتٌ

وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَاءِ" اس کی شاخیں کہاں تک گئیں؟ اس کی شاخیں آسمان تک گئیں، آپ دیکھیں کہ اس کی اشاعت و فتوحات کے نتیجہ میں کتنی سلطنتیں پیدا ہوئیں، اس کے نتیجہ میں کتنی دانش گاہیں، کتنی جامعات وجود میں آئیں، کتنے مراکزِ ہدایت و تربیت قائم ہوئے، کتنے محقق پیدا ہوئے، کتنے مفکر پیدا ہوئے، کتنے ادیب پیدا ہوئے اور کتنا بڑا لٹریچر تیار ہوا، کسی ایک زبان میں بھی اگر آپ اس کا احاطہ کرنا چاہیں تو مشکل ہے، جو کلمہ کہا گیا تھا جزیرۃ العرب میں بیٹھ کر وہ کلمہ آج ساری دنیا میں پھیل رہا ہے، اور وہ اپنے پھل دے رہا ہے، شجرۂ طیبہ کی طرح پھل پھول رہا ہے۔

عناصر اربعہ کا خیال

ایک تو چیز ہے علم و معرفت، دوسری چیز ہے زبان کی تاثیر اور قوت، اور تیسری چیز ہے اخلاص و دردمندی، یعنی خود دل پر چوٹ ہو اور جو چیز نکلے بلکہ قلب سے نکلے صرف قلم سے نہ نکلے تب اس کا اثر ہوگا، اگر ہم نے ان "عناصر اربعہ" کا خیال رکھا تو مغربی ممالک میں، اور اس نئے بدلے ہوئے زمانہ میں اور مختلف زبانوں کے بولنے والوں میں تحریری و تقریری طور پر دینِ صحیح کی دعوت ضرور اثر انداز ہوگی، اور اللہ تعالیٰ اس کے بہتر سے بہتر نتائج عطا فرمائے گا، اس میں ہمارے لئے بہت بڑی بشارت اور فالِ نیک ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: "تُؤْتِیْ اُکُلَهَا کُلَّ حِیْنٍ بِّاِذْنِ رَبِّهَا" ورنہ آدمی یہ کہتا کہ زمانہ گزر گیا، اب یہ بیسویں صدی ہے، دنیا نے کتنی ترقی کر لی ہے، سائنس، پالیٹکس، ٹکنالوجی کی ترقی کہاں سے کہاں تک پہنچی، ذہن و فکر کا معیار بدل گیا ہے، اب وہ زمانہ نہیں رہا، اب اس وقت اسلام کی دعوت کوئی اثر نہیں کرے

گی، تو قرآن نے "تُؤْتِیْ اُکُلَهَا کُلَّ حِیْنٍ بِّاِذْنِ رَبِّهَا" کہہ کر تسلّی دی ہے اور تقویت کا سامان کیا ہے کہ کسی زمانہ کے، کسی جگہ کے لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ہمارے اسلام کی دعوت دینے کا کیا فائدہ؟ قرآن نے "کُلَّ حِیْنٍ" کہہ کر زمانہ کی تحدید کو ختم کر دیا۔

لیکن یہ سب اللہ کے ارادہ اور قدرت سے ہوگا اس نے "باذن ربها" کہہ کر یہ بتادیا کہ اپنی ذہانت پر، اپنی زبان کی مہارت پر اعتماد نہ کرو، بلکہ یہ بھی سمجھو کہ اللہ ہی اگر چاہے گا تو اثر ہوگا، اس کے اندر دعوت کا پورا نقشہ آگیا ہے۔(۱)

(۱) "دین حق و دعوت اسلام ایک فلک بوس عمارت اور سدا بہار درخت" مطبوعہ تقریر سے تلخیص کی گئی ہے۔

دعوت اور حکمتِ دعوت

اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ أَحْسَنُ.اِنَّ رَبَّکَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ.

(النحل۔۱۲۵)

آپ اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بلایئے حکمت سے اور اچھی نصیحت سے اور ان کے ساتھ بحث کیجئے پسندیدہ طریقہ سے، بیشک آپ کا پروردگار (ہی) خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہی ہدایت پائے ہوؤں کو (بھی) خوب جانتا ہے۔

اللہ رب العزت کا یہ خطاب اپنے آخری نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے آخری امت کے لئے ہے، کیونکہ اس امت کے بعد کوئی اور امت نہیں، یہ سورہ نحل کے آخری رکوع کی آیت ہے، جس میں دعوت وارشاد کے طریقہ کو بیان کیا گیا ہے، فرمان الٰہی ہے:

اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ.

آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم و حکمت اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ بلایئے۔

آیت دعوت کا اختصار و اعجاز اس کی وسعت اور گیرائی

قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے دعوت کے طریق کار کے حدود مقرر نہیں کئے اور یہ کام داعی کی قوت تمیز اور عقل سلیم پر چھوڑ دیا ہے، اس بات کا فیصلہ کہ کب اور کس وقت کون سا طریق کار اختیار کیا جائے اس کی طرف خود داعی کا ذوق اور عقیدہ رہنمائی کرے گا، اور اس کی دینی فکر جو اس کے احساسات و اعصاب پر حکمراں ہے وہ خود طریق کار کا انتخاب کرلے گی، قرآن کریم نے صرف ایک وسیع حصار قائم کردیا ہے، جس کے اندر دعوت دین کی پوری روح (اسپرٹ) سماگئی ہے۔

اس آیت کریمہ کی رو سے دونوں باتیں پوری طرح عیاں ہیں، ایک داعی الی اللہ کو کتنی آزادی ہے اور کس درجہ پابندی ہے، کہاں تک وہ جا سکتا ہے، اور کس حد سے آگے قدم بڑھانا ممنوع ہے، جہاں تک دعوت کی وسعت اور داعی کی آزادی کا تعلق ہے، وہ اس تعبیر سے واضح ہے کہ "ادع الی سبیل ربك" (بلاؤ اپنے رب کی راہ کی طرف) اس آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ ایمان کی طرف دعوت دو، یا صحیح اور سچے عقیدہ کی طرف بلاؤ، یا نماز قائم کرنے کی دعوت دو یا اخلاق حسنہ اختیار کرنے کی ترغیب دو، انسانیت کے احترام کی تلقین کرو، یہ سب نہیں کہا گیا مگر یہ تمام باتیں "سبیل ربك" میں سمٹ آئی ہیں، اس لفظ نے فکر و عمل کے آفاق کھول دیئے ہیں، یہ آفاق بھی محدود نہیں ہیں، اس میں دوسرے ادیان سماوی، بشری ضروریات، انسانی زندگی میں پیش آنے والی حاجتیں سب داخل ہیں "ادع" (بلاؤ) کا لفظ بھی کس درجہ وسیع معانی پر حاوی ہے، اس میں نہ اس کی قید ہے کہ وعظ و تقریر کے ذریعے بلاؤ، نہ

یہ کہ تحریر کے ذریعے دعوت دو، نہ یہ کہ وعظ و تلقین ہی کا ذریعہ اختیار کرو، یہ لفظ "اُدْعُ" تمام معانی اپنے جلو میں رکھتا ہے، اور حسب موقع داعی، دعوت کا فرض کبھی پند و نصائح سے کبھی وعظ و تقریر سے اور کبھی تحریر اور دوسرے ذرائع ابلاغ سے ادا کر سکتا ہے، اور بلانے کا ہر وہ وسیلہ اختیار کر سکتا ہے، جو مشروع ہو، موثر اور نافع ہو، پھر فرمایا "سَبِیْلِ رَبِّكَ" اپنے رب کے رستے (کی طرف) - اس کے علاوہ کوئی تعبیر ممکن نہیں جس میں اتنی جامعیت اور وسعت، گہرائی اور گیرائی بیک وقت موجود ہو۔

حکمت و موعظت حسنہ کا مفہوم

"حکمت کا لفظ بہت ہی بلیغ اور بڑی وسعتوں کا حامل ہے، دوسری زبان میں اس کا ترجمہ آسان نہیں ہے، اسی طرح "موعظت" بھی وسیع معانی پر حاوی لفظ ہے "حسنہ" کا لفظ بھی لامحدود معانی پر مشتمل ہے، قرآن نے اس آیت میں آزادی بھی دی ہے اور حد بندی بھی کی ہے، ایجاز و اختصار بھی ہے، اور بیان و شرح بھی۔

اُدْعُ اِلٰیٰ سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ	اے پیغمبر! اپنے پروردگار کے رستے کی طرف دانش اور نیک نصیحت سے بلاؤ۔

حکمت سے مراد ہے عقل، دانائی، سلیقہ، حسن تدبیر، سچی اور صحیح بات کو واضح کر کے دل میں اتارنے کا طریقہ، اس طرح کہ مداہنت یا موقعہ پرستی کا شائبہ نہ ہونے پائے، سیاست کا اس میں دخل نہ ہو، سیاست الگ چیز ہے، اور حکمت و موعظت الگ ہے۔

اپنے عہد میں خدا کے محبوب ترین بندے موسیٰ علیہ السلام کو اُس عہد کے خدا کے مغضوب ترین بندے ظالم و جفاکار فرعون کے پاس جانے اور دعوت دینے کا حکم

ملتا ہے، لیکن سلیقہ اور نرمی سے بات کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى. (طٰہٰ۔ ۴۳) دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت نکل چکا ہے۔

اس سرکش اور طاغی کے ساتھ بھی دعوت کا کیا طریقہ اختیار کرنا ہے؟

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا. (طٰہٰ۔ ۴۴) پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا۔

بات پکی اور سچی ہو، مگر انداز تکلّم سلیقہ، نرمی، خوش آہنگی کا ہو:۔

لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْيَخْشٰى. (طٰہٰ۔ ۴۴) شاید وہ (برغبت) نصیحت قبول کر لے یا (عذاب الٰہی سے) ڈر جائے۔

تاکہ وہ نصیحت پکڑے، یا سلیقہ کی بات سن کر اس کے دل میں خشیت و خوف پیدا ہو جائے، اور اپنے کفر و طغیان، اور شر و ظلم سے باز آئے، اگر بھلی بات کے کہنے کا انداز بری طرح ہو تو وہ کار آمد ثابت نہیں ہوتا شاعر نے سچ کہا ہے۔ ع

کہتے ہیں وہ بھلے کی و لیکن بُری طرح

بھلی بات کو بھلی طرح کہنا ہی حسن سلیقہ اور حکمت ہے، اگر مخاطب سے سوال وجواب بھی کرنا پڑے تو اس میں بھی سلیقہ ہونا چاہئے، مناظرہ اور مجادلہ کے موقعہ پر بھی اس کی ہدایت ہوئی:

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ. اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے۔

تاکہ سننے والے اور دیکھنے والے داعی کے طریقۂ استدلال سے متاثر ہوں، چاہے مخاطب پر اثر نہ ہو، اگر طریقۂ بحث و مجادلہ احسن طریقہ پر ہوگا تو مخاطب عقل سلیم اور نیک فطرت کی بنا پر خود متاثر ہوگا، اگر ایسا نہ ہوا تو بھی حاضرین و سامعین پر

حسنِ مجادلہ کا ضرور اثر پڑے گا، یہی حقیقت آیت:-

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتاً لِلّٰهِ حَنِيْفا. وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. (النحل۔۱۲۰)

بیشک ابراہیم بڑے مقتدا تھے اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار تھے بالکل ایک طرف کے ہو رہے تھے اور وہ شرک کرنے والوں میں نہ تھے۔

سے بھی واضح ہوتی ہے، ان کو اس طریقۂ استدلال، سلیقہ، حکمت و موعظت، اور احسنِ مجادلہ کے باوجود:-

حَنِيْفاً مُسْلِماً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. (آل عمران۔۶۷)

طریق مستقیم والے (یعنی) صاحبِ اسلام تھے اور مشرکین میں سے (بھی) نہ تھے۔

کا خطاب عطا فرمایا گیا، اس لئے کہ ان کی دعوت میں حکمت تھی، مداہنت نہ تھی، لینت تھی، سیاست نہ تھی، لہٰذا ایک مومن مسلمان کو بھی یہ طرز تبلیغ اختیار کرنا لازم ہے، عقائد کی اصلاح کے لئے بھی "ادع الیٰ سبیل ربك بالحكمة" کا طریق کار ہی مفید ہے، بات کتنی ہی ضروری اور لازمی ہو، داعی کے سامنے مقصد یہ ہونا چاہئے کہ مریض کا علاج کرنا ہے، اس میں پیار، نرمی، اور محبت ہو، سختی، درشتی، تیزی و تندی کی وجہ سے مریض تجربہ کار مشہور ڈاکٹر اور حکیم کے پاس جانے سے بھی ڈرتا ہے، علاج معالجہ کی بات ہی الگ ہے۔ امت کو پیغام ملتا ہے:-

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ. (التوبہ۔۱۲۸)

(اے لوگو) تمھارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمھاری جنس (بشر) سے ہیں جن کو تمھاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے جو تمھارے منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں (یہ حالت تو سب کے ساتھ ہے بالخصوص) ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں۔

اس پر عمل کرنا آپ ﷺ کے ایک امتی پر بھی لازم ہے، وہ دوسرے انسان کو حکمت عملی اور محبت اور پیار سے دعوت دے کر، سلیقہ سے سمجھا کر عقائد کی اصلاح کے لئے مائل و راغب کرے۔(۱)

(۱) تحفہ کشمیر از ص ۶۴ تا ص ۶۷

(۲) تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب از ص ۲۱ تا ۲۴ سے مشترک ماخوذ ہے۔

امت اسلامیہ کا مقام اور اس کی دعوت

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

(اے پیروان دعوتِ ایمانی)! تم تمام امتوں میں "بہتر امت" ہو جو لوگوں (کی ارشاد و اصلاح) کے لئے ظہور میں آئی ہے، تم نیکی کا حکم دینے والے، بُرائی سے روکنے والے اور اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے ہو۔ (آل عمران۔ ۱۱۰)

امتِ اسلامیہ آخری دینی پیغام کی حامل ہے۔ اور یہ پیغام اس کے تمام اعمال اور حرکات و سکنات پر حاوی ہے۔ اس کا منصب قیادت و رہنمائی اور دنیا کی نگرانی و احتساب کا منصب ہے، قرآن مجید نے بہت قوت اور صراحت کے ساتھ اعلان کیا ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ. تم تمام امتوں میں سب سے بہتر امت ہو۔

"أخرجت للناس" کا لفظ بتاتا ہے کہ یہ امت کوئی سبزۂ خود رو نہیں، جیسے جنگل کی گھاس ہوتی ہے، یا جنگلی درخت ہوتے ہیں کہ اگ آئے، نہیں بلکہ "اخرجت للناس" مجہول کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اور اس کی نسبت اللہ تبارک و

تعالیٰ کی طرف ہے، "خروج" اور "اخراج" میں فرق ہے، خروج اپنا ذاتی فعل ہے۔ انفرادی فعل ہے۔ اور "اخراج" کسی دوسری طاقتِ بالا اور ہستی کا فعل ہے۔ یعنی یہ امت کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ انسانیت کی حفاظت اور فاطرِ کائنات کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے وجود میں لائی گئی ہے۔

چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کو نبوت و رسالت کو رسول اللہ ﷺ پر ختم کرنا تھا، اور قیامت تک کے لئے آپؐ کے دین کو قائم رکھنا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی گاڑی چلانے کے لئے اور اس کے چلتے رہنے کے لئے یہ انتظام کیا کہ آپؐ کے ساتھ ایک پوری امت کی بعثت فرمائی، صحابہؓ کرام رضی اللہ عنہم اس حقیقت کو جانتے تھے اور اپنے لئے اسی قسم کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ جب رستم نے حضرت ربعی ابن عامرؓ سے پوچھا کہ "مالذی جاء بکم" (تمھیں کون سی چیز یہاں لائی) تم اپنے صحرا سے نکل کر یہاں کیوں آئے، اس کا محرک کیا ہے؟ تو انھوں نے کہا "اللہ ابتعثنا" اللہ نے ہم کو بھیجا ہے۔ تاکہ ہم لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی غلامی اور اللہ کی بندگی میں داخل کریں اور دنیا کی تنگی سے ان کو نکال کر کونین کی بے کراں وسعتوں سے آشنا کریں اور مذاہب کی ناانصافی سے نکال کر اسلام کے انصاف کے مزہ سے آشنا کرائیں، اسی لئے انھوں نے اس موقع پر "ابتعثنا" کا لفظ استعمال کیا۔

"تَامُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" تم اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو، اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو۔ یہ امتِ محمدیؐ کی بعثت کا مقصد بتایا گیا ہے

کہ وہ دنیا میں (بھلائی کی تلقین (امر بالمعروف) اور بُرائی کی ممانعت (نہی عن المنکر) کرتی رہے۔

"امر بالمعروف، نهي عن المنكر" دین کا زبردست رکن اور عالمگیر شعبہ ہے جس سے دنیا کی تمام چیزیں وابستہ ہیں، اس لئے یہ شعبہ خاص طور پر اس امتِ محمدیہ کے لئے الاٹ کیا گیا ہے۔ امت محمدیہؐ کی فضیلت و برتری کی علت ڈھونڈی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کے ذریعہ ایک اعلیٰ اور برتر کام لیا گیا ہے، جس کی وجہ سے "خير الأمم" کا معزز خطاب اس کو عطا کیا گیا۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی خصوصیت ہے کہ اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت منفرد ہوئی تھی، ان کی ذات کی بعثت ہوتی تھی، لیکن آپؐ کی بعثت کی خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ کے ساتھ ایک "امت" بھی مبعوث کی گئی، اور اس امت کو دنیا میں وہ ضرورت پوری کرنا ہے جو کہ انبیاء و مرسلین کرتے تھے، حالانکہ یہ امت خود نبی نہیں ہے۔

اس کو یوں سمجھئے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ یہ کہ آپؐ کی بعثت کے ساتھ آپؐ کی امت بھی دعوت کے کام کو جاری رکھنے اور آگے بڑھانے کے لئے مبعوث کی گئی ہے، لیکن یہ بعثت نبی والی بعثت نہیں ہے۔ "نبوت" اور "بعثت" الگ الگ دو لفظ ہیں، نبوت کا لفظ صرف اس برگزیدہ انسان کے لئے آتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پیغمبری کے لئے منتخب فرمایا ہو، اور "بعثت" کا لفظ قوم کے لئے بھی آسکتا ہے، حضور ﷺ نے یہ لفظ اپنی امت کے لئے بھی استعمال فرمایا ہے کہ "انما بعثتم

میسرین ولم تبعثو معسرین" اس میں "بعثت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، کہ تم بھیجے گئے ہو، تمھیں مقرر کیا گیا ہے، تمھیں نامزد اور نصب کیا گیا ہے، تمھاری ایک حیثیت متعین کی گئی ہے، اور تمھاری ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ اور "میسرین" سہولت پیدا کرنے والے کی حیثیت سے، "معسرین" مشکلات پیدا کرنے والے کی حیثیت سے نہیں۔

تو معلوم ہوا کہ یہ امت زندگی کا ایک خاص متعین مقصد رکھتی ہے، دنیا کے لئے اس کے پاس ایک مکمل دعوت ہے اس کی تہذیب و ثقافت، اس کی جدوجہد اور عمل اور اس کی ہر قسم کی سرگرمی اور نشاط، اس کے عقیدہ، مقاصد اور پیغام کی تابع ہے، اور "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" اس امت کا خاص فریضہ اور اس کا مقصد آفرینش ہے۔(۱)

(۱) (۱) تحفۂ پاکستان صفحہ ۱۹۔ (۲) اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش صفحہ ۲۷۸ تا صفحہ ۲۹۰۔
(۳) اسلام کے قلعے صفحہ ۱۱۔ (۴) الفرقان اشاعت خاص ربیعین ۱۳۷۱ھ صفحہ ۹۹۔
(۵) حدیث پاکستان صفحہ ۲۷۔ (۶) تحفۂ انسانیت صفحہ ۲۰۔ سے مشترک طور پر اخذ کیا گیا۔

أمر بالمعروف و نهی عن المنکر

ھی

انسانیت کو تباہی سے بچا سکتا ہے

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ.

تم امتوں میں بہتر امت ہو جو لوگوں (کی ارشاد و اصلاح) کے لئے ظہور میں آئی ہے، تم نیکی کا حکم دینے والے، بُرائی سے روکنے والے
اور اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے ہو۔ (آل عمران۔ ۱۱۰)

عالمگیر شعبہ اور امت محمدیہ

امر بالمعروف -یہ شعبہ عالمگیر ہے اس لئے خاص طور پر اس کو امتِ محمدیہ کے لئے الاٹ کیا گیا ہے، امتِ محمدیہ کی فضیلت و برتری کی علت ڈھونڈی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کے ذمہ ایک اعلیٰ اور برتر کام سپرد کیا گیا ہے جس کی وجہ سے خیر الامم کا معزز خطاب اس کو عطا کیا گیا ہے، دین کی تبلیغ کا کام یہ ایک ایسا شعبہ ہے جس کو خدا نے اس امت کے سپرد کیا ہے اور خدمتِ خلق کا جذبہ امت کو

دوزخ سے بچانے کا نام ہے اور اس کا نشیمن اس کی دعوت کی شاخ پر ہے، درحقیقت دنیا کی پیدائش کا اصلی مقصد خداوند قدوس کی ذات و صفات کی معرفت کا ہے اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک بنی نوع انسان کو برائیوں اور گندگیوں سے پاک کرکے بھلائیوں اور خوبیوں کے ساتھ آراستہ نہ کیا جائے، اس لئے فرمادیا گیا کہ فلاح و بہبود انھیں لوگوں کے لئے ہے جو اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔

بعثت محمدیؐ کا مقصد

اس امت کی بعثت آپ کی بعثت کا پھیلاؤ ہے اس لئے دین کی اشاعت کی ذمہ داری و باگ ڈور امت کے ہاتھ میں دے دی ہے اس کے کرنے میں کامیابی ہے اور نہ کرنے میں دو نقصان ہیں۔ (۱) اپنے کو نااہل قرار دینا ہے یا یوں کہئے کہ اپنے سر بہت بڑا الزام قائم کرلینا ہے۔ خدا نے انسان کو جس کام کے لئے پیدا کیا ہے اس کو انجام نہ دے، ہزار کام کرے تو بے کار ہے، بلبل کی سریلی دل آویز آواز ہے، اگر وہ بولے نہیں تو کوا بہتر ہے، طاؤس رقص نہ کرے تو اس سے ہنس اچھا ہے، نمک کے اندر نمکین پن نہ ہو اس کی جگہ یاقوت و جواہرات ہوں تو بے کار ہے جو چیز جس کام کے لئے بنائی گئی ہے وہی کام انجام نہ دے تو کیا فائدہ؟

جاں بلب دنیا اور حیات بخش پیغام

بھٹکی ہوئی اور ٹھوکر کھائی ہوئی انسانیت جو آج گہرے غار میں گرنے کے لئے تڑپ رہی ہے، اس کو کون بچائے گا؟ ایک انسانیت کیا بیمار ہے بلکہ سب بیمار ہیں، اخلاق بیمار، معاشرت بیمار، روح بیمار، عقیدہ بیمار، ایمان بیمار، ساری انسانیت بیمار ہے اس کا علاج کون کرے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ تعلق مع اللہ اور دعوتِ الی اللہ کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ ع

"وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے"

امت محمدیہ جب اس کام کو چھوڑ دے گی تو سخت مصائب و آلام اور ذلت خواری میں مبتلا کر دی جائے گی اور ہر قسم کی غیبی نصرت و مدد سے محروم ہو جائے گی، اور یہ سب کچھ اس لئے ہو گا کہ اس نے اپنے فرضِ منصبی کو نہیں پہچانا اور اس کی قدر نہ کی اور جس کام کے انجام دہی کی ذمہ داری تھی اس سے غافل رہی اور اس کو بھلائے رکھنے سے سستی و کاہلی عام ہو جائے گی، گمراہی و ضلالت کی شاہراہیں کھل جائیں گی، آپس میں پھوٹ پڑ جائے گی، آبادیاں ویران ہو جائیں گی۔ مخلوق تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اور یہ سب کچھ ہو رہا ہے (لیکن) اس تباہی و بربادی کی خبر اس وقت ہو گی جب میدانِ حشر میں خدا کے سامنے باز پرس کے لئے بلایا جائے گا۔

مسیحا خود بیمار ہے

"امر بالمعروف و نہی عن المنکر" دین کا زبردست رکن ہے جس سے دین کی

تمام چیزیں وابستہ ہیں۔ اس سے ہمارے لئے یہ بات صاف واضح ہو گئی کہ ہمارا اصل مرض روح اسلامی سے بیزاری ہے جو در حقیقت ایمان کا ضعف ہے، ہمارے اسلامی جذبات فنا ہو چکے، ہماری ایمانی قوت زائل ہو چکی- اور کمزوری کا سبب اصل شئے کو چھوڑ دینا ہے جس پر تمام دین کی بقا اور دار و مدار ہے اور وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اس کام کو چھوڑنے کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ انسانیت سسک رہی ہے اور سب کام ہو رہے ہیں۔ صرف دعوت کا کام نہیں ہو رہا ہے، کیونکہ یہ محاذ جن سپاہیوں کو الاٹ کیا گیا تھا وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئے، اس لئے آپ بھی اس منصب سے محروم اور اس سے ملنے والی اشیاء سے بھی محروم ہو گئے۔

دعوت و اصلاح کا کام

شریعت اسلامی نے اجتماعی زندگی اور اجتماعی اصلاح اور اجتماعی ترقی کو اصل بتایا ہے، اور امتِ مسلمہ کو ایک جسم قرار دیا ہے کہ اگر ایک عضو میں درد ہو جائے تو تمام جسم بے چین ہو جاتا ہے اس وجہ سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ایمان کا خاصہ اور لازمی جزء قرار دیا ہے تاکہ اس کی انجام دہی کے لئے اپنے اندر خوبی و کمال پیدا کریں- ظاہر ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک افراد خوبیوں اور کمالات کے زیور سے آراستہ نہ ہوں، اب ہمارے اوپر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ فریضۂ تبلیغ کو اس طرح لے کر کھڑے ہوں جس سے ہم میں قوت بڑھے اور اسلامی فتوحات ابھریں، ہم خدا اور رسولؐ کو پہچانیں اور احکام خداوندی کے سامنے سرنگوں ہو جائیں، کیونکہ یہ کام خدا کی ایک اہم عبادت اور سعادتِ عظمیٰ ہے اور انبیاء علیہم السلام کی امانت ہے، اس کام کا مقصد دوسروں کی ہدایت

نہیں بلکہ اس سے خود اپنی اصلاح اور عبدیت کا اظہار مقصود ہے، اگر ہم اس کو صحیح طور پر انجام دیں گے تو عزت و آبرو اور اطمینان و سکون کی زندگی پالیں گے۔(۱)

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ-۱۰ر جولائی ۱۹۹۰ء

باب ۳

ایمان و استقامت

☆ جب حالات ساز گار ہوں اور ہوا موافق چل رہی ہو۔

☆ جب کسی مسلک پر قائم رہنے پر انعام ملتا ہوں اور پھول برسائے جاتے ہوں۔

☆ جب کسی قوم و جماعت کا ستارۂ اقبال بلند ہو اور اس کا بخت یاور۔

☆ جب کسی جماعت میں شرکت باعثِ اعزاز اور سرمایۂ افتخار ہو۔

تو اس وقت اس مسلک پر قائم رہنا اور اس عقیدہ کا اظہار کرنا کوئی مردانگی نہیں!

لیکن!

☆ جب حالات ناساز گار ہوں اور بادِ مخالف تیز و تند چل رہی ہو۔

☆ جب بڑے بڑے جوانمردوں کے قدم اکھڑ رہے ہوں۔

☆ جب کسی اصول اور عقیدے کو اختیار کرنا، دار و رسن کو دعوت دینے کے مترادف ہو

☆ جب کسی قوم کے تنزل کا زمانہ ہو، اقبال نے اس سے منہ موڑ لیا ہو اور زمانہ کی نگاہیں اس سے پھری ہوئی ہوں۔

اُس وقت!

اس مسلک پر ثبات و استقامت اور اس جماعت سے انتساب و نسبت بڑے شیر مردوں کا کام اور بڑی وفاداری اور نمک حلالی کی بات ہے۔

لیکن اسلام پر قائم رہنا، اس سے اپنی نسبت اور علانیہ اس کے شعائر کا اظہار اس وقت بھی سعادت و فخر کی بات ہے اور اس میں اس وقت بھی مزہ ہے جب حالات اس کے لئے ساز گار ہوں اور جب مسلمانوں کی کامیابی کا دور اور دنیا میں اسلام کا دور دورہ ہو اور کسی معاملہ میں ان کو ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑتا ہو۔ لیکن آزمائش و امتحان کے موقعہ پر وفاداری اور جاں نثاری میں جو لذت ہے وہ لذت کسی چیز میں نہیں!

یہ وہ وقت ہے جب حق پر قائم رہنے والوں، حق و صداقت کی تبلیغ کرنے والوں، اور اپنے عقیدے و ضمیر کے خاطر مفادات اور اعزازات کی قربانی کرنے والوں کو اس دنیا ہی میں جنت کا مزہ آنے لگتا ہے اور ان کے بدن کے روئیں روئیں سے خدا کی حمد و شکر کا ترانہ بلند ہوتا ہے"۔

ماخوذ از "دو انسانی چہرے قرآنی مرقع میں" صفحہ ۲۴۔۲۸۔۲۹۔

قصہ سات جواں مردوں کا

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى. وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖ اِلٰهاً لَّقَدْ قُلْنَا اِذاً شَطَطاً.

(سورہ کہف۔ ۱۳۔ ۱۴)

میں نے آپ کے سامنے سورۂ کہف کی ایک آیت پڑھی ہے، اس کا عنوان اگر اس زمانہ کے اسلوب اور اسٹائل میں مقرر کروں تو کہوں گا "قصہ سات جواں مردوں کا"(۱)۔

نوجوان عنصر کیلئے خصوصی پیغام

اس قصہ میں نسل انسانی کے نوجوان عنصر کے لئے خصوصی پیغام اور ایک اعلیٰ نمونہ ہے، جو ہر زمانہ میں کام دے سکتا ہے، اور جو صرف دماغ و دل پر نہیں، بلکہ صلاحیتوں، حوصلوں اور عزائم پر بھی ایک تازیانہ کا کام دے سکتا ہے، وہ کبھی شبنم

(۱) قرآن مجید میں آتا ہے کہ کسی نے کہا چار تھے، پانچواں ان کا کتا تھا، کسی نے کہا چھ تھے، ساتواں ان کا کتا تھا، کسی نے کہا سات تھے، آٹھواں ان کا کتا تھا، اس کے بعد قرآن مجید نے آگے کوئی ہندسہ نہیں بتایا، مفسرین اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ وہ تعداد میں سات ہی تھے۔

ٹپکاتا ہے، کبھی پھول کی جھڑیاں لگاتا ہے، مجھے بھی آج نوجوانوں کے سامنے نوجوانوں کا قصہ سنانا ہے، اور میں کیا سناؤں گا، قرآن مجید سناتا ہے، یہ وہ نوجوان ہیں جن کو قرآن نے ان کا تذکرہ کر کے لافانی بنادیا ہے، اور ہر دور کے نوجوانوں کے لئے قابل تقلید نمونہ اور آئیڈیل، بات بڑی مختصر، بڑی سادہ، لیکن بڑی عمیق اور سبق آموز ہے۔

قصہ یہ ہے کہ رومن امپائر کے ایک حصہ میں جو شام و فلسطین کہلاتا ہے، ایک دعوت پیدا ہوئی، جس کے لانے والے سیدنا مسیح علیہ الصلاۃ والسلام تھے، جو ہم مسلمانوں کے نزدیک بھی خدا کے پیغمبر برحق ہیں، انھوں نے توحید کی دعوت دی، اس وقت ساری دنیا میں شرک پھیلا ہوا، اور ہر طرف گھٹاٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی، اس اندھیرے میں ایک روشنی چمکی، حضرت عیسیٰؑ نے شرک، نسل پرستی، رسم پرستی، توہم پرستی، ظاہر پرستی، اور انسانیت کے استحصال کے خلاف ایک آواز بلند کی، جس کی اصل اساس توحید، اور سچی خدا پرستی تھی، اس دعوت کو کچھ لوگوں نے تسلیم کیا اور وہ اس کے حامل و داعی بن گئے، انھوں نے اپنے اس قلمرو سے باہر قدم نکالا، اور رومی شہنشاہیت کے مرکز کے قریب جاکر دعوت پیش کی، اکثر دیکھا گیا ہے، کہ سن رسیدہ اور پختہ کار لوگوں کے مقابلہ میں (جن کے پاؤں میں تجربات، مفادات، رسم و رواج، اور خوف و امید کی بھاری بیڑیاں پڑی ہوتی ہیں، اور ان کو کسی نئے تجربے اور انقلابی اقدام سے باز رکھتی ہیں) نوخیز اور جواں سال (جن کے پاؤں میں یہ بیڑیاں نہیں ہوتیں) اور ان کی وابستگیاں، اور ان کا (Attachment) ان چیزوں کے ساتھ نہیں ہوتا، جن کے ساتھ عموماً بڑی

عمر والوں کا ہوا کرتا ہے، نئی اور صالح دعوت کو جلد قبول کر لیتے ہیں۔ قرآن مجید ان نوجوانوں کی عمر کا تعین نہیں کرتا، اور یہی قرآن مجید کا طریقہ ہے، اگر وہ کہتا کہ ۱۸۔۲۰ سال کے نوجوان تھے، تو اس سے اوپر اور اس سے نیچے کی عمر والوں کو بہانہ مل جاتا کہ ہمارا قصہ نہیں ہے، قرآن کہتا ہے "اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ" وہ چند نوجوان تھے۔ جو حضرات عربی کا ذوق رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ "فتیة" کے لفظ میں عمر کی جوانی کے ساتھ دل و دماغ، اور حوصلوں اور عزم و ارادہ کی جوانی کی طرف بھی اشارہ آگیا ہے، اس لئے اس کے ترجمہ میں میں نے "جواں مرد" کا لفظ اختیار کیا، "فتیة" "فتی" کی جمع ہے "فتی" کی جمع "فتیان" بھی آتی ہے، لیکن "فتیة" جمع قلت کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس طرح قرآن اشارہ دیتا ہے کہ وہ گنتی کے چند نوجوان تھے، اور یہی ہمیشہ ہوا ہے کہ جب خدا پرستی اور اصلاح حال کی صحیح دعوت آئی ہے تو اس کے ماننے والے ابتداء میں تھوڑے ہوئے ہیں، جن کو خدا نے اس کی توفیق دی اور ان کو یہ ہمت ہوئی۔

مسئلہ ربوبیت کا تھا

اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے اسمائے حسنیٰ اور صفات میں سے "رب" کا لفظ استعمال فرمایا ہے "اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ" یہ بات بہت معنیٰ خیز ہے، اس لئے کہ حکومتوں کو اپنے یہاں کے باشندوں کا رازق ہونے کا بھی (کبھی زبان قال سے اور کبھی زبان حال سے) دعویٰ ہوتا ہے، اور ان کے ساتھ اس طرح کے خیالات اور عقیدے وابستہ ہو جاتے ہیں کہ اگر اپنی پرورش کا سامان کرنا ہے، اور عزت و

راحت کی زندگی گزارنی ہے، تو ان حکومتوں سے اپنے کو متعلق کرنا پڑے گا، ان کا غاشیہ بردار ہو کر رہنا، اور ان کی رکاب میں چلنا پڑے گا، ان کی ہاں میں ہاں ملانا ہوگا، اس کے بغیر رزق اور خوش حال و فارغ البال زندگی کے دروازے یکسر بند ہیں، قرآن جو لفظ کہتا ہے، وہ اپنی جگہ پر انگوٹھی میں نگینہ کا کام دیتا ہے، پوری پوری کتابوں کا مضمون ایک لفظ میں آجاتا ہے، یہ جواں مرد انسانوں کے اس جنگل میں کھڑے ہوگئے، جہاں اس رومن امپائر کا جھنڈا لہرا رہا تھا، جو اس وقت دنیا کی سب سے منظّم، سب سے متمدن، دنیا کو اس وقت کا سب سے ترقی یافتہ قانون دینے والی، دنیا کے سب سے وسیع خطہ پر حکومت کرنے والی شہنشاہی تھی، انگریزی محاورہ کے مطابق اس حکومت کی ناک کے نیچے، اور بالکل آنکھوں کے سامنے چند نوجوان کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اس دعوت کو قبول کر کے اس کا اعلان کرتے ہیں، جو اس وقت کا صحیح مذہب، اور اس عہد کا اسلام تھا، اس وقت تک مسیحیت میں تحریف نہیں ہوئی تھی، اس کے وہ داعی وہاں پہونچے تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیغام کے صحیح علمبردار تھے، انھوں نے کہا کہ ہمارا رازق اور ہماری پرورش کی ذمہ دار حکومت نہیں ہے، ہمارا رازق اور پروردگار خدا ہے، اور وہی ہماری پرورش کا ذمہ دار ہے، "رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ" ہماری پرورش کرنے والا وہ ہے، جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے، یہ بات اس منظّم سلطنت میں کہی گئی تھی، جس نے وسائل معیشت پر قبضہ کر رکھا تھا، گویا وہاں کے باشندوں کی قسمت و روزی کی مالک بن گئی تھی، اور بظاہر نفع وضرر کی ساری طاقتیں اس کے ہاتھ میں آگئی تھیں، اس وقت دانشمندی اور حقیقت پسندی کا ایک ہی ثبوت تھا کہ حکومت کے دامن

سے وابستہ ہو کر حکومت کے عقیدے کو اختیار کر کے کم سے کم اس عقیدہ پر سکوت اختیار کر کے اس قلمرو میں اچھی زندگی گزاری جائے، انھوں نے پوری یونانی دیومالا (Greek- -Mythology) اور رومی دیومالا (Roman Mythology) کا انکار کیا، جو اس وقت کی رومی تہذیب، تمدن و معاشرت، اور عقائد و اعمال میں سرایت کر چکی تھی، اور پورا معاشرہ مشرک، اور توہم پرست بن گیا تھا، یونان اور رومہ (اور قدیم ہندوستان میں بھی) صفاتِ الٰہی کا تصور دیوتاؤں کی شکل میں کیا جاتا تھا، اور ان کے نام پر بڑے بڑے معبد اور ہیکل بنے ہوئے تھے، یہ محبت کا دیوتا ہے، یہ شفقت کا، یہ روزی دینے والا، یہ جنگ کا، یہ ہیبت و جلال کا، یہ بارش کا۔ ان نوجوانوں نے بیک زبان ان سب کا انکار کیا اور کہا:-

رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا. هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً. لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ. فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا.

ہمارا پروردگار آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، ہم اس کے سوا کسی کو معبود سمجھ کر نہیں پکاریں گے (اگر ایسا کیا) تو اس وقت ہم نے بعید از عقل بات کہی، ہماری قوم کے ان لوگوں نے اس کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں، یہ (ان کے خدا ہونے پر) کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لائے۔

آپ کا رب آپ سے مخاطب ہے

یہاں قرآن مجید نے ایک اور حقیقت بیان کر دی وہ یہ کہ پہلا قدم آدمی کی طرف سے اٹھتا ہے، پہلے ہمت اس کی طرف سے ہونی چاہئے، اس کے بعد اللہ کی طرف سے مدد،......جب انھوں نے یہ منزل طے کر لی تو "زدناھم ھدیٰ" ہم نے

ان کی ہدایت میں اضافہ کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس کی معرفت ہے، ہدایت وہاں سے ملتی ہے، اپنی دماغی صلاحیت، اپنی ذہانت سے، تحریروں سے، محض مطالعہ سے، کتب خانہ کے علمی ذخیرہ سے نہیں ملا کرتی، ہدایت کی نسبت اپنی طرف کی ہے، اور بادشاہوں کے اندازِ خطاب کی طرح جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے، "زدناھم ھدیٰ" ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا تو وہ کہیں سے کہیں پہونچ گئے، اللہ کے سامنے سر جھکایا، اس سے مانگنا شروع کیا، اس کی معرفت پر محنت کی، اس کی صفاتِ عالیہ اور اسمائے حسنیٰ کی معرفت و فہم حاصل کرنے میں انھوں نے غور و فکر سے کام لیا تو ہم نے ان کی ہدایت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

(ہدایت میں اضافہ کیا) اگر آدمی اس کا منتظر رہے کہ کوئی چیز خود بخود دل میں نفوذ کر جائے یا اس کے گلے منڈھ دی جائے تو یہ صحیح نہیں، پہلے خود فیصلہ اور ہمت کرنی ہوگی، اس کے بعد خدا کی مدد آتی ہے، فرماتا ہے "وربطنا علیٰ قلوبھم" (ہم نے ان کے دلوں کو سہارا دیا) اس لئے کہ ان کا واسطہ اس زمانہ کی سب سے عظیم اور قہرمان سلطنت سے تھا، وہ "سرکاری" مذہب کو چھوڑ کر نیا دین اختیار کر رہے تھے۔

نوجوانوں کا جذبۂ عمل

یہ اصحابِ کہف کا واقعہ ہے۔ مجھے شرق اردن کے سفر (۱۹۷۳ء) میں اس غار

کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، جہاں وہ محو خواب ہیں، اردن کے آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر محقق فاضل رفیق وفا الدجانی صاحب نے اس کی زیارت کرائی اور علمی و فنی دلائل سے ثابت کیا کہ یہی اصحاب کہف کی جگہ ہے(۱)۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس واقعہ کو صدیوں تک نظم کیا جاتا رہا ہے اور وہ وہاں کی ادبیات کا ایک جزء بنا رہا ہے۔ میں نے بہت تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب "معرکۂ ایمان و مادیت" میں تقابلی مطالعہ کی روشنی میں اس پر نظر ڈالی ہے، تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان نوجوانوں میں سے اکثر اہل دربار کی اولاد تھے، یعنی یہ سلطنت کے خاندانی نمک خوار تھے، کسی کے باپ، کسی کے چچا، کسی کے بڑے بھائی اس وقت رومن امپائر کے کسی بڑے عہدے پر فائز تھے، اس لئے یہ مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ اور نازک بن گیا کہ بات صرف اتنی نہ تھی کہ چند بے تعلق اور سر پھرے نوجوان کھڑے ہو گئے، انھوں نے بغاوت کا نعرہ لگایا، اور کہہ دیا کہ ہم سرکاری مذہب کو نہیں مانتے، ہم نے ایک نیا دین قبول کیا ہے...... یہ وہ لوگ تھے، جن کے ساتھ پورے پورے خاندان اور ان خاندانوں کی قسمت اور عزت وابستہ تھی، ان کے اس اقدام سے ان کے والدین، ان کے خاندان کے بزرگ اور ذمہ دار نازک پوزیشن میں مبتلا ہو گئے، ان سے براہ راست سوال کیا جا سکتا تھا کہ تم نے اپنے فرزندوں اور خوردوں کو اس باغیانہ اقدام سے کیوں نہیں روکا؟ دوسری طرف خود ان بزرگان خاندان کے لئے ایک بڑی آزمائش تھی کہ وہ ان نوجوانوں کے متکفل تھے، وہ ان سے بڑی امیدیں رکھتے تھے

---

(۱) ملاحظہ ہو ان کی کتاب "اکتشاف الکہف واصحاب الکہف" میں نے اپنی کتاب "معرکہ ایمان ومادیت" میں اس کی وہ جگہ متعین کی تھی جو اس وقت تک کے مطالعہ و تحقیق کا نتیجہ تھی، بعد میں میری رائے بدل گئی۔

اور ان کو ان کا مستقبل شاندار نظر آتا تھا، ایک جگہ قرآن مجید نے اس نفسیاتی کیفیت کو جو خاندان کے بزرگوں اور ذمہ داروں کو نوجوانوں کے اس طرح کے اقدام سے پیش آتی ہے، بڑے بلیغ انداز میں بیان فرمایا ہے، جب حضرت صالح علیہ السلام نے قوم ثمود میں توحید اور دین حق کی دعوت پیش کی، تو قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے بڑے درد اور دل کی چوٹ کے ساتھ کہا کہ صالح! تم سے تو آئندہ کے لئے بڑی امیدیں اور توقعات وابستہ تھیں، خیال تھا کہ تم سیدھے سیدھے اس لائن پر چل کر (جس پر قوم چل رہی ہے) اور اس میں کچھ امتیاز پیدا کر کے اپنے خاندان کا نام روشن کرو گے اور اپنی قوم کے لئے عزت و افتخار کا باعث بنو گے "قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَا" (صالح تم تو ہماری امیدوں کا مرکز تھے) تم نے ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا، تم یہ نئی دعوت لے کر کھڑے ہوگئے، اور پوری قوم کو مخالف بنا لیا "مرجو" کا تقریباً وہی مفہوم ہے جو انگریزی میں لفظ (Promising) کا ہے، جو کسی ایسے ہونہار طالب علم، یا نوجوان کے لئے بولا جاتا ہے جس کا مستقبل درخشاں نظر آتا ہے۔

یہ نوجوان گنتی میں بہت تھوڑے تھے، اور بعض قرائن و قیاسات کی بناء پر سات سے زیادہ ان کی تعداد نہیں تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ کئی سو آدمیوں کی قسمت وابستہ تھی، ہر ایک کے ساتھ پورا پورا خاندان اور برادری کا سلسلہ تھا اور وہ سب ان کے اس اقدام کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گئے تھے، اور شک کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے تھے، وہ کتنے خاندانوں کی امیدوں کا مرکز تھے اور کتنے گھروں کی ترقیاں و خوش حالیاں ان سے وابستہ تھیں؟ اس کی طرف لوگوں کی کم

نظر جاتی ہے بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ سات آٹھ کا معاملہ کیا؟ پکڑے گئے تو پکڑے گئے، اور مارے گئے تو مارے گئے! اگر زندگی کی آسائشوں سے محروم ہوئے تو سات ہی آدمی تو محروم ہوئے، یہ نہیں سوچتے کہ معاملہ کبھی ایک اکیلے آدمی کا نہیں ہوتا، متمدن زندگی میں فرد واحد (اکائی) کا تصور مشکل ہے، شعراء تو اس کا تصور کر سکتے ہیں لیکن واقعات کی دنیا میں اکثر فرد واحد کا وجود نہیں ہوتا، اس کے تعلقات و روابط کتنے لوگوں سے ہوتے ہیں، اس لئے فرد واحد نہیں ہوتا، اگر یہ سات بغاوت کرتے ہیں، تو سمجھئے کہ ستّر خاندان زد میں آجاتے ہیں، اس لئے مسئلہ بہت اہم تھا اور اسی لئے قرآن مجید نے اس کو بطور مثال پیش کیا ہے، اس وقت تاریخ کی کتابوں میں یہ تفصیل نہیں مل سکتی کہ کس کس طرح سے ان کو ڈرایا دھمکایا گیا اور کس کس طرح کی ان کو لالچیں دی گئیں اور سبز باغ دکھائے گئے، ایسے اقدامات سے روکنے کے لئے (خاص طور پر جبکہ مقابلہ میں نوخیز اور نوجوان ہوں) ترہیبات (ڈرانے والی چیزوں) کے ساتھ ترغیبات (راغب کرنے والی چیزیں) بھی ہوتی ہیں، اور اکثر ترہیبات کے مقابلہ میں ترغیبات زیادہ مؤثر اور کامیاب ثابت ہوتی ہیں۔ ایک بزرگ نے جن کا دونوں چیزوں سے واسطہ پڑا تھا، فرمایا کہ توڑے، کوڑوں سے زیادہ نازک ہوتے ہیں، طاقتیں اور حکومتیں کبھی کوڑے سامنے لاتی ہیں اور کبھی توڑے (اشرفیوں کی تھیلیاں)۔ ان نوجوانوں کے سامنے کوڑے بھی آئے ہوں گے اور توڑے بھی، انھوں نے کوڑوں کو بھی سہہ لیا اور توڑوں کا بھی توڑ کر لیا، اور یہ اس لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو قوت و سکون، اور صبر و تحمل، اور قربانی و ایثار کی دولت عطا فرمائی "وَرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ"۔

ہم نے ان کے دلوں کو تھام لیا

"وَرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ" ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا، ہم نے ان کے دلوں کو تھام لیا، باندھ دیا، اس لئے کہ جب کوئی چیز کھلی ہوتی ہے تو ہوا کے جھونکے سے اڑ جاتی ہے، کسی چیز سے بندھی ہو تو پھر وہ قائم رہتی ہے، تو ہم نے ان کے دلوں کو باندھ رکھا، وہ اِدھر اُدھر ہلنے جُلنے نہ پائیں "اِذْقَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" وہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا کہ ہمارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ کھڑے ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بیٹھے تھے اور کھڑے ہوگئے، بلکہ ان کے اندر ایک عزم پیدا ہو گیا، انھوں نے اعلان کیا کہ "ہمارا پروردگار وہ ہے جو آسمان وزمین کا پروردگار ہے"۔

"لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهِ اِلٰهاً لَقَدْ قُلْنَا اِذاً شَطَطاً" ہم اس کے سوا کسی الہ، کسی معبود کی پرستش نہیں کریں گے، اگر ہم نے اپنی زبان سے یہ بات نکالی تو بڑی بے جا بات ہوگی، بڑی خلاف واقعہ بات ہوگی "هٰؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهِ آلِهَةً" یہ ہماری قوم کے لوگ بڑے اچھے سنجیدہ لوگ معلوم ہوتے ہیں، بڑے باوقار لوگ ہیں، تجربہ کار ہیں، اس کے باوجود انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے معبود بنا رکھے ہیں، "لَوْلَا يَأْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ" اس پر کوئی دلیل کیوں نہیں لائے اور کون ہے اس شخص سے بڑا ظالم کہ جس نے اللہ پر جھوٹ گھڑا۔ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا"۔

تین باتیں

یہ میں نے آپ کے سامنے سورہ کہف کی آیتیں پڑھی ہیں، اس کی تشریح کی ہے، اس میں ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ پہلے ایمان مستحکم ہونا چاہئے، بہت بصیرت کے ساتھ، قوت کے ساتھ، ہمارا ایمان اللہ پر، اس کی صفات پر مستحکم ہونا چاہئے، اگر ہم طالب علم ہیں تو علمی انداز کے ساتھ، اور اگر ہم عوامی مسلمان ہیں تو بھی پوری صداقت کے ساتھ ہمارا ایمان خدا پر قائم ہونا چاہئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ "زِدْنَاهُمْ هُدىً" اس سرچشمۂ ہدایت سے ہمارا تعلق ہونا چاہئے جہاں سے ہدایت کا فیضان ہوتا ہے، کتاب و سنت کے مطالعہ، اسوۂ رسول اور صحابہ اور مجاہدین اسلام کے حالات سے ہمیں طاقت حاصل کرنا چاہئے، جس طرح کہ بیٹری چارج کی جاتی ہے۔ سیل (Cell) جب ختم ہو جاتے ہیں تو بدلے جاتے ہیں، ہم اور آپ اس مادّی دنیا میں چلتے پھرتے ہیں، ایسے اساتذہ سے بھی پڑھتے ہیں، جن کو خود بھی پورے طور پر ان دینی و غیبی حقائق پر یقین حاصل نہیں ہوتا، ہمارا دور ایسی چیزوں سے بھرا ہوا ہے کہ قدم قدم پر ہم کو خدا سے غافل کرنے والی چیزیں ملتی ہیں اور ہمیں ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہر چیز خود فراموشی اور خدا فراموشی پیدا کرنے والی ہے، ٹیلی ویژن کو دیکھئے، ریڈیو سنئے، اخبارات پڑھئے، حتیٰ کہ خالص ادب، جس کو پاک، معصوم اور غیر جانبدار ہونا چاہئے، وہ بھی غیر جانبدار نہیں رہا، وہ فسق کا ایجنٹ (Agent) بنا ہوا ہے اور بہت ہی سستا ایجنٹ باطل اقدار کا، ہمارا ادب اس وقت مشاطہ بنا ہوا ہے معصیت اور سفلی جذبات اور فحش اخلاق کا، یہ ساری چیزیں جو ہمارے چاروں طرف دریا کی طرح موجزن ہیں اور دریا میں ہم کو ڈال دیا گیا ہے، ہمارے حالات نے، ہمارے

نظام تعلیم نے، ہم کو اس دریا کے حوالہ کر دیا ہے، پھر اس کا کہنا یہ ہے کہ ع

"دامن تر مکن ہشیار باش"

خبردار بیٹا دامن تر نہ ہونے پائے، تو دامن بچانے کے لئے ضرورت ہے کہ "زدناھم ھدی" پر غور کریں، ایمان کا چراغ روشن کریں، اور حرارت و محبت پیدا کریں، جس کے بغیر ہم ان نفسانی خواہشات کا مقابلہ نہیں کر سکتے، ہم ان چیزوں کا مقابلہ خالی نظامِ جماعت اور ضابطۂ اخلاق سے نہیں کر سکتے، تجربہ کی بات بتاتا ہوں کہ زمانہ اتنا جابر واقع ہوا ہے، اس کے تقاضے اتنے قاہر ہیں کہ اگر ان کے مقابلہ میں ایمان کی طاقت نہ ہو اور وہ نمونے آپ کے سامنے نہ ہوں جو سیرت کے اندر ہم کو ملتے ہیں تو ہم زمانہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے(۱)۔

---

(۱) تحفہ دکن ص ۶۰ تا ص ۶۷۔

(۲) حدیث پاکستان ص ۱۲۰ تا ص ۱۲۶ سے مشترک ماخوذ ہے۔

ایمانی دعوت کا ابتدائی مرحلہ

وَاذْكُرُوْا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِيْ الْأَرْضِ تَخَافُوْنَ أَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰاكُمْ وَأَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ.

(سورہ الانفال: ٢٦)

یہ سورہ انفال کی آیت ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو خطاب کر کے فرماتا ہے "وَاذْكُرُوْا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِيْ الْأَرْضِ" یاد کرو جب تم تھوڑے تھے، برائے نام تھے، انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے، اور بہت کمزور سمجھے جا رہے تھے، جو کمزور کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے وہ تمھارے ساتھ کیا جاتا تھا، تم کو جو چاہتا تکلیف دیتا، اور جو چاہتا پریشان کرتا، اور تمام روئے زمین پر تم کو کمزور سمجھا جاتا تھا، "تَخَافُوْنَ أَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ" ہر وقت ڈرتے تھے کہ کوئی جھپٹا مار کے اچک نہ لے "فَاٰوٰاكُمْ" تو اللہ نے تم کو پناہ دی، "وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ" اور تمھاری مدد کی اپنی نصرت خاص سے، اور تمھاری حفاظت فرمائی اور دستگیری کی، "وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبٰتِ" اور تم کو عطا کیں بڑی بڑی نعمتیں، "لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" تاکہ تم شکر کرو۔

قرآن مجید کی اس آیت پر غور کیجیے اور پہلی صدی ہجری کے ان حالات کو یاد

کیجیے جو مسلمانوں کے ساتھ مدینہ طیبہ میں پیش آئے تھے۔

دارِ ارقم جو مسلمانوں کی پناہ گاہ تھا

جب میں قرآن مجید کی اس آیت کو پڑھتا ہوں تو ذہن "دارِ ارقم" اور "شعب ابی طالب" کی طرف جاتا ہے، وہ "دارِ ارقم" کون سی جگہ تھی؟ "دارِ ارقم" وہ گھر تھا جس میں مسلمان کفار کی اذیت سے اور ان کی سنگدلی سے اور ان کے وحشتناک معاملات سے بچنے کے لئے، اللہ کا نام اطمینان کے ساتھ لینے اور نماز ادا کرنے کے لئے پناہ لیتے تھے، اور بہت بڑے بڑے جلیل القدر نامی گرامی صحابی وہیں جاکر اسلام لائے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے حضرت سیدنا عمر بن خطابؓ بھی وہیں گئے اور انھوں نے بھی کلمہ پڑھا۔ یہ تھا "دارِ ارقم" جو مسلمانوں کی پناہ گاہ تھا۔

اور "شعب ابی طالب" وہ جگہ تھی جہاں حضور ﷺ اور صحابہ کرام کو پناہ لینی پڑی اور ان کا مقاطعہ اور بائیکاٹ کیا گیا تاکہ کوئی سودا بیچنے والا ان کے پاس نہ پہونچے، کوئی غذائی سامان نہ پہونچائے، لیکن اس میں بعض بعض شریف انسان مکہ مکرمہ کے تھے، جو کسی طرح سے کچھ غذا پہونچا دیتے جس سے ان کی زندگی قائم رہے، ورنہ ان کی موت کا پورا سامان کیا گیا تھا، اور چاروں طرف ایسے پہرے بٹھا دیئے گئے تھے اور ایسا حصار قائم کیا گیا تھا کہ باہر کی دنیا سے ان کا کوئی رابطہ اور تعلق نہ پیدا ہو پائے، یہ تھا اس وقت کا نقشہ!

قرآن مجید مسلمانوں کو مخاطب کرکے (جن کی تعداد اس وقت چند ہزار سے زیادہ نہ تھی) کہتا ہے "اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِيْ الْأَرْضِ" جب تم تھوڑے

تھے، زمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے، "تَخَافُوْنَ أَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ" ہر وقت ڈرتے تھے کہ تم کو کوئی جھپٹا مار کے اچک نہ لے جائے، (یہاں پر قرآن مجید نے "تَخَطَّفْ" کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کے معنی جھپٹا مارنا اور اڑا کر لے جانا ہیں) حالت یہ تھی کہ تم لقمۂ تر تھے، دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو چھوڑیئے کہ حجاز بلکہ قریش کا قبیلہ ہمیشہ کے لئے اس چراغ کو گل کرنے کے لئے کافی ہوتا، قرآن مجید کے اندر مندرجہ ذیل آیت میں پھونک مار کر بجھانے کی تعبیر استعمال کی گئی ہے:

"يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَاللهِ بِأَفْوَاهِهِمْ"

یہ صرف ادبی لفظ نہیں، اس کے سارے الفاظ معجز ہیں، اس لفظ میں ایک سچی اور صحیح تصویر ہے، حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کی زندگی کا چراغ اور اسلام کے چراغِ نور کو ہر وقت گُل کیا جا سکتا تھا، اس کے بجھانے کے لئے کسی پنکھے کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ وہ منہ کی پھونک سے بجھایا جا سکتا تھا، اللہ تعالیٰ نے دو تین جگہ قرآن مجید میں یہ الفاظ استعمال کئے ہیں، اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کے حالات کی صحیح اور سچی تصویر پیش کی گئی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "فَاٰوٰكُمْ وَأَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" اور تم کو پناہ دی، اور تم کو نصرتِ خداوندی اور آسمانی مدد کے ذریعہ تمھاری تائید کی، اور صرف یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے حلال و پاک چیزوں میں سے تم کو عطا فرمایا تاکہ تم شکر ادا کرو، "طیبات" کا لفظ عام ہے، سلطنت سے لے کر مطلق العنان و بااختیار سلطنت تک اور سلطنت کے دنوں میں جو عزت ہوتی ہے، جو اعزاز و اختیارات حاصل ہوتے ہیں، جو قانون سازی کی طاقت،

آزادی و خود مختاری اور بلندی و برتری حاصل ہوتی ہے، یہ سب "طیبات" میں آتا ہے۔

"وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ"

کہ شاید تم شکر کرو، اور تمھارے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہو۔

جب تک یہ آیت پڑھی جائے گی، جو لوگ سیرت پاک سے واقف ہیں یا آنحضرت ﷺ کی سیرت پاک پڑھیں گے اور جنھوں نے اسلام کی تاریخ پڑھی ہے اور ادیان کی بھی تاریخ پڑھی ہے، مذاہب و انقلابات کی تاریخ پڑھی ہے ان کو "دارِ ارقم" ضرور یاد آئے گا۔(۱)

---

(۱) دو مختلف تقریروں سے مشترک طور پر ماخوذ ہے۔

(۱) زندہ رہنا ہے تو میر کارواں بن کر رہو۔ (دار العلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقعہ پر)۔

(۲) دار ارقم جو مسلمانوں کی پناہ گاہ تھا۔ (تعمیر حیات ۲۵/ مارچ ۱۹۹۴ء)

یقین و ایمان کا سودا

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هٰجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُوْلٰئِكَ یَرْجُوْنَ رَحْمَةَ اللّٰهِ.

(بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت اور محنت کی،

راہِ خدا میں وہی اُمیدوار ہو سکتے ہیں رحمت حق کے)

گوہر مقصود۔ یوں ہاتھ نہیں آتا!

سارے علم و مطالعہ، عبادات و ریاضات اور ساری اصلاح و تربیت کا مقصود و ماحصل معرفت اور یقین ہے، لیکن یہ معرفت و یقین کوئی ایسا گرا پڑا مال نہیں ہے جو راستہ چلتے مل جائے ہم اپنے مشاغل اور تفریحات، اپنی معاشی جدوجہد، اپنی خواہشات کی تکمیل اور زندگی کے لگے بندھے نظام میں مشغول رہیں اور یہ گوہر مقصود ہمارے ہاتھ آ جائے۔ یہ بات غیرتِ خداوندی کے خلاف ہے، نعمتِ ایمان اور دولتِ یقین کوئی ایسی چیز نہیں جو ہر کسی کے گلے لگا دی جائے، چاہے اس کو اس کی طلب ہو چاہے نہ ہو، چاہے اس کو اس کی قدر ہو چاہے نہ ہو۔ قرآن شریف میں ایک پیغمبر کی زبان سے آتا ہے۔ "أَنُلْزِ مُكُمُوْهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُوْنَ"۔ (کیا ہم

ایمان کی دولت تمھارے گلے لگادیں گے چاہے تم اس کو ناپسند کرتے ہو)۔ اس کے لئے بند ہمتوں اور حقیقت شناسوں نے بڑے بڑے ہفتِ خواں سر کئے ہیں، سمندر کھنگالے ہیں پھر گوہر مقصود ہاتھ آیا ہے۔ ایک امام غزالیؒ ہی کی مثال لیجئے...... وہ امام غزالیؒ جن کو اللہ تعالیٰ نے علم کی بادشاہی عطا فرمار کھی تھی اور جو بوریے پر بیٹھ کر بادشاہت کر رہے تھے ان کو یہ محسوس ہونے لگا کہ میرے اندر جو یقین ہونا چاہئے وہ نہیں ہے...... آخر میں اس پوری شان و شوکت کو ٹھکرا کر چلے گئے کہ جب تک وہ یقین کی کیفیت میرے اندر پیدا نہیں ہوگی میں واپس نہیں آؤں گا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی۔

"وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا"

جو اللہ کے راستے میں نکلتا ہے اللہ اس کی مدد فرماتا ہے خدا نے ان کو ان کی جستجو میں کامیاب کیا اور وہ دولت عطا کی جس کی ان کو تلاش تھی، وہ ایسا یقین لے کر آئے اور ایسی معرفت لائے جو آج بھی ہزاروں نہیں لاکھوں دلوں کو گرما رہی ہے آج بھی اس سے ایمانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے صدقِ طلب کی ان کو یہ جزا عطا فرمائی، یہ صلہ دیا کہ خود بھی ان کو یقین عطا فرمایا اور دوسروں میں یقین پیدا کرنے کی بھی ان میں طاقت پیدا کر دی، وہ ہزاروں آدمیوں کے یقین کا سبب بن گئے۔

اسی طرح مولانا خالد رومی کے دل میں ایک تڑپ پیدا ہوئی اور ان کو اپنے اندر ایک باطنی خلا محسوس ہوا کہ سب کچھ ہے، باہر سے عالموں کا لباس ہے، عالموں کی زبان ہے، عالموں کا دماغ ہے، عالموں کا علم ہے، کتب خانہ کا کتب خانہ

میرے دل میں بھرا ہوا ہے لیکن جو چیز ہونی چاہئے وہ نہیں ہے، میرے اندر وہ احسانی کیفیت جس کا داعی حضورؐ کا ارشاد "أن تعبدالله كأنك تراه" (تمھاری عبادت ایسی ہونی چاہئے گویا کہ اللہ کو دیکھ رہے ہو) اس سے میرا دل خالی ہے۔

جب حضورؐ سے حضرت جبرئیل نے پوچھا:- ماالاحسان (احسان کسے کہتے ہیں، کمال کیا ہے) فرمایا "أن تعبدالله كانك تراه" (تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو اور مشاہدہ کر رہے ہو) "فان لم تكن تراه" اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو پھر خیال کرو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے (فانه يراك)۔

خالد رومی کو بھی اسی شدید احساس نے بے چین و مضطرب کر رکھا تھا اور اس کی ان کو ہر وقت فکر رہتی تھی کہ میں پڑھتا ہوں پڑھاتا ہوں، قال اللہ اور قال الرسول میری زبان پر رہتا ہے لیکن میرے اندر جس درجہ کا یقین ہونا چاہئے، میرے اندر جو سوز ہونا چاہئے، میرے اندر دین کی جو تڑپ ہونی چاہئے، میرے اندر جو مشاہدہ کی کیفیت ہونی چاہئے، میرے اندر جو احسانی کیفیت ہونی چاہئے تھی وہ نہیں ہے۔

یہ احسانی کیفیت، یہ مشاہدہ، یہ تڑپ اور بے چینی، اور یقین و توکل کی وہ طاقت کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے ایک ایسے صاحبِ یقین، مرد باخدا کی صحبت درکار ہے جو بڑے سے بڑے یقین سے خالی دل کو بھی یقین کی دولت بخش سکے، اس کے لئے ایک ایسے یقین و ایمان سے معمور ماحول کی ضرورت ہے جس میں آکر بڑے سے بڑا تشکیک و تذبذب سے مارا ہوا انسان یقین و ایمان کی دولت سے سرفراز ہو جائے...... ان کو یہ معلوم ہوا کہ اس وقت دہلی میں اللہ کا ایک بندہ

ہے جو یقین کا سودا بیچتا ہے، جو یقین کی دولت بانٹتا ہے، جس کے پاس بیٹھنے سے قلب گرما جاتا ہے، جس کے پاس بیٹھنے سے یقین کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، تو اس اللہ کے نیک بندے کی خدمت میں حاضر ہونے کی خواہش نے ان پر اپنے بستر پر میٹھی نیند حرام کر دی، اب ان کا جی نہیں لگتا تھا، بس وہ وہاں سے چل کھڑے ہوئے ...... چنانچہ وہ اس خانقاہ میں ایسے پڑے اور ماسوا سے ایسے کٹے کہ وہ دولت لے ہی کر اُٹھے اور خدا نے ان کی طلبِ صادق اور محنت شاقہ سے ان کو ایسا سرفراز کیا کہ حضرت شاہ غلام علی صاحب کے خلفاء کبار میں ہوئے ...... شاہ غلام صاحب نے ان کو رخصت کیا اور پورے عراق، کردستان، اور ترکی کی اصلاح کا کام سونپا۔ اور جیسا کہ قرآن شریف میں آتا ہے کہ "مَثَلُ كَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ. تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا"۔ اللہ تعالیٰ نے خالد رومی کو اس آیت کا مصداق بنا دیا۔ ڈیڑھ سو برس ہو گئے لیکن آج بھی ان کا نام زندہ اور ان کے ہی صدقے سے ان علاقوں میں دین کی بہار ہے ...... یہ اس اخلاص کی برکت ہے اور اس طلب کی برکت ہے جو شاہ غلام علی صاحب کے پاس مولانا خالد رومی لے کر آئے تھے۔

رحمت الٰہی کے امیدوار

میں نے شروع میں پڑھا "إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ"۔ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کے راستے میں اپنا گھر بار چھوڑا اور اللہ کے راستے میں انتہائی کوششیں کیں، وہی

لوگ کچھ اُمید کر سکتے ہیں اللہ کی رحمت کی......!"رحمت" کا لفظ ایک ایسا لفظ ہے کہ جب اس کی نسبت اللہ کی طرف کی جائے تو اس سے ایک ایسی رحمتِ مطلق مراد ہوتی ہے جو غیر معین اور غیر محدود، زمان و مکان کی تمام پابندیوں سے آزاد ہوتی ہے۔ اس میں علم ہے، اس میں معرفت ہے، اس میں یقین ہے، اس میں تقویٰ ہے، اس میں احسان ہے، اس میں مقبولیت ہے، اس میں محبوبیت ہے، اس میں کرامت ہے، اس میں خوارق ہیں، اس میں نصرت ہے، اس میں تائید ہے، اس میں غلبہ ہے، اس میں عزت ہے سب کچھ اس میں آتا ہے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے "رحمت" کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے ورنہ ہو سکتا تھا "**اولئك يرجون الرحمة**" فرما دیتا، تاکہ معلوم ہو کہ یہ رحمتِ الٰہی کیسی ہوگی۔ وہ کوئی ایسی ویسی رحمت نہ ہوگی۔ ایک عام آدمی کی مہربانی بھی مہربانی ہے، ایک امیر آدمی کی مہربانی اس سے زیادہ ہوتی ہے، ایک بادشاہ کی مہربانی اس سے بڑھ کر ہوتی ہے لیکن اللہ کی مہربانی کا کیا کہنا "**مالا عين رأت ولا أذن سمعت ولا خطر علىٰ قلب بشر**" کوئی قیاس وہاں تک نہیں پہونچ سکتا اور اس میں کوئی حدود قائم نہیں ہو سکتے کہ اتنی اور اتنی دور، یہاں سے وہاں تک، کوئی اس کا رقبہ نہیں، کوئی اس کی پیمائش نہیں، کوئی اس کا عمق اور اس کا کوئی عرض و طول نہیں، یہاں تک کہ کوئی اس کا نام نہیں۔ بس وہ اللہ جس طرح چاہے۔ جیسے کہ روزے کے لئے ہے کہ "**الصوم لي وأنا أجزي به**" روزہ خاص میرے ہی لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا-اب کیا بدلہ لیں گے؟ بس میں جانوں کہ میں کیا بدلہ دوں گا۔ بدلہ جس کو ملے وہ اس کو سمجھ سکتا ہے یا جو دینے والا ہے وہ جانے۔ ایسے ہی یہاں بھی "**أُوْلٰئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَةَ اللّٰهِ**"۔ کس

شکل میں اللہ کی رحمت ظاہر ہو گی۔ جماعت کے ساتھ کیا ہو گی۔ فرد کے ساتھ کیا ہو گی، امت کے ساتھ کیا ہو گی۔ ملک کے ساتھ کیا ہو گی، زمانہ کے ساتھ کیا ہو گی؟ کوئی نہیں بتلا سکتا-! وہ فرماتا ہے مگر اس کے لئے شرط کیا ہے "اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ" ایمان، ہجرت، جہاد- تین چیزیں ہوں اس کے بعد أولئك يرجون رحمة الله۔ "اُولئک" کو مقدم کہا۔ وہ ہی کچھ امید کر سکتے ہیں اللہ کی رحمت کی، وہ ہی کچھ اللہ کی رحمت کے مستحق ہو سکتے ہیں، اس کے منتظر رہ سکتے ہیں......! مگر پہلے پیاس تو ہو۔ طلب تو ہو، اپنے اندر کمی کا احساس تو ہو۔ یہ شرط پائی جائے تو خدا کی رحمت خود دستگیری کے لئے بڑھتی ہے "جاهدوا فينا" کی توفیق عطا ہوتی ہے اور انسان امام غزالی، مولانا خالد رومی اور اصحاب نبیؐ کی صفات و اخلاق کا حامل ہوتا ہے۔ والحمد للہ رب العالمین (۱)

"حقیقت یہ ہے کہ ذاتی جدو جہد اور شخصی عزم کے بغیر دین اور علم دین کے صحیح ثمرات حاصل نہیں ہونے پاتے...... دین کی اللہ کے یہاں جو قدر ہے اس کے اور اللہ کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی کو بلا طلب مل جائے! بہر حال اللہ تعالیٰ نے ہدایت و رحمت کو اپنے راستہ میں جدو جہد کے ساتھ وابستہ کیا ہے"۔

(ایک اہم دینی دعوت۔ صفحہ ۱۲)

---

(۱) ماہنامہ الفرقان لکھنؤ۔ بابت شوال، ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ

دینی سرحدوں کی حفاظت

يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوْا اللهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ.

(آل عمران۔۲۰۰)

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:-

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، صبر سے کام لو، "وَصَابِرُوْا" اور صبر کی فضا پیدا کرو، صبر کا ماحول پیدا کرو، ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو، صبر کی ترغیب دو، "وَرَابِطُوْا" اور جمے رہو، سرحد کی حفاظت کرو، سرحدوں پر جمے رہو، "وَاتَّقُوا اللهَ" اور اللہ سے ڈرو، احتیاط سے کام لو، اللہ کو حاضر و ناظر سمجھ کر کام کیا کرو، "لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" تاکہ تم کامیاب ہو!

"صبر" کے معنی

اس آیت میں پہلا جو حکم ہے اور جو پہلا خطاب ہے اور جس کا حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اے ایمان والو! صبر سے کام لو، "صبر" عربی کا لفظ ہے، اور ایسا ہوتا ہے کہ ایک زبان کا لفظ جب دوسری زبان میں جاتا ہے اور بہت لمبا سفر کرتا ہے، اور وہ

سفر مکانی بھی ہوتا ہے یعنی بہت دور سے آتا ہے وہ لفظ، اور بہت دور تک جاتا ہے، اور وہ سفر زمانی بھی ہوتا ہے کہ کہیں اس کو آج ہزار برس ہوگئے!

اب عربی زبان ہندوستان میں کب آئی تھی اور کب سے یہ لفظ ''صبر'' کا داخل ہوا اور مسلمانوں کی زبان پر چڑھا، مسلمانوں کے قلم سے نکلا، مسلمانوں کی گفتگوؤں میں آیا، اس کو بھی بارہ سو برس گذرے ہوں گے۔

تو جب کوئی لفظ کسی زبان میں جاتا ہے اور لمبا سفر طے کر کے کسی زمانہ میں پہنچتا ہے، کسی دور کے لوگوں تک پہنچتا ہے، تو اسکے معنی میں کچھ فرق آجاتا ہے، یا معنی محدود ہو جاتے ہیں، یعنی وہ لفظ بہت وسیع تھا، وہ بہت پھیلا ہوا تھا، اور بڑے میدان کو اور رقبے کو گھیرتا تھا اور سب زندگی کی چیزوں پر، زندگی کے شعبوں پر وہ محیط تھا، اور وہ محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔

''صبر'' بھی ان ہی لفظوں میں سے ہے!!

یہ جس کے ساتھ تھوڑی سی حق تلفی، ناانصافی ہوئی مگر اس نے صبر سے کام لیا، اور وہ یہ کہ صبر کے معنی یہ ہوں گے کہ اگر کوئی صدمہ پڑ جائے، کوئی حادثہ پیش آجائے، کوئی ناانصافی ہو، کوئی تکلیف ہو تو زیادہ روؤ دھوؤ نہیں، زیادہ شکایت نہ کرو!۔ لیکن عربی میں ''صبر'' کے معنی اس سے بہت وسیع ہیں، ''صبر'' کے معنی ہیں جم جانا، پختہ رہنا، اور مقابلہ کرنا، اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنا، اپنے اصولوں کو نہ چھوڑنا۔ یہ معنی ہیں ''صبر'' کے عربی میں۔

"صابروا" کی حکمت

اس آیت میں "اصبروا" کے ساتھ "صابروا" کی ہدایت وتلقین کی حکمت اور اس کا راز بڑا غور طلب ہے، اقوام وملل کی زندگی اور قوموں کے عروج وزوال کے مسئلہ میں صرف انفرادی صبر و استقامت کافی نہیں ہوتی، اجتماعی صبر و استقامت اور ہمت و استقلال کی ایک عام فضا اور ماحول کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہر فرد دوسرے کے لئے باعث تقویت، اس کا پشت پناہ، اپنی جگہ پر صابر و مستقیم اور دوسروں کے لئے صبر و استقامت کا داعی و مبلغ ہو، اس کی زندگی، اس کا ایمان ویقین، اس کا صبر و توکل، اس کا عزم و حوصلہ، اس کا بلند کردار، دوسروں میں اعتماد پیدا کرنے کا ذریعہ اور ان کے لئے مشعلِ راہ ہو، اس کو دیکھ کر اکھڑتے ہوئے قدم جم جائیں، افسردہ طبیعتیں اور پست ہمتیں بلند و مستحکم ہو جائیں۔ اس فضا میں بے ہمتی اور بے صبری کی بات کہنا اور کرنا ایسا ہی مشکل ہو جائے اور معیوب سمجھا جائے جیسے تردد و تذبذب کے ماحول اور خوف وہراس کے عالم میں صبر و ہمت کی تلقین اور ثبات واستقامت کی ہدایت،

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یا ایھا الذین آمنوا! اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، "اِصبروا" صبر سے اور قوت برداشت سے کام لو۔ اور پھر قرآن کا معجزہ ہے، جو عربی زبان کا ذوق رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ باب مفاعلہ لازم چیزوں کے لئے اور جو ذاتی چیزیں ہیں ان کے ساتھ یہ باب بہت کم آتا ہے، وہ متعدی چیزوں کے ساتھ آتا ہے جیسے "مقاتلہ" ایک دوسرے سے لڑنا، "محاربۃ" ایک دوسرے سے

جنگ کرنا، ''مناصرۃ'' ایک دوسرے کی مدد کرنا، لیکن یہاں ''صبر'' جو ایک ذاتی فعل اور ایک ذاتی اقدام اور ذاتی طرز عمل ہے، اس کے لئے مفاعلہ کا صیغہ ہے، ''وصابروا'' اور صبر کی فضا پیدا کرو۔ صبر کی تلقین کرو، قوت برداشت کا مظاہرہ مردانہ وار، بہادرانہ اور صابرانہ طریقے پر تم نے اسے برداشت کیا ہے لیکن اس کو جائز قرار نہیں، وہ ایک برداشت کرنے کے معنی ہماری اردو میں یہ بھی ہوتے ہیں، اچھا بھائی ہو گیا کیا کیا جائے مجبوری ہے، یہ نہیں۔

تم نے اسے برداشت کر لیا، اسے سہہ لیا اور اس کے بعد تم وہی کے وہی رہے، تمھاری قوت ایمانی وہی ہے، تمھارے اعتقادات وہی ہیں، تمھارے توکّل علی اللہ کی کیفیت وہی ہے، اور اللہ کو قادر مطلق ماننے کی تمھاری صفت وہی ہے، تو ارشاد ہے ''وصابروا'' اور صبر کی فضا پیدا کرو، یعنی صبر کا شامیانہ تمھارے سروں پر چھایا نظر آئے، صبر کے بادل کا سایہ تمھارے سروں پر رہے اور جو دیکھے وہ کہے کہ یہ امت بڑی قوت برداشت والی ہے، اس میں بڑی قوت مقابلہ ہے، لیکن اسے کسی حکمت کی بناء پر اور اللہ کی مدد کے انتظار میں، اور انسانی محبت و برادری کا اور ملک میں امن و امان برقرار رکھنے کے لئے اور حدود سے تجاوز نہ ہو، اس کے لئے اسے ایک مناسب وقت کا انتظار ہے، یہ نہ سمجھیں کہ اس نے ہماری مان لی، گر گئے، پاؤں کے نیچے پڑ گئے، نہیں ''وصابروا'' صبر کی فضا چھائی ہو، اور معلوم ہو کہ اس کے اندر بڑی قوت مقابلہ ہے، یہ قوت مقابلہ بیرونی حملوں کے لئے نہیں بلکہ اندرونی حملوں کے لئے بھی ہے، جی اس وقت بھی چاہتا ہے کہ ماریں اور مر جائیں، لیکن انھوں نے اپنے کو قابو میں رکھا ہے، مفاد عامہ ان کے سامنے ہے، ان کے

سامنے ملک کی مصلحت ہے، ان کے سامنے پڑوسیوں کے حقوق ہیں، ان کے سامنے ظلم و سفاکی اور خونریزی کی قباحت ہے، ان کو ایمانی طاقت روک رہی ہے، ان کا ایمان ان کو روک رہا ہے، ان کو جو تربیت دی گئی ہے، ان کے سامنے جو اسوۂ رسول ہے جو صحابہ کا نمونہ ہے، وہ ان کو روک رہا ہے، ورنہ یہ میدان میں آجائیں، یہ بھی بتا سکتے ہیں، کہ یہ کیا کر سکتے ہیں- اور دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایک قلیل گروہ نے کیا کیا، اقلیت نے کیا کیا، چند آدمیوں نے کیا کر لیا، ملک کے ملک تباہ کر کے رکھ دیئے، جلا کر کے رکھ دیا، خاک کر کے رکھ دیا، "وصابروا" صبر ہی کافی نہیں تم امت ہو فرد نہیں ہو، تمھارے لئے امت کے احکام ہیں، تمھارے لئے ارشاد خداوندی ہے، فرمان نبویؐ ہے، اسوۂ رسولؐ ہے، تم اپنی مرضی کے مختار نہیں ہو، غصہ آیا جوش آیا، کھڑے ہوئے، قریب کا گھر تھا، پڑوسی کا گھر تھا، اسے جلا دیا، اپنا غصہ نکالنے اور اس کو ٹھنڈا کرنے کے لئے تم نے اسے جلایا، غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے آگ نہیں لگائی جاتی، غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے زیادہ حکیمانہ، زیادہ مشفقانہ، زیادہ مصلحت اندیشانہ، زیادہ مبصرانہ افعال ہوتے ہیں طرز عمل ہوتا ہے۔

یہ قرآنی اعجاز ہے کہ آج بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لئے نازل ہوئی ہے کہ اے ایمان والو! صبر سے کام لو۔ "وصابروا" اور جمے رہو، دیوار بنے رہو، ان فسادات، ان نازک حالات، ان حملوں، تعدیوں، دست درازیوں اور خونریزیوں اور اس بہیمیت اور سفاکیت کے مقابلہ میں چھاؤنی بنے رہو۔

حفاظت دین و ملت کا مورچہ

پھر فرمایا "ورابطوا" (اور مورچوں پر جمے رہو)

"رباط" کہتے ہیں ایسی مامون اور محفوظ جگہ کو جہاں لوگ مل جل کر رہیں، "ورابطوا" اور جمے رہو، اور دیوار بنے رہو، ان کے سامنے تم چھاؤنی معلوم ہو اور پھر آخر میں فرمایا، اور یہی فرق ہے کسی قائد کی تلقین، کسی سیاسی رہنما کی تلقین میں، کسی سیاسی مبصر اور فلسفی کی تلقین میں، اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلقین میں، کوئی اور ہوتا تو بس یہیں تک کہتا کہ: "یا ایھا الذین آمنوا اصبروا وصابروا" اور یہ بھی کہہ دیتا "ورابطوا" اور جمے رہو، سیسے کی دیوار اور پہاڑ بنے رہو، لیکن "واتقوا اللہ" یہ اللہ کہے گا، اور اس کا رسول کہے گا، اور یہ فرق ہے اس دین میں جو اللہ کی طرف سے آیا، اور اس کے پیغمبر نے پہونچایا، اور اس فلسفہ، اس رہنمائی، اس قیادت میں جو انسان اپنے تجربہ، اپنے حالات، اپنی خواہشات، اپنی قوم و جماعت کے مطابق قیادت کا جو نقشہ پیش کرتا ہے، اس میں فرق ہے، کوئی نہیں کہتا سوائے اللہ اور اس کے رسول کے اور اس کے کلام کے "واتقوا اللہ"......! یہ موقع "واتقوا اللہ" کہنے کا تھا، یہ تو صبر کی تلقین کی جارہی ہے، اور صبر کے معنیٰ ہیں کسی نے حملہ کیا ہے، کسی نے زیادتی کی ہے، اور کوئی ہمارے مقابلہ میں ظالم ہے، اس موقع پر نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ سے ڈرو، پہلے کہے، بعد میں کہے، قرآن شریف کی تفسیر میں کہے۔ لیکن ایسے موقع پر کہ ہمارے سامنے ایک طاقت ہو اور وہ طاقت تمام حدود کو پار کر رہی ہو، نہ عورتوں کی عصمت

مانع ہے، نہ بوڑھوں اور ضعیف العمر کی ضعیفی مانع ہے، نہ ان کی پیرانہ سالی مانع ہے، نہ پڑوسی کا پڑوس مانع ہے، نہ پڑھے لکھے کا علم مانع ہے، جیسا کہ آپ نے اخبار میں دیکھا اور پڑھا، اس موقع پر "واتقوا اللہ" کہنا، یہ بس خدا ہی کہہ سکتا ہے، اور خدا کا رسول کہہ سکتا ہے اور دنیا میں جتنے لٹریچر ہیں میں ان کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ یہ موقع "واتقوا اللہ" کہنے کا نہیں، یہ موقع تو ہے کہ ان کو سبق دو، ان سے منوالو کہ یہ تمھارے قدموں پر گر جائیں، اور کچھ پرواہ نہ کرو، تمام حدود پار کر جاؤ، جو کچھ کر سکتے ہو کرلو، یہ موقع اس کے کہنے کا تو ہوتا ہے، لیکن یہ شریعتِ الٰہی، تعلیماتِ نبوی، دین سماوی کا اعجاز ہے کہ اس موقع پر کہا کہ جب تمھیں موقع ملے تو یاد رکھو "اتقوا اللہ" اللہ سے ڈرو بھی، ان کی طرح تم بے احتیاطی، ان کی طرح تم حدود سے تجاوز، ان کی طرح تم درندگی، ان کی طرح حقائق سے چشم پوشی، ان کی طرح ملک، ماحول و معاشرہ اور بستی، حال و مستقبل اور وقت سے آنکھیں بند کرلینا، یہ تمھارا کام نہیں، "واتقوا اللہ" تم حدود الٰہی اور حدود شرعی کے پابند ہو، اس سے آگے تم نہیں بڑھ سکتے، بس میرے بھائیو! یہ ہمارے لئے پوری تلقین اور ہدایت نامہ ہے(۱)۔

اس آیت کو ہم اپنے دل پر لکھ لیں

"...... ہم آپ سب قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہیں، اور قرآن مجید کو خدا کا معجزہ رسول اللہ ﷺ کا معجزہ اور اللہ کا کلام سمجھتے ہیں، لیکن سب یہ حقیقت نہیں جانتے، اور اس حقیقت کے نہ جاننے سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا، اس لئے کہ علم

کے درجے ہوتے ہیں کہ قرآن مجید مجموعی اور کلی حیثیت سے بھی معجزہ ہے اور جزوی حیثیت سے بھی معجزہ ہے یعنی اس کی ایک ایک آیت معجزہ ہے، ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید معجزہ ہے، لیکن بہت کم لوگوں کی اس پر نظر ہے کہ قرآن مجید کی آیت مستقل ایک معجزہ ہے، اور اس کا اعجاز مختلف زمانوں اور مختلف حالات میں اس طرح ظاہر ہوتا ہے، کہ آفتاب کی مثال دینی بھی بے ادبی ہے اور میں نے آپ کے سامنے قرآن مجید کی جو آیت پڑھی ہے، بالکل یہ ایک اعجاز کامل ہے۔

...... اس کا حال بھی یہی ہے کہ یہ جب سے نازل ہوئی ہے، کوئی گن نہیں سکتا کہ کب کب اور کیسے کیسے موقعوں پر اور مایوسی کے عالم میں اس نے رہنمائی کی، اور مسلمانوں میں ایک روحانی، جسمانی، قلبی اور ذہنی، فکری اور دعوتی طاقت پیدا کر دی۔

اس آیت کو اگر ہم اپنے دل پر رکھ لیں اور ہمارا ذہن اس کو قبول کر لے اور اللہ توفیق دے تو ہر زمانہ کے لئے یہ پورا پیغام رکھتی ہے اور اس زمانہ میں خاص طور سے ایسا معجزہ معلوم ہوتا جیسے اسی زمانہ میں اُتری ہو اور ان ہی لوگوں سے خطاب ہو۔"(۲)۔

---

(۱) تعمیر حیات جلد ۳۰ شمارہ ۸ (۲۵ر فروری ۱۹۹۳ء

(۲) تعمیر حیات جلد ۳۴ شمارہ ۱۵ (۱۰ر جون ۱۹۹۷ء۔ دو مختلف تقریروں سے مشترک اخذ و تلخیص ہے۔

مسلمان کا مقام اور پیغام

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ.

(آل عمران۔ ۱۳۹)

اور تم ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو، غالب تمھیں رہو گے اگر تم پورے مومن رہے۔

تو "ہما" کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری(۱)

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب اسلام دور طفولیت میں تھا، اس وقت تک کوئی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی، اسلام جزیرۃ العرب اور عربوں ہی میں محدود و محصور تھا، عرب نہایت عسرت و تنگی اور فقر و فاقہ کی زندگی گذار رہے تھے، ان کا کھانا عام طور پر کھجور، اونٹ کا گوشت اور جو کی روٹی تھا، لباس موٹا جھوٹا

---

(۱) یہ اقبال کا مصرعہ ہے، پورا شعر اس طرح ہے ۔

تو ہما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری ۔۔۔ نہیں مصلحت سے خالی یہ جہان مرغ وماہی

اقبالؔ کا مخاطب وہ مرد مسلمان ہے جو خودی کے وصف سے آراستہ ہو۔

اور کھردرا، مکانات خام اور مٹی کے تھے، یا ادنیٰ خیمہ کی شکل میں، ان کا حال زار موسم سرما کی شبِ باراں میں بھیگی اور ٹھنڈک سے ٹھٹھری اور سمٹی ہوئی بکریوں کے گلہ کا سا تھا، جس کو جان کے لالے پڑے ہوتے ہیں، عربوں کی اس زبوں حالی کی صحیح اور سچی تصویر کشی قرآن کریم سے بڑھ کر کوئی اور نہیں کر سکتا، آپ قرآن کے یہ الفاظ پڑھئے اور عربوں کی بیچارگی و بے کسی کا عالم دیکھئے، قرآن کے الفاظ ہیں۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ. (الانفال ۲۶)

اور تم اس حالت کو یاد کرو جب تم تھوڑے تھے، زمین میں کمزور شمار کئے جاتے تھے اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ تم کو لوگ نوچ کھسوٹ لیں۔

عربوں کا تو یہ حال تھا، اور ان کے بر عکس روم و فارس دنیا کے حاکم و فرمانروا تھے، وہ تہذیب و تمدن کے بام عروج پر تھے، پوری دنیائے انسانیت ان کے زیر اثر و تابع فرمان تھی، ان دو بڑی طاقتوں نے مشرق و مغرب کو باہم بانٹ رکھا تھا، مشرق اہل ایران کے زیر فرمان تھا، اور مغرب رومیوں کے، یہ زندگی کے مزے اڑا رہے تھے، دنیا کا دامن ان کے لئے وسیع و کشادہ تھا، ضروریات زندگی کی فراوانی تھی، رزق کے دہانے کھلے ہوئے تھے، کائنات ان کے لئے جود و سخا کا مینہہ برسا رہی تھی، ممالک و اقوام ان کے زیر فرمان تھے، اور انھیں کے چشم و ابرو کے اشارے پر چل رہے تھے، ان کا ہاتھ مٹی کو لگ جاتا تھا تو سونا بن جاتی تھی، مشرق و مغرب پر انھیں کا پرچم لہرا رہا تھا۔

اس تیرہ و تاریک فضا میں، یاس و ناامیدی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جہاں ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا، آس اور امید کی کوئی ہلکی سی کرن بھی نظر نہیں

آرہی تھی، قرآن مجید طاقت کی متوالی ان دونوں حکومتوں کو چیلنج کرتا ہے، اور لٹے پٹے عرب مسلمانوں میں اعتماد وافتخار کی روح پھونکتا ہے اور کہتا ہے۔

وَلاَ تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ.

اور ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو، غالب تم ہی رہو گے اگر تم پورے مومن رہے۔

قرآن نے قریش مکہ کو چیلنج کیا، روم و فارس کے امپائر کو چیلنج کیا، پھر اس مٹھی بھر جماعت مسلمہ کے قائد و رہبر نبی مرسل محمد ﷺ کی تسکین و تسلی کے لئے سورہ یوسف نازل ہوئی، قرآن مجید نے اعلان کیا۔

لَقَدْ كَانَ فِي يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهِ اٰيَاتٌ لِّلسَّائِلِيْنَ.(۱)

وہ جو پوچھتے ہیں ان کے لئے نشانیاں ہیں، یوسف اور ان کے بھائیوں (کے قصے) میں۔

اس سورہ کو ان الفاظ پر ختم فرمایا۔

حَتّٰى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَائَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاءُ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ. لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ. مَا كَانَ حَدِيْثاً يُّفْتَرىٰ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدىً وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ.(۲)

یہاں تک کہ پیغمبر ناامید ہوگئے اور ان کو گمان غالب ہوگیا کہ ہماری فہم نے غلطی کی، ان کو ہماری مدد پہونچی پھر ہم نے جس کو چاہا بچالیا اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے نہیں ٹلتا، ان کے قصوں میں سمجھدار لوگوں کے لئے عبرت ہے یہ قرآن کوئی تراشی ہوئی بات تو ہے نہیں بلکہ اس سے پہلے جو آسمانی کتابیں ہو چکی ہیں، یہ ان کی تصدیق کرنے والا ہے اور ہر ضروری بات کی تفصیل کرنے والا ہے اور ایمان والوں کے لئے ذریعۂ ہدایت ورحمت ہے۔

(۱) یوسف: ۷ (۲) یوسف: ۱۱۰-۱۱۱

اسی طرح سورۂ قصص کی یہ آواز دنیا کی فضاؤں میں گونجی، اللہ تعالیٰ نے اس سورہ کو ظلم وجور اور خوف وہراس کی تاریک فضا میں نازل فرمایا۔

طٰسٓمٓ. تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ. نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ. اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِى الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ. اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ. وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ. وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَنُرِىَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ.

(سورہ قصص: ۱ تا ۶)

طسم۔ یہ کتاب واضح کی آیتیں ہیں، ہم آپ کو موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کا کچھ قصہ ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں، فرعون سرزمین (مصر) میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا، اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف قسموں میں بانٹ رکھا تھا، ان میں سے ایک جماعت کا زور گھٹا رکھا تھا، اس طرح سے کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کراتا تھا، اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا، واقعی وہ بڑا مفسد تھا، اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جن لوگوں کا زور گھٹایا جارہا تھا ان پر احسان کریں اور ان کو پیشوا بنائیں اور ان کو مالک بنائیں اور ان کو زمین میں حکومت دیں، اور فرعون اور ہامان اور ان کے تابعین کو ان کی جانب سے وہ واقعات دکھلائیں جس سے وہ بچاؤ کر رہے تھے۔

ایسے پُر خطر ونازک حالات میں کسے خیر کی امید ہو سکتی تھی، کس کا دل وجگر تھا، جو پیشین گوئی کرتا کہ مسلمانوں کی یہ کمزور و بے حقیقت جماعت، ظلم وجور کی ماری ہوئی ہر قسم کے وسائل سے خالی اور تہی دست جماعت، افق پر ابھرے گی، کیا

دنیا کا بڑے سے بڑا شخص خواہ کتنی ہی دور بیں نگاہ اور فراست رکھتا ہو، اور کتنا ہی جری اور عقابی صلاحیتوں سے مالامال ہو، مسلمانوں کی اس مٹھی بھر کمزور و بے حیثیت جماعت کے بارے میں پیشین گوئی کر سکتا تھا اور کہہ سکتا تھا کہ "وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ"؟۔

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا

لیکن اس اعتماد و یقین نے عربوں کے سینے کو جرأت و حوصلہ اور جوش و ولولہ سے بھر دیا تھا، اور انھیں ایسی عقابی روح عطا کی تھی کہ وہ ان بڑی بڑی طاقتوں کو سجی سجائی بے جان گڑیوں کی طرح دیکھ رہے تھے، یہ طاقتیں ان کو کرم خوردہ ستون اور بے جان ڈھانچے معلوم ہو رہی تھیں، قرآن کریم ان بے روح حکومتوں کی بالکل سچی تصویر کشی کرتا ہے، اور قرآن سے بڑھ کر صحیح تصویر کشی کون کر سکتا ہے؟ ذرا قرآن مجید کے یہ الفاظ پڑھیے۔

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ. وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ. كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ.

(منافقون: ۴)

اور جب آپ انھیں دیکھیں تو ان کے قد و قامت آپ کو خوشنما معلوم ہوں اور اگر یہ باتیں کریں تو آپ ان کی باتیں غور سے سننے لگیں (لیکن حقیقت یہ ہے کہ) گویا یہ لکڑیاں ہیں جو دیوار کے سہارے کھڑی ہیں۔

یہی کمزور و بے مایہ عرب جب دولتِ ایمان و یقین کو سینے سے لگا کر اس پر فخر و ناز کرتے ہوئے جزیرۃ العرب سے باہر نکلے تو یہ بڑی بڑی طاقتیں ان کو ہیچ نظر

آئیں اور انھیں تہ و بالا کر کے رکھ دیا اقبالؔ کے الفاظ میں۔

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا　　سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو　　عجب چیز ہے لذت آشنائی

یہ عرب جب دنیا کو فتح کرنے کے لئے نکلے ہیں، بلکہ انسانیت کا نجات دہندہ بن کر نکلے، اس مقصد سے نکلے کہ انسانیت کو وحشت و بربریت کے چنگل سے چھڑائیں اور انسانیت کو اس ظلم و جور سے نجات دلائیں جو صدیوں سے جاری تھا، تب ان پر وہ حقیقت کھلی جو اوپر بیان ہوئی، وہ جب لوگوں کو بندوں کی عبادت سے نکال کر خدائے واحد کی عبادت و اطاعت کی طرف بلانے کے لئے نکلے، دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعت کی طرف لانے کی غرض سے نکلے، ادیان و مذاہب کے ظلم و جور سے نکال کر اسلامی عدل و انصاف کی طرف بلانے کے مقصد سے نکلے، تو یہ بے روح جاہ و جلال ان کو ہیچ نظر آئے، بڑی بڑی حکومتیں ان کو کٹھ پتلی کا کھیل معلوم ہوئیں، ان کے جھنڈوں کو سرنگوں کرنا بچوں کا کھیل معلوم ہوا، آسمان سے باتیں کرنے والی فلک بوس عمارتیں ان کو خس و خاشاک کا ایک تودہ معلوم ہوئیں، بڑے بڑے لشکر ان کو بھیڑ بکری کا گلہ معلوم ہوتے، انھوں نے ان کو غیر عاقل اور بے شعور جانور سمجھا جس میں نہ رحم و کرم کا مادہ ہے، نہ لطف و مہربانی کا جذبہ، وہ انھیں انسانوں کی شکل میں بھیڑیئے اور درندے نظر آئے۔

قرآن پاک نے ان اَن پڑھ عربوں کو، قافلۂ حیات سے بچھڑے ہوئے عربوں کو، تہذیب و تمدن سے ناآشنا عربوں کو، قوت و طاقت اور حوصلہ سے بھر دیا، انھوں نے ان کے سرد اور خالی دلوں کو اس نعمتِ عظمیٰ پر فخر و ناز، خود اعتمادی و

خود شناسی اور رفعت و بلند پروازی کے نئے "سیل" اور نئے مسالہ سے بھر دیا، اس نے ان اشیاء کے خواص واثرات کو جاننے کا ملکہ عطا کیا، وہ ان ساری توانائیوں سے مالامال ہو کر نکلے اور سارے عالم کو زیر کر لیا، اس لئے نہیں کہ وہ اس کے مالک بن جائیں، نہ اس لئے کہ اس پر حکومت و فرمانروائی کریں، جیسا کہ ان قوموں نے کیا تھا، بلکہ وہ اس لئے نکلے تھے کہ گم کردہ راہ اور در در کی ٹھوکر کھاتی ہوئی انسانیت کو خدائے واحد کے سامنے جھکائیں اور اسے اسلامی عدل و انصاف کے سائے میں لائیں۔

اس فخر واعتماد کے ہم زیادہ مستحق ہیں

اس وقت ہم اقوام متحدہ کے مرکز میں ہیں، آج جب کہ ہم متعدد حکومتوں کی نمائندگی کر رہے ہیں، اس فخر و اعتماد کے زیادہ مستحق ہیں، جو ان عربوں کو حاصل تھا، ہم اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ ہم کو اس آسمانی آواز میں مخاطب کیا جائے، جس سے وہ مخاطب کئے گئے تھے، "وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَأَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ" جس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، اس وقت عربوں کی کوئی حکومت نہیں تھی، خود جزیرۃ العرب میں ان کی کوئی حکومت نہیں تھی، اسلام کو وجود میں آئے ہوئے دس سال سے زائد ہو چکے تھے، اور وہ ابھی طفل شیر خوار کی طرح دھیرے دھیرے چل رہا تھا، اور ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے عربوں کو اس کا اہل دیکھا کہ وہ ان الفاظ سے مخاطب کئے جائیں، تو کیا ہم اس خدائی فرمان کے مخاطب بننے کے اہل نہیں جب کہ ہم چالیس ملکوں کی نمائندگی کر رہے ہیں اور اس

وقت ہمارے کثیر التعداد جھنڈے اقوام متحدہ کی عمارت پر یہاں لہرا رہے ہیں، اگرچہ ہم موجودہ عہد کی ایٹمی قوت و شوکت کے مالک نہیں، ہم جدید ترقیات اور علم و تمدن کے میدان میں کوتاہی کا شکار ہیں، اپنی سستی و کاہلی اور باہمی نااتفاقی و انتشار، اور اسلامی تعلیمات کو حقیر سمجھنے اور نعمت اسلامی کی ناقدری کے سبب ان حکومتوں کے معیار پر نہیں ہیں، تاہم دور اول کے عربوں سے زیادہ اچھی حالت میں ہیں، جن کی ایک حکومت بھی نہ تھی، تو کیا ہم اس آیت کا مخاطب بننے کے لائق نہیں کہ "وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَأَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ" یہ ایمان ہی مومن کی قیمت ہے، ایمان ہی ٹارچ کی اصل قیمت ہے اگر سیلز نہ ہوں تو ٹارچ کی کوئی قیمت نہیں، یہ ایمان ہی وہ پاسنگ ہے کہ اس کو ترازو کے جس پلڑے میں رکھ دیا جائے وہ جھک جاتا ہے، یہ وہی پاسنگ ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ بدر کے موقع پر ان مبارک الفاظ میں رکھا تھا۔

اللهم ان تهلك هذه العصابة من اهل الاسلام لا تعبد.(۱)	اے اللہ! اگر تو اس مٹھی بھر جماعت کو مٹا دے گا تو قیامت تک روئے زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی۔

حضور ﷺ سمجھ گئے کہ اس وقت رجوع و انابت کی ضرورت ہے، آپ کی ذات گرامی وہ ذات ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے عقلِ سلیم عطا فرمائی تھی، حقیقت حال کو ٹھیک ٹھیک پیش کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی تھی، اگر فیصلہ قوت و طاقت یا کثرت تعداد پر ہوتا تو اسلام و مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہ ہوتا، اور روئے زمین پر

(۱) مسلم شریف ج۲ ص ۹۳

اس کا وجود بھی نہ ہوتا، اہلِ بدر کُل تین سو تیرہ تھے، ان کے مد مقابل ہتھیار سے لیس ایک ہزار کا جم غفیر تھا، مسلمانوں کی یہ مٹھی بھر جماعت کفار کے اس لشکر جرار پر کیسے فتحیاب ہو سکتی تھی، اس نازک گھڑی میں حضور ﷺ نے دعا و تضرع کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کیا، اور بارگاہ ایزدی میں ان الفاظ کے ساتھ دعا و التجا کی

"اللهم ان تهلك هذه العصابة لن تعبد"۔

جب ہمیں اسلام پر فخر و ناز ہوگا، اسلام ہمارا اور ہم اسلام کے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ہمارا معین و مددگار ہوگا، اور ہمارا محافظ و نگہبان ہوگا، اللہ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے، اور اس کا وعدہ جھوٹا نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

اِنْ تَنْصُرُوْا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ. (سورہ محمد: ۷) — اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جمادے گا۔

لیکن اگر ہم صرف نام کے مسلمان رہے، اور حقیقت اسلام ہم میں نہ پائی گئی تو پھر ہم امیر شکیب ارسلان کے اس جملہ کا مصداق بنیں گے، جو انھوں نے پرانی لیگ آف نیشنز پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے کسی مضمون میں لکھا تھا کہ "جمعیۃ اقوام (League of Nations) فنِ عروج کی بحر کی طرح محض نام کی بحر ہے جس میں پانی کا نام و نشان نہیں" اگر ہم بے پانی کا سمندر رہے تو ہم پر ہزار حیف، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں کسی مدد کی امید نہیں رکھنی چاہئے، بارگاہ خداوندی میں تو ایمان ہی کا وزن ہوتا ہے، ایمان ہی کی قدر اور ایمان ہی کا اعتبار ہوتا ہے(۱)۔

(وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ)

(۱) نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں تلخیص از ص ۷۶ تا ص ۷۸

اسلام کے مردانِ باوفا

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْا اللّٰهَ عَلَيْهِ، فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَه وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ. وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلاً.

"ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے، ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے، انھوں نے (اپنے رویہ میں) کوئی تبدیلی نہیں کی"۔ (الاحزاب: ۲۳)

قرآن شریف کی یہ آیت

ایک عہد، ایک نسل، ایک تحریک، ایک دعوت، ایک صداقت، ایک بطولت، وفاداری پر اور اسلام کو ایک صحیح شکل میں پیش کرنے پر اور اس کے لئے ہر چیز کو قربان کر دینے پر اس کی پوری تاریخ مجسم طریقہ پر میرے سامنے آگئی ہے۔

جماعت مجاہدین کے کارنامے کی تعریف اس آیت سے بہتر کی نہیں جا سکتی، یہ آیت نہ صرف اس عہد کو یاد دلاتی ہے، بلکہ قیامت تک کے لئے مسلمانوں کے سامنے ایک نمونہ پیش کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ مسلمان کا مقام کیا ہے، اور ہر

مسلمان کا اپنے اپنے عہد میں کیا فریضہ ہے، اور وہ کس چیز کا مکلف ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے کن نعمتوں کا نزول اس پر ہوتا ہے، اور اس کی طرف سے قبولیت کا استحقاق کس چیز میں پیدا کرتی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کے سامنے اسلام کا معیاری نمونہ سامنے رکھتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْا اللّٰهَ عَلَيْهِ".

(اہل ایمان کی جماعت تو بہت بڑی ہے، اور وہ ایک بڑا دائرہ ہے اس کے اندر بھی تخصیص کر کے فرمایا جارہا ہے کہ اہلِ ایمان میں کچھ مردانِ کار اور اہل عزیمت ایسے ہیں)۔ بلکہ اس کا ترجمہ یوں کر لیجئے کہ اہلِ ایمان تو بہت ہیں، خوش نصیب ہیں، اللہ کے وعدے پر یقین رکھتے ہیں، اور اللہ کے ایسے شیر مرد اور ایسے باہمت اور باحوصلہ لوگ ہیں۔

"صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْا اللّٰهَ عَلَيْهِ" انھوں نے اللہ سے جو عہد اور جو وعدہ کیا تھا سچ کر دکھایا:

"فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ" اور ان میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جو وقت پورا کر چکے اور اللہ کے پاس جا چکے، اللہ کے یہاں ان کو انعام ملے گا، ﴿وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى﴾ آخرت کا تو کہنا ہی کیا، ﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ﴾ اور جن کا ابھی وقت نہیں آیا، وہ انتظار میں ہیں، اور اپنے عہد پر قائم ہیں، ﴿وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلاً﴾ اور انھوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی۔

پورا اسلام ایک عہد و معاہدہ کا نام ہے

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس آیت میں اسلام کی تعریف آگئی ہے،

قرن اول کے مسلمانوں کے لئے یہ ایک معیاری چیز ہے، اور قیامت تک پیدا ہونے والوں کے لئے یہ ایک نمونۂ عمل ہے اور ایک معیار، اور اللہ کی طرف سے ایک سند ہے، مسلمان اصل میں محض زبان سے کلمہ پڑھ لینے کا نام نہیں ہے اس کو ہم مسلمان کہیں گے، ہم اس کے اسلام میں شک نہیں کریں گے، جو کلمہ پڑھے گا۔ ہم اس کو احترام اور قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے، لیکن اسلام اس پر ختم نہیں ہو جاتا کہ کلمہ پڑھ لیا جائے، مسلمان خاندان میں کوئی بچہ پیدا ہو جائے، پھر عقیقہ ہو، پھر وہ مسلمان کہلائے، اور وہ خود بھی اپنے کو مسلمان کہے۔ یہ کافی نہیں بلکہ "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْا اللهَ عَلَيْه". اس نے اللہ کے ساتھ کوئی عہد کیا، یہ اللہ کے ساتھ ایک عہد ہے وہ عہد یہ ہے کہ ہم اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گذاریں گے، اس دنیا کا خالق اور رازق، نافع اور ضار وہی ہے، وہی عزت اور ذلت دینے والا ہے اور کارساز حقیقی اور مالک الملک ہم اسی کو سمجھیں گے۔ کلمہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" بھی ایک عہد اور ایک اعلان ہے کہ ہم اس بات کا اعلان کرتے ہیں زبان قال سے بھی اور زبان حال سے بھی کہ اس دنیا کو پیدا کرنے والی اور چلانے والی تنہا خدا کی ایک ذات ہے، "الا له الخلق والأمر"۔ (یاد رکھو اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور اسی کا کام ہے حکم چلانا) وہ اس کا خالق بھی ہے اور منتظم بھی ہے، یہ نہیں کہ پیدا کر دیا اور اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا، یا دوسروں کے حوالہ کر دیا، کہ اب جو کچھ ہو آدمی کی کوششیں ہیں۔ نتائج ہیں، مواقع ہیں، اور اشیاء میں نفع و ضرر کی صلاحیت ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے اللہ تعالیٰ تو ایک ایک ذرہ کا مالک ہے، کوئی پتہ بغیر اس کی اجازت کے ہل نہیں سکتا اور نہ ہی کوئی ذرہ اپنی جگہ سے

ہٹ سکتا ہے، کوئی کام اور کوئی تبدیلی دنیا میں آ نہیں سکتی، نہ قسمتیں بدل سکتی ہیں، نہ حالات بدل سکتے ہیں، جب تک اس کی مرضی اور حکم نہ ہو۔ اصل میں اسلام ایک عہد ہے، اب اس عہد کو دیکھنا ہے، وہ عہد یہ ہے کہ ہم اس دنیا کا پیدا کرنے والا، چلانے والا خدا کو سمجھیں گے، اس کو مالک حقیقی مانیں گے، اور اپنی قسمت اسی کے ہاتھ سمجھیں گے، اور نافع و ضار اسی کو مانیں گے، اس کے سوا کسی کے سامنے نہ سر جھکائیں گے اور نہ کسی کے سامنے احتیاج اور التجا کا ہاتھ اور دامن پھیلائیں گے، یہ ایک عہد ہے، پورا اسلام ایک عہد و معاہدہ کا نام ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ کتنے لوگ ہیں جو اس عہد کو پورا کرتے ہیں، اور کتنے لوگ ہیں جو عہد کر کے بھول جاتے ہیں، ہم بھی عہد کر کے بھول گئے، اس میں صحابہ کرامؓ کی مثالیں ہمارے سامنے آتی ہیں، جب کلمہ پڑھا تو ان کو نہ اپنی جان کی پروا رہی اور نہ مال کی رہی، نہ اہل و عیال کی پروا، نہ عزت و ذلت کی پروا رہی، نہ صحت کی پروا رہی اور نہ رزق اور مال کی پروا رہی، اور نہ تعریف اور مذمت کی، کسی چیز کی انھیں پروا نہیں رہی۔

یہ وہ بات ہے جو مسلمانوں کو سمجھنی چاہئے خاص طور پر اس ابتلاء و آزمائش کے دور میں سمجھنا چاہئے کہ ...... یہ اسلام جس سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں سرفراز فرمایا ہے اور ہم پر احسان فرمایا ہے، اسلام کے ذریعہ، یہ اسلام نہیں ہے کہ آپ کہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کا نام رکھ لیں، یا مسلمانوں کی سی معاشرت، یعنی گھر کا نقشہ مسلمانوں کا سا ہو، مسجد بھی کبھی کبھی جائیں، یا پابندی کے ساتھ جائیں یا اپنے کو مخاطب کر کے کہیں، یہ ایک عہد ہے، یہ ایک (خدا کرے بے ادبی نہ ہو) چیلنج ہے زمانے کے لئے ایک چیلنج ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم اپنے عقائد میں مسلمان

ہیں، ہم عبادات میں مسلمان ہیں، اپنے اخلاق میں مسلمان ہیں، معاملات میں مسلمان ہیں، اپنے طرزِ معاشرت میں مسلمان ہیں، ہم آپس کے تعلقات، جو میاں بیوی کے تعلقات ہوتے ہیں، باپ بیٹے کے تعلقات ہوتے ہیں، بھائی بھائی کے تعلقات ہوتے ہیں، ہمسایوں سے تعلقات ہوتے ہیں، ہم ان سب چیزوں میں قانون الٰہی کے پابند ہیں، ہم کچھ نہیں جانتے، ہم پہلے یہ دیکھیں گے کہ حکم کیا ہے اس موقع پر، اللہ کے اس حکم سے اگر ہماری ساری جائداد جاتی ہو، ہماری ساری کمائی اور سرمایہ پر پانی پھر جاتا ہو، اور ہم ایک ایک لقمہ کے محتاج ہو جائیں جب بھی ہم یہی کریں گے، یہ ہے اصل اسلام، اسلام صرف ایک قومیت کا نام نہیں ہے، اسلام کسی تہذیب کا نام نہیں ہے، اسلام کسی آبادی کے ایک عنصر کے کچھ امتیازات اور اپنے کو ایک خاص نام سے موسوم کرنے کا نام نہیں ہے، جو اس وقت عام طور پر ہو رہا ہے، اسلام اول سے آخر تک ایک عہد ہے اور ایک پیمان ہے اللہ کے ساتھ ایک اعلان ہے دنیا کے سامنے ہمارے لئے فیصلہ کن، قابل عمل اور قابل غور چیز وہ ہوگی جس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حکم دیا جائے گا، رسول اس کی تشریح فرمائیں گے۔ جو اللہ کا حکم ہوگا اور جو رسول کی تشریح ہوگی یا جو اسوۂ رسول ہوگا یا جو رسول کا نمونہ ہوگا ہم اس پر عمل کریں گے، اگر ہمیں اپنی جائداد، اپنی مالی منفعت اور تمام سہولتوں سے دست بردار ہونا بلکہ نشانۂ ملامت بننا پڑے گا ہمارے لئے زندگی گذارنا وہاں دشوار ہو جائے، پھر آخری درجہ کی چیز یہ ہے کہ پھر کسی ملک میں (جہاں حالات مختلف ہوتے رہتے ہیں) وہاں ہم نگاہ پر چڑھ جائیں، بلکہ نگاہ پر چڑھنا نہیں ہم پھانسی کے تختہ پر چڑھا دیئے جائیں،

ہمارے ساتھ بالکل ایک مخالف قوم یا ایک بے وفا اور ایک غدار قوم کا سا سلوک ہونے لگے، ہمارے لئے ملازمتوں کے دروازے بند ہو جائیں۔ ہمارے بچوں کی تعلیم مشکل بلکہ بنیادی معاشی ذرائع کا حصہ حاصل کرنا بھی مشکل ہو جائے، پھر بھی ہم وہی کریں گے جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے۔

سو فیصدی سچ کر دکھایا

اللہ فرماتا ہے: "من المؤمنین رجال" اہل ایمان میں وہ شیر مرد لوگ ہیں، وہ جانباز لوگ ہیں، جنھوں نے "صدقوا" عہد کے سچے ہونے کا نمونہ دکھایا۔ قرآن مجید "صدقوا" کا لفظ بولے تو اس کی عمومیت، اس کا عمق اور اس کی طاقت کا کوئی شمار نہیں، اور ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے، اور جب "صدقوا" کا لفظ ہے تو اس کا مطلب ہے کہ سو فیصدی سچ کر دکھایا، نہ اس میں مداہنت تھی، نہ نفاق تھا، نہ مصلحت اندیشی تھی، نہ تاخیر تھی، کچھ بھی نہیں، سب سے بڑے عزت والے کی طرف سے عزت کی جو سب سے بڑی سند دی جا سکتی ہے اور جو توثیق کی جا سکتی ہے، وہ ان الفاظ میں موجود ہے، جن لوگوں پر یہ آیت نازل ہوئی تھی ان پر اگر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی، اگر اپنا گھر بار لٹا دیتے، اور لٹا دیا انھوں نے، اللہ تعالیٰ شہادت دیتا ہے "صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ" انھوں نے سچ کر دکھایا جس کے لئے انھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا، اور ذرا بھی وہ اپنی جگہ سے ہٹے نہیں۔

آج ہم مسلمانوں کی حالت کیا ہے۔ ہم مسلمان دیکھتے ہیں کہ اس بات کی کتنی

گنجائش ہے، اس میں نفع و نقصان کا کیا توازن ہے، نفع کتنا ہے، نقصان کتنا ہے، نیک نامی ہے یا بدنامی، سیاسی بدگمانیاں اور اقتصادی پریشانیاں تو اس میں نہیں شامل ہو جائیں گی، ہماری اولاد اور خاندان کا مستقبل تو نہیں مشکوک ہو جائے گا، ہم خطرے میں تو نہیں پڑ جائیں گے، یہاں تک کہ آخری درجہ یہ ہے کہ ہم الکشن جیت سکیں گے یا نہیں جیت سکیں گے، ہم کوئی عہدہ پاسکیں گے یا نہیں پاسکیں گے، ملک میں باعزت طریقہ سے زندگی گذار سکیں گے یا نہیں گذار سکیں گے۔ یہ سب خیالی چیزیں ہیں اللہ کے یہاں اس کا کوئی گذر نہیں ہے۔ "فَمِنْهُمْ مَنْ قَضىٰ نَحْبَهُ" اور ان میں سے کچھ وہ تھے جو آخری درجہ تک پہونچ گئے، جب انھوں نے اپنا وقت پورا کرلیا، تو موت کے گھات اتر گئے، شہادت کا درجہ انھوں نے حاصل کرلیا، خون کا آخری قطرہ بہادیا۔ "وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ" اور کچھ لوگ تھے جن کا ابھی وقت نہیں آیا تھا اللہ کی طرف سے۔ وہ ایک تقدیری بات ہے، موت کا وقت مقرر ہے، شہادت بھی موت ہی کی ایک قسم ہے اس کا بھی وقت مقرر ہے، ایسے واقعات ہم دیکھتے ہیں، فتوحات اور جہاد کی تاریخ میں انھوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہتھیلی پر سر رکھے ہوئے جنگ کر رہے ہیں، اس میں کسی قسم کی آڑ نہیں، ذرا بھی اس میں تردد نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ سلامت رکھتا ہے، کتنی جنگوں کو فتح کیا، اور کتنی جنگوں کا سہرا ان کے سر ہے۔ "فَمِنْهُمْ مَنْ قَضىٰ نَحْبَهُ" کچھ وہ ہیں جنھوں نے اپنا وقت پورا کردیا، اللہ نے جو وقت مقرر کیا تھا وہ وقت آگیا۔ جہاد میں آیا یا گھر پر آیا، "وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ" اور کچھ لوگ انتظار میں ہیں ان کی طرف سے کوئی کمی نہیں، وہ ہتھیلی پر سر رکھ کر پھر رہے ہیں میدان جہاد میں اور دعوت

دے رہے ہیں شہادت کو، ان کی شہادت کا وقت نہیں آیا۔ اللہ ان کو میدان جنگ سے زندہ و سلامت لے آتا ہے اپنے گھر، لیکن وہ انتظار میں ہیں، "وما بدلوا تبدیلا" انھوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی۔

ایک منشور ایک عہد نامہ

یہ ہے نمونہ ہمارے لئے اگر اس وقت ہم سے پوچھا جائے میری تمام نااہلیوں، بے عملی، تمام کمزوریوں اور گناہوں کے باوجود مجھ سے پوچھا جائے کہ اس وقت مسلمانوں کو ایک منشور اور ایک عہد نامہ چاہئے اور ایک ایسا دستور العمل جو ان کے سامنے رہے، آپ لکھ کر دے دیجئے میں لکھ کر دوں گا۔ "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْا اللّٰهَ عَلَيْهِ، فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَه وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ. وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلاً.۱".

اصل میں اسلام کیا ہے؟ اسلام صرف یہ نہیں ہے کہ صرف مسلمان کا نام رکھ دیا، یا اسلام کا طرزِ معاشرت اختیار کر لیا، صرف یہ اسلام نہیں، بلکہ اسلام ایک عہد ہے کہ اے حاضر و ناظر، اے علام الغیوب، اے خلاقِ دوجہاں! تو شاہد رہ، گواہ رہ کہ ہم شریعت کو ترجیح دیں گے طبیعت پر، شریعت کو ترجیح دیں گے رسم و رواج پر، ہم شریعت کو ترجیح دیں گے منافع پر، شریعت کے احکام کو پہلے پوچھیں گے دیکھیں گے اور اس پر عمل کریں گے، اللہ تعالیٰ نے ان چند اولوالعزم اور اعلیٰ طبقہ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مسلمانوں کی پہلی نسل کے برگزیدہ حضرات کے متعلق کہا ہے، لیکن یہ الفاظ قیامت تک کے لئے ہیں، "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا

عَاهَدُوْا اللّٰهَ عَلَيْهِ"۔ اہل ایمان وہ شیر مرد لوگ ہیں، جنھوں نے سچ کر دکھایا جس کا عہد کیا تھا یہی ہمارے لئے خدا کا حکم ہے یہی ہمارے لئے منشور ہے کہ کلمہ "لا الله الا الله محمد رسول الله" پڑھ کر ایک عہد کیا ہے ...... وہ عہد یہ ہے، اللہ اور رسول کی بات کو، اللہ اور رسول کی طرف سے آئی ہوئی بات کو، اللہ اور رسول سے مانگی اور مطالبہ کی ہوئی بات کو ترجیح دیں گے تمام حقیقی، یقینی اور متخیلہ اور ممکن الوقوع تمام خطرات پر اور نقصانات پر۔

یہ اسلام ہے، اسلام وہ ہے جو اللہ اور رسول کی طرف سے آیا۔ اس کا تعلق عقائد سے بھی ہے، معاملات سے بھی ہے، عبادات سے بھی ہے، رسم ورواج سے بھی ہے، شادی بیاہ کی رسموں سے بھی ہے، اور وراثت کے قانون سے بھی ہے، میاں بیوی کے تعلقات سے بھی ہے، اور اپنے پڑوسی کے تعلقات سے بھی ہے۔(۱)

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵ر جنوری ۱۹۹۴ء

باب ٤

دین وعبادات

"دعوت کا تعلق:-

عبادات سے بلکہ پورے دین سے -ایسا ہے جیسا کہ بارش کا تعلق نباتات سے۔
اگر بارش خوب ہوتی ہے تو نباتاب بھی خوب اگتی ہے اور
اگر بارش نہ ہو تو زمین چٹیل میدان بن جاتی ہے۔

اسی طرح:-

اگر دعوت رہتی ہے تو عبادات وغیرہ دین کے سارے شعبے قائم رہتے ہیں،
اور ساتھ ہی ساتھ ان کی روح بھی قائم رہتی ہے
جس دور میں دعوت کا سلسلہ جاری ہوتا ہے لوگوں میں دین کے جذبات پرورش پاتے رہتے ہیں۔ فرائض کو پورا کرنے کا احساس بیدار ہوتا ہے،
حقوق ادا کرنے کی فکر ہوتی ہے،
اور جب دعوت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو ان چیزوں کا نمو بھی ختم ہو جاتا ہے،

اور دین کی مثال:-

ایک سوکھے درخت کی سی ہو جاتی ہے، جو نہ پھیلتا ہے اور نہ پھولتا ہے،

لہٰذا امت میں:-

دین کو باقی رکھنے اور اس کی استعداد پیدا کرنے کے لئے بھی دعوت ضروری ہے،

دعوت کے بغیر:-

اعمال پنپ نہیں سکتے اور ان میں کونپلیں نہیں آسکتیں"۔(علی میاں ندوی)

دین مکمل مجموعہ کا نام ہے

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْناً.

(المائدہ۔ ۳)

آج میں نے تمھارے لئے دین کو کامل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی، اور تمھارے لئے اسلام کو بہ طور دین کے پسند کر لیا۔

یہ آیت کب نازل ہوئی؟

یہ حجۃ الوداع میں عرفہ کے روز جمعہ کے دن عصر کے وقت نازل ہوئی، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس دنیا میں صرف ۸۱ روز (پونے تین مہینہ سے ایک روز زائد) قیام فرمایا، صحیح روایتوں میں آتا ہے کہ ایک یہودی نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ امیر المؤمنین! آپ کی کتاب میں ایک آیت ہے، جس کو آپ پڑھتے ہیں، اگر کہیں ہم یہودیوں پر اتری ہوتی تو ہم ضرور اس دن کو تیوہار بناتے، اور اس کی یادگار منایا کرتے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آیت ایک نہیں بلکہ ہمارے دو تہواروں کے موقعہ پر نازل ہوئی، جمعہ کا دن اور عرفہ کا روز۔ دونوں بحمد للہ ہماری عیدیں ہیں۔

حقیقت میں یہ آیت اتنی ہی اہم، اتنی ہی قابلِ فخر و شکر اور ایسا ہی تاریخی یادگار ہے کہ قیامت تک اس کی یادگار منائی جاتی رہے۔

مکمل ہونے کے کیا معنی ہیں؟

مکمل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ غرض، مقصد، اصول اور ضروریات کے مطابق کوئی چیز اتنی کامل اور کافی ہے کہ کسی اضافہ کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت! اگر گنجائش نہیں ہے بلکہ ضرورت ہے تو وہ باوجود خانہ پری اور ظاہری تکمیل کے ناقص اور نامکمل ہے،...... دین کے مکمل ہونے کا یہی مطلب ہے کہ مکمل کرنے والے کے اصول اور عمل کرنے والوں کی ضروریات کے لحاظ سے بالکل مکمل ہے۔

دین مکمل مجموعہ کا نام ہے!

دین مکمل مجموعہ کا نام ہے، کل کا نام ہے، جزء کا نام نہیں،...... دین میں عقائد بھی ہیں، اعمال بھی، عبادات بھی، معاملات بھی، حقوق اللہ بھی، حقوق العباد بھی، اس میں نماز بھی فرض ہے، اور (قرآن کے مطابق) تقسیم میراث بھی۔

"وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ" (اور میں نے تم پر اپنا احسان پورا کردیا) حقیقی مسلمان پر (اور یہاں انھیں کو خطاب ہے)۔ اللہ کے بہت سے احسانات ہیں، ان میں سے سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ ایمان و اسلام نصیب کیا، یہ احسان اس کا ہے، ہمارا نہیں، چنانچہ ایک موقعہ پر فرماتا ہے:-

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوْا قُلْ لَا تَمُنُّوْا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيْمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ. (الحجرات۔۱۷)

یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا، ان سے کہو اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو، بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے، کہ اس نے تمھیں ایمان کی ہدایت دی، اگر واقعی تم (اپنے دعوئ ایمان میں) سچے ہو۔

حقیقت میں یہ خدا ہی کی دین ہے، ورنہ کتنے بڑے بڑے عالم، کیسے کیسے شریف و معقول لوگ دنیا میں موجود ہیں، اور ہر زمانہ میں موجود رہے، جن کو یہ دولت نصیب نہیں ہوئی، اور یہ اتنی آسان بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی، اگر اس پر غور کیا جائے کہ کتنے انبیاء کے آباء و اجداد، والدین، اور کتنے انبیاء کی اولاد، ابراہیمؑ کے باپ آذر اور نوحؑ کا بیٹا اس سے محروم رہے۔ تو اس ذرہ نوازی پر شادی مرگ ہو جائے، اور شکر سے سر کبھی زمین سے نہ اٹھے، یہ احسان خالی اعراب پر نہیں ہے بلکہ سارے عرب پر، تمام صحابہ پر اور ہر سچے مسلمان پر قیامت تک ہے۔ ؎

منت منہ کہ خدمتِ سلطان ہمی کنم   منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

پھر اسلام و ایمان ایک احسان نہیں بلکہ احسانات کا مجموعہ ہے، یعنی سچا اسلام عطا کیا، جانور سے انسان بنایا، اپنی پہچان اور وحدانیت عطا فرمائی، دنیا کی ہر گری پڑی چیز کی پوجا، پرستش سے بچایا، زندگی کا مقصد بتایا، انجام کی فکر دی، مرشدِ کامل (ﷺ) کا دامن پکڑایا، جہنم کے عذاب اور آخرت کی حسرت سے بچایا، دنیا اور آخرت کی نعمتوں کا مستحق بنایا۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ، فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَاناً، وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ. (آل عمران.۱۰۳)

اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی، اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہوگئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے تو خدا نے تم کو اس سے بچالیا۔

اور رسول اللہ ﷺ نے انصار کے بھرے مجمع میں فرمایا:-

"أما أتيتكم ضآلا فهداكم الله بي، وعالةً فأغناكم الله وأعداءً فألف بين قلوبكم" انھوں نے کہا، "لله ورسوله المن والفضل" بے شک اللہ ورسول کا احسان اور صدقہ ہے۔

"وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْناً" اور تمھارے لئے پسند کر چکا اسلام کو دین، تمھاری زندگی کے لئے بھی اور تمھاری موت کے لئے بھی۔

يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللهَ حَقَّ تُقَاتِهِ، وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ. (آل عمران: ۱۰۲)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جو اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور جان نہ دینا بجز اس کے کہ تم مسلم ہو۔

اور یہ وہی وصیت ہے جو ابراہیم ویعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کو فرمائی:-

يا بُنَيَّ اِنَّ اللهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ. (البقرہ:)

میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے اس دین کو تمھارے لئے منتخب فرمایا ہے لہٰذا تم بجز اسلام کے اور کسی حالت میں جان نہ دینا۔

یاد رکھو! مسلمان مرنے کے لئے، مسلمان زندہ رہنے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں، تو ہر وقت مسلمان رہنا چاہئے، اگر کسی وقت موت آجائے تو اسلام کی حالت میں! اور مسلمان زندہ رہنے کے لئے اسلامی عقائد، اسلامی رسوم، اسلامی معاشرت، اسلامی صحبت کی ضرورت ہے، ورنہ:۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَالْإِسْلَامِ دِيناً فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ، وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ. (آل عمران:)

جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے گا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔

تو جس شان اور آن بان اور احسان و امتنان کے انداز میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ:

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْناً.

اس کا تقاضہ ہے کہ ہم عقائد و عبادات کے علاوہ اخلاق و معاشرت، تہذیب و تمدن میں بھی خود کفیل اور خالص اسلامی تعلیمات، قرآنی رہنمائی اور اس کے دیئے ہوئے رہنما اصولوں اور حدود کے پابند ہوں، اور معاشرتی و تمدنی طور پر مغرب کی نقالی کے مرتکب اور اس کا سایہ بن کر نہ رہ جائیں۔

ہم کو اللہ تعالیٰ نے اصول و عقائد کے ساتھ ایک مستقل نظام معاشرت اور ممیز تہذیب و تمدن بھی عطاء فرمایا ہے۔ اور ہم کو ہر جگہ، ہر دور میں، اور ہر وقت اسی کا نمونہ پیش کرنا چاہئے(۱)۔

---

(۱) مشترک ماخوذ از (۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ ردسمبر ۱۹۶۶ء

(۲) کاروان زندگی حصہ سوم ص ۳۰۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"شروع اللہ کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔"

بسم اللہ کے اندر کیا پیغام ہے؟

سب لوگ جانتے ہیں کہ بسم اللہ کیا ہوتی ہے اور کب پڑھی جاتی ہے، لیکن بہت کم لوگوں نے غور کیا کہ بسم اللہ کے اندر کیا پیغام ہے جب کوئی اہم کام شروع کرنا ہوتا تھا تو حضور ﷺ پیغمبر اسلام، صحابہ کرامؓ، بزرگان دین اور علماء کرام سب کا طریقہ یہ تھا کہ بسم اللہ سے کام شروع کرتے۔ اور یہاں ہندوستان میں بھی آپ دیکھیں مولانا آزاد ہوں یا اور کوئی، دیش کے بڑے خدمت گذار اور اس کو آزاد کرنے والے وہ بھی بسم اللہ پڑھنے کے کتنے عادی تھے، یہاں تک کہ کھانا کھانے کے لئے بھی یہی سنّت ہے کہ پہلے بسم اللہ کی جائے پھر اسکے بعد کھانا شروع کیا جائے،اور کوئی بڑا یا چھوٹا کام کرنا ہو تو بسم اللہ کہہ کر شروع کیا جائے مگر آپ یہ سوچئے کہ جب اللہ کا نام لے کر کام شروع کیا جا رہا ہے تو اللہ کے نام تو بہت ہیں۔ "وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى" قرآن شریف میں خود آتا ہے کہ اللہ کے بڑے اچھے نام ہیں وہ جبار بھی ہے، قہار بھی ہے، طاقت والا قوی بھی ہے، توانا بھی ہے، قادر بھی ہے، اور وہ بڑے جلال والا ہے، بڑے کمال والا ہے اور بڑے جمال والا ہے، سب کچھ ہے مگر کیوں ہمیں یہ تعلیم دی گئی کہ جب ہم کام شروع کریں تو اللہ کے نام سے شروع کریں اور اس کی صفتوں میں سے یہ دو صفتیں الرحمن الرحیم۔ بڑی رحمت والا اور بڑا رحمان ہے۔

ہماری زندگی کا رخ رحمٰن کی طرف ہو

یہی مزاج بناتا ہے یہی مسلمان ہی کا نہیں انسان کا مزاج بناتا ہے کہ خدا کی صفتوں میں سے ان دو صفتوں کو خاص طور پر یاد رکھئے کہ ہم یہ کام شروع کر رہے ہیں۔ اُس خدا کے نام سے جو بڑی رحمت والا ہے، اور بڑا مہربان ہے یہاں کیا کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ہم جو کام شروع کر رہے ہیں۔ اللہ کے نام سے جو بڑا قوی ہے، بڑا توانا ہے، بڑا قادر ہے، بڑی سلطنت والا ہے، بڑی قوت والا ہے لیکن یہ الرحمٰن الرحیم کی صفت اس میں اس لئے داخل کی گئی ہے۔ تاکہ ہماری زندگی اس کے سانچے میں ڈھلے اور ہم یہ سمجھیں کہ خدا جس نے ہمیں پیدا کیا اور جو ہمیں زندہ رکھے ہوئے ہے، اور جو ایک ساتھ زندگی گزارنے کا موقع دے رہا ہے۔ ایک ملک میں ہمیں بسایا ہے اور ایک جگہ ہمیں پیدا کیا ہے، وہی کھلاتا ہے اور پلاتا ہے۔ وہ خدا جس کی یہ شان ہے وہ تو ہے ہی، لیکن "الرحمن الرحیم" بڑی رحمت والا اور بڑا مہربان اور بڑا ہی شفیق ہے۔ تو وہ اس سے ہماری زندگی کا رُخ معین کرتا ہے کہ ہماری زندگی کا رخ رحمٰن کی طرف ہو، ہم یہ سمجھیں کہ ہم جس خدا کے بنائے ہوئے ہیں جس خدا کے بندے ہیں، جو خدا ہمیں کھلا رہا ہے پلا رہا ہے، ہماری حفاظت کر رہا ہے اور پھر اس نے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ بسایا ہے۔ وہ الرحمٰن الرحیم ہے بڑی رحمت والا ہے، بہت بڑا مہربان ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی پیروی کرو، اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جو بندے اختیار کر سکتے ہیں جو Character بنا سکتے ہیں اس Character میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی ان صفتوں کو جگہ دی گئی اور اسی طرح

سورۂ فاتحہ۔ الحمدللہ رب العالمین میں کیا کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

یہ وہ چیزیں ہیں جب کوئی چیز بہت زیادہ کان میں پڑتی ہے، ہر وقت سنائی دیتی ہے، اذان ہی ہے، کیا اذان کوئی نہیں سنتا، لیکن اذان پر، اذان کے الفاظ پر، اذان کے معنی پر غور کرنے والے کتنے ہیں، کسی چیز کا علم ہونا، آسان ہو جانا، قابو میں آجانا، ہر وقت سننا اور ہر وقت اُسے دیکھنا، وہ ایک حجاب بن جاتا ہے، ایک پردہ بن جاتا ہے۔ آپ خیال کیجئے کہ الحمدللہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں وہ رب العالمین ہے سارے جہانوں کا پالنے والا ہے ایک جہاں کا نہیں، ایک ملک کا نہیں، ایک سوسائٹی یا ایک ذات کا نہیں، ایک کلاس ایک طبقہ اور ایک درجہ کا نہیں، ایک Standard کا نہیں۔ وہ تو رب العالمین ہے سارے عالموں کا ساری دنیاؤں کا پالنے والا ہے۔ ہماری دنیا، ستاروں کی دنیا، آسمانوں کی دنیا اور پھر کہاں کہاں کی دنیا، کتنے براعظم کتنے ملک، یہ سب اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سایہ کے نیچے ہیں لہٰذا ہمیں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ ہم رحمت کو، ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہونے کو، ایک دوسرے کو دیکھ کر اس کو اپنا بھائی سمجھنے کو، اس کی ضرورت پوری کرنے کو، اس کی تکلیف دور کرنے کو اور اس کے غم ورنج میں شریک ہونے کو اپنا فرض سمجھیں اور یہ سمجھیں کہ یہ خدا کی شان اور خدا کی صفتیں ہیں، ہمیں ان کو اپنا Ideal بنانا چاہئے، اپنا پیشوا اور اپنا رہنما بنانا چاہئے (۱)۔

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ۔ ۲۵ ؍ جون ۱۹۹۷ء

پوری زندگی عبادت ہے

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.
لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذَالِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ.

"(اے محمدؐ! یہ بھی) کہہ دو کہ میری نماز اور میری عبادت، اور میرا جینا اور میرا مرنا سب خدائے رب العالمین ہی کے لئے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں، اور مجھ کو اسی بات کا حکم ملا ہے، اور میں سب سے اول فرماں بردار ہوں"۔(الانعام: ۱۶۲۔۱۶۳)

عبادت کا مفہوم

اول تو عبادت کا مفہوم سمجھ لیں۔ عبادت کا مفہوم کیا ہے؟ عبادت کا مفہوم ہے کسی کام کو اللہ کی خوشی کے لئے، اللہ کے حکم کے مطابق، اجر و ثواب کی لالچ میں کرنا، ہر وہ عمل جو اللہ کی خوشی کے لئے ...... اور اتنا ہی کافی نہیں بلکہ اللہ کے حکم کے اور شریعت کی تعلیم کے مطابق، اور اگر اس میں کوئی سنت ثابت ہے تو اس کی سنت کے مطابق اس کو ادا کرنا، اجر و ثواب کی امید پر، اور اس پر جو وعدے ہیں، ان پر یقین کے ساتھ انجام دینا عبادت ہے، اور یہ بات ہر عادت کو عبادت بنا دیتی

ہے، اور یہ روح نکل جائے تو ہر عبادت خالی عادت، اور محض رسم، اور نفس کی پیروی رہ جاتی ہے(۱)۔

اللہ تعالیٰ ایک جامع چیز ارشاد فرماتا ہے کہ:-

"کہہ دیجئے (اے محمد ﷺ) "اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ." بے شک میری نماز، میری عبادت، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا، سب اللہ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے۔

پہلے مذاہب کی تقسیم

پہلے مذاہب کی تقسیم یہ تھی۔ (اللہ کی طرف سے تو نہ تھی) کہ مذاہب والوں نے اپنے انحطاط و تنزل اور انحراف کے زمانہ میں، جب مذاہب میں تحریف ہوئی اور خارجی اثرات غالب آگئے، ماحول جن قوموں سے منتقل ہو کر آئے تھے، جنھوں نے اُس دین کو قبول کیا تھا، ان کی تہذیب ان کی صنمیات، جس کو دیو مالا کہتے ہیں، MYTHOLOGY اور نسلی اثرات مذہب پر غالب آئے، تو انھوں نے مذہب میں یہ تقسیم کی، کہ عبادات تو اللہ کے لئے اور باقی زندگی میں آزاد، اس میں جیسی مصلحت ہو ویسا کیا جائے گا، جیسا قانون ہو اس پر چلایا جائے گا، اور اس میں ہم آزاد رہیں گے، اور اس میں ہماری نیت کوئی اللہ کو راضی کرنے اور خوش کرنے کی نہیں ہے، بلکہ ضرورت پورا کرنے کی ہے۔

یہاں تک کہ پھر یہ تقسیم ہوئی (جس کو مسیحی تاریخ کا یہ پرانا فقرہ ادا کرتا ہے)

---

(۱) تحفہ دین ودانش ص ۵۳

کہ جو اللہ کا ہے وہ اللہ کو دے دو، اور جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دے دو، انھوں نے مذہب میں (گویا) رسمی تقسیم کی۔ اور ظاہر ہے کہ "تلك اذاً قسمة ضیزی" کہ جب ایسی ایسی تقسیم ہوگی تو اللہ کا حصہ تو کم نکلے گا، قیصر کا حصہ زیادہ نکلے گا، اس لئے کہ اس سے واسطہ ظاہری طور پر پڑتا ہے، اور اس کا ڈر بھی رہتا ہے، معرفت صحیح نہ ہونے کی بناپر، اور اسکے جو مظاہر ہیں، طاقت کے، اور سلطنت کے، وہ سامنے ہوتے ہیں، اور اس کو راضی رکھنے میں فائدہ بھی زیادہ محسوس ہوتا ہے مادی نگاہوں سے۔

"تِلْكَ اِذاً قِسْمَةٌ ضِیْزٰی"

نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ خاص طور سے عیسائیت (جو اسلام سے پہلے کا سب سے آخری دین ہے وہ) عقائد و عبادات کے بہت تھوڑے سے حصہ میں محدود ہو کر رہ گئی، اور ساری زندگی- وہ دنیاداری بن گئی، مادہ پرستی کی، دولت پرستی کی، طاقت پرستی کی زندگی ہو کر رہ گئی۔ اور عیسائی بالکل اپنے معاشرہ میں، اپنے حدودِ عیسائیت میں (وہاں مذہب تو عیسائی تھا مگر وہ) شُتر بے مُہار ہو کر رہ گئے، جس میں فائدہ دیکھتے چار پیسے کا وہ کرتے، چاہے مذہب کے بالکل خلاف ہو، مذہب ایک نقطہ بن گیا، سمٹتا سمٹتا جیسے صفحہ پر ایک نقطہ ہو، وہ نقطہ بن کر رہ گیا، چرچ میں جائیں تو وہ عیسائی تھے، اور چرچ میں جائیں تو صرف اتوار کے دن، اور کتنی دیر کے لئے جائیں؟ اور وہاں بھی رسوم زیادہ تر ہوتیں، یوں کرو، اس طرح بیٹھو۔ اس طرح اقرار کرو۔ گناہوں کا۔ پادریوں کے سامنے اس طرح بیٹھو۔ اور گانا بجانا بھی ہو رہا ہے۔ کچھ پڑھا جا رہا ہے۔ بس۔ اور اس کے بعد وہ بالکل آزاد......!

اسلام نے اس کو پلٹ دیا

لیکن اسلام نے، حضور ﷺ نے اس کو بالکل پلٹ دیا، اور پوری زندگی کو اللہ

کی اطاعت اور اللہ کی عبودیت میں ڈھال دیا، اور اللہ کی عبودیت میں پوری زندگی کو تحلیل کر دیا، کہ اب سب کچھ اللہ کا ہے۔ غیر اللہ کا کچھ نہیں، بے شک تمھیں کھانے پینے کی آزادی حدود کے اندر کہ "قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللهِ الَّتِيْ أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ" کھاؤ پیو، حلال و پاک چیزیں، لیکن جو کام کرو، اول تو اللہ کے احکام دیکھ کر کے کرو، پھر اللہ کی رضامندی کی نیت کر کے کرو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری زندگی عبادت بن جائے گی۔

پوری زندگی کے لئے کافی ہے

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت صاف لفظوں میں کہا "اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ." کہ میری "صلاۃ" (جو عبادت کا سب سے بڑا نمائندہ ہے) میری بندگی، میرا زہد، میری قربانی، میری زندگی اور موت سب اللہ کے لئے ہے۔

یہ بہت بڑی چیز ہے، پوری زندگی کے لئے کافی ہے، کہ جن کی زندگی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبودیت میں اور اپنی محبوبیت میں ڈھال دیا تھا، بالکل اس کو خالص عبادت ہی بنا دیا تھا، وہ اللہ کا برگزیدہ بندہ کہہ رہا ہے، پھر اس کی زبان سے کہلوایا گیا قرآن مجید میں تاکہ قیامت تک کے مسلمان اس کو پڑھیں، اور اس کو اپنے لئے مشعلِ ہدایت بنائیں۔

کہ کہہ دیجئے (اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) "ان صلاتی" میری نماز، میری عبادت، "وَنُسُكِيْ" میری قربانی۔

"نُسُكِیْ" کا لفظ بھی بہت وسیع ہے، میرا زہد، میرا تقویٰ، میرا کسی چیز کو چھوڑ دینا، اور نہ کرنا، اور میری قربانی، "وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ" جینا اور مرنا، "لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" سب اللہ کے لئے ہے۔

کون سا اللہ؟ اور میں کیوں یہ کرتا ہوں؟ "لَا شَرِیْكَ لَهٗ" کوئی شریک نہیں اس کا، تو کسی میں کوئی شریک نہ ہونا چاہیے، "لَا شَرِیْكَ لَهٗ" یہاں ایک نگینہ کی طرح آگیا ہے، کہ نماز، روزہ اور کھانے پینے کو کیوں اللہ کے سپرد کرتا ہوں، اس لئے اس کا کوئی شریک ہی نہیں، اگر کوئی شریک ہوتا تو میں کہتا، کہ نماز اللہ کی اور کھانا دوسرے کا، لیکن جب اس کا کوئی شریک ہے ہی نہیں، حقیقت میں اس کا وجود ہی نہیں ہے، تو اپنی کوئی چیز دوسرے کو کیوں دوں، سب اللہ کا ہے، پھر جب وہ وحدہ لاشریک ہے تو میری زندگی بھی ایک اکائی ہونی چاہیے، میری زندگی بھی اکائیوں میں تقسیم نہ ہونی چاہیے، اور اگر زندگی سب رضائے الٰہی کے لئے ہو جائے تو وہ ایک اکائی بن جاتی ہے، اور وہ ایک اکائی ہے...... بندگی!

"لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ" فرماتے ہیں کہ مجھے اسی کا حکم دیا گیا، اور میں پہلا اس کو ماننے والا ہوں اور پہلا سر جھکا دینے والا ہوں۔

یہ آیات بہت جامع ہیں اور اپنے اندر زندگی کا پورا دستور العمل رکھتی ہیں، اور قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے مشعلِ ہدایت ہیں!(۱)

---

(۱) غیر مطبوعہ تقریر (تکیہ دائرہ شاہ علم اللہ میدان پور رائے بریلی کی مسجد میں کی گئی) محترم جناب مولانا سید بلال عبدالحیٔ حسنی ندوی صاحب نے قلمبند کر کے ہمیں عنایت فرمائی۔ (مرتب)

اخلاق ور جحانات پرنماز کا اثر

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ.

"بے شک نماز بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی ہے"۔

(سورہ عنکبوت: ۴۵)

نماز اخلاقِ رزیلہ، برائی و بے حیائی کے کاموں، اور وقتی لذت پسندی اور ہوس پرستی کو ختم کرنے میں جو تاثیر رکھتی ہے، وہ کلمۂ توحید کے سوا کسی اور چیز میں نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز انسان کا رخ تبدیل کر دیتی ہے۔ اور اس کو ایک نیا ذوق، نئی طلب اور نیا ذہن عطا کرتی ہے، وہ اس کو حقیر و پست کاموں سے نکال کر بلند کاموں کی طرف لے جاتی ہے، "تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ" اس کے دل میں ایمان کی محبت اور ایمان کا شوق پیدا کرتی ہے، اور کفر و فسق و نافرمانی کو اس کے لئے مکروہ و مبغوض بنا دیتی ہے، "تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ"!

لیکن یہ سب اسی وقت ہو سکتا ہے جب یہ نماز حقیقی ہو، "أن تعبداللہ كأنك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك" (اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے) کی کیفیت

سے سرشار ہو، اور وہ زندگی، حرارت اور قوت سے لبریز ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر چیز میں ایک چیز "لازم" اور ایک "متعدی" ہوتی ہے، "لازم" تو یہ ہے کہ اس کا عمل اسی تک محدود رہ جائے، اس سے تجاوز نہ ہو، نماز کا "لازم" یہ ہے کہ نماز میں "کأنہ" ہر اک کا منظر ہو، احسان کی صفت نماز کے اندر پیدا ہو جائے، اگر یہ (نمازی) خدا کو نہ دیکھے تو خدا اسے دیکھ رہا ہے، یہ خیال دل میں پیدا ہو جائے، یہ نماز "لازمی" ہے!

اور ایک نماز "متعدی" بھی ہے، اور وہ کس طرح؟ دو طرح سے نماز متعدی ہے، ایک نماز پڑھنے والے کے اعتبار سے متعدی ہے، اور دوسرے کے لحاظ سے بھی متعدی ہے، نماز کا تعد یہ ہے کہ "ان الصلوٰۃ تنھٰی عن الفحشاء والمنکر" نماز جب ختم ہو جاتی ہے تب بھی متعدی رہتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ نماز، نماز پڑھنے والے کو "فحشاء" سے روکتی ہے، متعدی نماز سے اس بات کی توقع ہو جاتی ہے کہ وہ نماز پڑھنے والے کو گناہ سے روکے گی، تو متعدی نماز کے لئے یہ معیار مقرر کیا ہے "ان الصلوٰۃ تنھٰی عن الفحشاء والمنکر" کہ نماز ہو تو گناہ نہ ہو، اور اگر نماز پڑھنے کے بعد نفس کی ترغیب رہی اور گناہ کی طرف چل پڑا تو یہ نماز لازمی ہے، متعدی نہیں ہے، اگر نماز پڑھنے والا گناہ سے رک گیا تو یہ نماز متعدی ہے، نماز پڑھنے والے کے اعتبار سے۔

پھر اگر نماز میں زیادہ مستعدی کی صفات ہوں تو یہ اس پر ہی انحصار نہیں ہے کہ وہ نماز خود گناہ سے روکتی ہے، بلکہ اگر نماز صحیح ہو جائے تو یہ نماز وہاں کے ماحول سے ٹکراتی ہے اور وہاں کے ماحول اور نماز کے مابین جنگ ہوتی ہے، پھر یہ نماز اصلاح،

تذکیر، محاسبہ اور احتساب پر آمادہ کرتی ہے۔

اسی لئے آپ دیکھئے کہ حضرت شعیبؑ نے جب اپنی قوم کو توحید اور تقویٰ و طہارت کی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دی، اور ظلم و حق تلفی اور ناپ تول میں کمی کے انجام سے ان کو ڈرایا تو انھوں نے حضرت شعیبؑ کی زندگی میں جستجو کی اور دیکھا کہ ان میں اور قوم میں کیا فرق ہے؟ یہ جو حلال و حرام میں، اور فساد اور صلاح میں، اور خدا کی اطاعت اور معصیت میں، اور مسئلہ و غیر مسئلہ پر فرق کو معلوم کیا، تو ان میں بعض فراست والوں نے سمجھ لیا کہ ان میں یہ چیز پیدا کرنے والی ان کی نماز ہے، وہ یہ سمجھ گئے اور کہنے لگے:-

"یَا شُعَیْبُ أَصَلٰوتُکَ تَأْمُرُکَ أَنْ نَتْرُکَ" کہ اے شعیبؑ! کیا تمھاری نماز اس سے روکتی ہے؟ اور قرآن نے ان کے اس سوال کی تردید نہیں کی۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ نماز سے یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں، یہ متعدی ہونے کا دوسرا پہلو ہے، پہلا متعدی پہلو یہ ہے کہ نماز پڑھنے والے کو بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے، پھر دوسرا متعدی پہلو یہ ہے کہ وہ نماز دوسروں کو برائی سے روکنے والی بنتی ہے، ورنہ حضرت شعیبؑ کی قوم ان کو نہ پہچانتی لیکن یہ پہچان لینا کہ اس نماز نے ہی حضرت شعیبؑ کو ہم سے الگ کر دیا ہے، یہ متعدی پہلو ہے(۱)۔

---

(۱) رمضان اور اس کے تقاضے ص ۵۲ تا ص ۵۴۔ (۲) ارکان اربعہ ص ۴۲۔ ۴۳ کے مشترک طور پر ماخوذ ہے۔

سورۂ فاتحہ کا جمال وجامعیت

اور

زندگی پر اس کا اثر

أَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

أَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۝ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۝ إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ۝. (آمین)

سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے، انصاف کے دن کا حاکم ہے، اے پروردگار ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں، ہم کو سیدھا راستہ چلا، ان لوگوں کے راستہ پر جن پر تو اپنا فضل وکرم کرتا رہا، نہ ان کے جن پر غصہ ہوتا رہا، اور نہ گمراہوں کا۔

ایک بے مثال شہ پارہ

یہ سورہ آسمانی معجزات کا ایک لعلِ بے بہا، اور قرآن مجید کی آیاتِ بینات کا ایک بے مثال شہ پارہ ہے، اگر ساری دنیا کے ذہین اور ساری قوموں کے ادیب و

انشاء پرداز، ماہرینِ نفسیات، معلمینِ اخلاق اور روحانی پیشوا یکجا ہو کر کوئی ایسا مضمون تیار کرنا چاہیں جو تمام انسانی طبقات کے لئے ان کی ضرورتوں اور خواہشات کے اختلاف کے باوجود کافی ہو، اور وہ اس کے ذریعہ اپنی عبادتوں میں اپنے مافی الضمیر کو مکمل طور پر ادا کر سکیں تو وہ سورۂ فاتحہ جیسا مضمون تیار نہیں کر سکتے جو ہر انسانی گروہ اور فرد کی تسکین کیلئے کافی ہے...... اس سورہ کے متعلق ارشادِ ربانی ہے:-

وَلَقَدْ آتَيْنٰكَ سَبْعاً مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْآنَ الْعَظِيْمِ. (حجر۔۸۷)

اور بالیقیں ہم نے آپ کو (وہ) سات آیتیں دیں (جو) مکرر (پڑھی جاتی ہیں) اور قرآن عظیم (دیا)۔

"حمد" بہترین وسیلہ ہے

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ جوشکر وتعریف کا جامع کلمہ ہے، اور ان معجزانہ اور بلیغ کلمات میں سے ہے، جن کا کسی اور زبان میں صحیح ترجمہ بے حد مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

"حمد ہی وہ بہترین وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ایک وفاشعار اور محسن شناس بندہ اپنی دعاو مناجات کا آغاز اور اس مقامِ محمود اور قیام و سجود (نماز) کا افتتاح کر سکتا ہے۔

پھر نمازی یہ محسوس کرتا ہے کہ جس رب کی وہ حمد و ثنا بیان کر رہا ہے اور جس کی عبادت میں مشغول ہے، وہ صرف کسی قبیلہ اور قوم، کسی خاندان اور برادری، اور کسی ملک و وطن کا رب نہیں، بلکہ "رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ" ہے۔

دو وحدتوں کا اعلان

یہ انقلاب آفریں اور نیا عقیدہ ان تمام مصنوعی اور خود ساختہ تقسیموں کے

خلاف اعلانِ جنگ ہے، جنھوں نے انسانیت پر ظلم عظیم کیا ہے۔ اس طرح مسلمان دو وحدتوں کا اعلان کرتا ہے اور ان ہی دونوں وحدتوں پر انسانی معاشرہ کے امن و سکون کی بنیاد ہے اور انھیں دونوں ستونوں پر اسلام انسانیت کی تعمیرِ نو کا کام انجام دیتا ہے۔ ایک نوعِ انسانی کے خالق و صانع کی وحدت اور ایک نسلِ انسانی کے بانی و مورث کی وحدت، اس طرح رنگ و نسل اور ملک و وطن کی تفریق کے بغیر نسلِ انسانی کی وحدت ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ہر انسان دوسرے انسان سے دوہرا رشتہ رکھتا ہے، ایک روحانی اور حقیقی طور پر- وہ یہ کہ ان سب کا رب ایک ہے! دوسرے جسمانی و ثانوی طور پر-وہ یہ کہ وہ سب ایک باپ (آدم) کی اولاد ہیں!

يٰأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْرًا وَّ نِسَاءً. وَاتَّقُوْااللّٰهَ الَّذِىْ تَسَاءَ لُوْنَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ. إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً.

(سورہ نساء-۱)

اے لوگو! اپنے پروردگار سے تقویٰ اختیار کرو جس نے تم (سب) کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور ان دونوں سے بکثرت مرد اور عورتیں پھیلا دیئے، اور اللہ سے تقویٰ اختیار کرو جس کے واسطے تم ایک دوسرے سے مانگتے ہو، اور قرابتوں کے باب میں بھی (تقویٰ اختیار کرو) بیشک اللہ تمھارے اوپر نگراں ہے۔

يٰأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّ أُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا إِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ. (سورہ حجرات-۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور مختلف قومیں اور خاندان بنا دیئے ہیں کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، بیشک تم میں سے پرہیزگار اللہ کے نزدیک معزز تر ہے، بے شک اللہ خوب جاننے والا ہے، پورا خبردار ہے۔

اس حکم اور اصول کی شرح و تفصیل میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:-

"اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کا تعصب اور آباء و اجداد کا فخر تم سے دور فرما دیا ہے، اب صرف (دو قسم کے لوگ ہیں) پرہیزگار مسلمان یا بدنصیب فاسق و فاجر، سب انسان آدم کے بیٹے ہیں، اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے، کسی عربی کو عجمی پر فضیلت حاصل نہیں، مگر تقویٰ کے ساتھ"۔ (ترمذی)

صفت رحمت کا استحضار

نمازی اللہ تعالیٰ کی ان بہترین صفات کریمہ میں سے جن پر وہ پہلے ہی ایمان لا چکا ہے، سب سے پہلے اس کی صفتِ رحمت کا استحضار کرتا ہے۔ (الرحمن الرحیم) اس لئے اس موقع اور محل کے لئے اس سے بہتر صفت کوئی اور نہیں ہو سکتی، یہ وہ موقعہ ہے جب مسلمان خشوع و عبادت، دعا و ابتہال، توبہ و انابت اور احتیاج و فقر کا استحضار کرتے ہوئے خدا کے حضور سر بسجود ہوتا ہے۔ یہ امید اور خوش گمانی کا موقع ہے، نہ کہ ناامیدی و بدگمانی کا۔

اس کے بعد وہ آخرت اور جزاء و سزا کا دن (ملك يوم الدين) یاد کرتا ہے۔ وہ دن جس میں اللہ تعالیٰ کی حکومتِ مطلقہ اور اقتدار اعلیٰ اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہوگا، اور کسی بادشاہ، امیر اور وزیر کو اس کے حضور میں دم مارنے کا یارانہ ہوگا۔ "لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ، لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ" آج کے روز کس کی حکومت ہے؟ بس اللہ واحد و غالب ہی کی ہے۔ (سورہ مؤمن۔ ۱۶)

اس وقت وہ اپنے دل میں آخرت کے ایمان کو از سر نو تازہ کرتا ہے، جو ہر

خوف، باز پرس کے ڈر اور نفس اور ضمیر کی نگرانی کا سر چشمہ ہے، ایک مسلمان کو جو ترغیبات سے بھری ہوئی دنیا میں رہتا ہے اس ایمان اور یقین کی جو شدید ضرورت ہے، اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

پھر وہ عربی زبان کے (جس میں قرآن مجید نازل کیا گیا اور جس کو نماز کی عالمی اور سرکاری زبان قرار دیا گیا) پورے زور اور کلام اور بلیغ انداز میں کہتا ہے کہ "وہ نہیں عبادت کرتا کسی کی سوائے اللہ کے، اور نہیں مدد چاہتا کسی سے سوا اس کے" "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ".

عبادت واستعانت

زندگی دراصل عبادت و استعانت کا دوسرا نام ہے، اسی سے ایک انسان دوسرے انسان سے، کمزور کا طاقتور سے، غریب کا امیر سے، محکوم کا حاکم سے، اور عابد کا معبود سے رشتہ قائم ہوتا ہے، اگر یہ دونوں صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص کر دی جائیں تو زندگی کے سارے بندھن اور آہنی زنجیریں خود بخود پاش پاش ہو جائیں گی، اور شرک اور دوسرے تمام فتنے ختم ہو جائیں گے، وہ یہ سب سے بڑا معاہدہ اور اعلان ہے جو مسلمان اپنے خدا سے دن رات میں بار بار کرتا ہے، اس کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، نماز سے باہر زندگی کا سارا نظام اس کو دو چیزوں پر ہمہ وقت مجبور کرتا ہے، ایک خضوع و استکانت پر، دوسرے سوال و استعانت پر، اور یہی وہ دو چیزیں ہیں جن کے خلاف وہ پہلے ہی بغاوت کر چکا ہے۔

ہدایت کی دعاء

پھر وہ اللہ تعالیٰ سے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کی دعا کرتا ہے "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" یہ وہ ہدایت ہے جو اس کی سب سے بڑی ضرورت ہے، اور جس کے دم سے جنت کی رونق قائم ہے، وہ ہدایت جس سے محروم ہو جانے کے بعد کسی چیز کی کوئی قیمت نہیں، اور اس سے بہرہ اندوز ہونے کے بعد کسی چیز کے چھوٹنے کا کوئی غم نہیں، اس کی طلب و جستجو انسان کی فطرت میں داخل اور اس کی آرزو قلب و روح میں پیوست ہے۔

لیکن یہ ہدایت خلا میں قائم نہیں ہو سکتی، یہ اسی وقت قابلِ فہم اور قابلِ عمل ہو سکتی ہے، جب اس کے زندہ اور عملی نمونے ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں، یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم تاریخ انسانیت میں انبیاء و صدیقین، شہداء و صالحین کے نام سے یاد کرتے ہیں، ﴿أُوْلٰئِكَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ﴾ قرآن مجید اور تمام گذشتہ آسمانی صحیفوں نے دنیا کے عام انسانوں کو ان کی پیروی و تقلید، ان کی محبت و اطاعت، ان کی جماعت میں شمولیت اور ان کی طرف اپنا انتساب کرنے کی دعوت دی ہے۔

أولئك الذين هدى الله فبهداهم اقتده. (سورہ انعام ـ ۹۰)

یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی تھی، سو آپ بھی ان کے طریقہ پر چلئے۔

اور اسی کے ساتھ ان لوگوں سے برأت اور بے تعلقی کا مطالبہ کیا ہے جو ہدایت کی راہ سے ہٹ کر ناشکری، ہوا پرستی اور تباہی و خودکشی کے راستہ پر پڑ گئے، جنھوں

نے سرکشی اور انتہا پسندی کی حد کر دی، اور غضب الٰہی کے مورد قرار پائے، یا دین میں تحریف، تفریط اور ترمیم و تنسیخ کے مرتکب ہوئے، اور کھلی ہوئی گمراہی کے شکار ہوئے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ.	چلا ہم کو سیدھا راستہ، ان لوگوں کا راستہ جن پر تونے انعام کیا ہے، نہ ان لوگوں کا (راستہ) جو زیرِ غضب آچکے ہیں، اور نہ بھٹکے ہوؤں کا۔(۱)

قرآن مجید کا کھلا اعجاز

یہاں پر قرآن مجید کا کھلا اعجاز معلوم ہوتا ہے، تاریخ و مذاہب و ادیان کا ایک انصاف پسند طالب علم اگر صرف اس ایک جملہ پر ایمان لے آئے کہ صحرا میں پیدا ہونے والے اور صحرا میں زندگی گزارنے والے ایک اُمّی پیغمبر (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی زبان سے کتنی بڑی تاریخی حقیقت ادا کی گئی ہے کہ مسیحیت کے پیروؤں کو "ضآلین" کے وصف ولقب سے مخصوص کیا گیا ہے، یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس پر خود تاریخ ادب سے اپنا سرخم اور پورا تاریخی ذخیرہ سرافگندہ ہو کر اس کی تصدیق کرتا ہے اور مؤرخین حیران ہو کر رہ جاتے ہیں۔

میں آپ کی توجہ اس لسانی تجربہ پر مبذول کرتا ہوں کہ جو الفاظ دوسری زبانوں میں منتقل ہوئے ہیں، بعض اوقات ان کی طاقت اور ان کے اپنے مفہوم کے ادا کرنے میں فرق واقع ہو گیا ہے، الفاظ کا بھی تاریخی سفر ہوتا ہے، جیسے انسانی قافلوں، تہذیبوں اور افکار انسانی کا تاریخی سفر ہے، جب وہ سفر طے کرتے ہیں تو اپنی بہت سی تازگی کھو دیتے اور بہت سے خارجی و مقامی اثرات قبول کر لیتے ہیں،

(۱) ارکان اربعہ ص ۵۷۔۶۱

اردو میں بھی عربی کے بہت سے الفاظ ہیں جن کو اپنے صحیح مفہوم و معنیٰ میں سمجھنا مشکل ہو گیا ہے، اور ان میں وہ زور و قوت باقی نہیں رہی جو اصل زبان میں تھی۔

ان میں ایک لفظ "ضلالت" بھی ہے۔ "ضلالت" کو ہر طرح کے فسادِ عقیدہ، ہر درجہ کے فسادِ عمل، معمولی انحراف، اور چھوٹی بڑی غلط فہمی کے معنیٰ میں لیا جاتا ہے، لیکن لسانیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جیسے اشیاء اور خارجی موجودات کا درجۂ حرارت (Temperature) ہوتا ہے، ویسے ہی الفاظ کا بھی ایک ٹمپریچر ہوتا ہے، اور جیسے اجسام کا ایک سائز ہوتا ہے، الفاظ کا بھی ایک سائز ہوتا ہے۔

حیرت انگیز بات ہے کہ جس برگزیدہ ہستی نے مسیحیت کی تاریخ نہیں پڑھی تھی، اس کے لئے کوئی ذرائع معلومات نہیں تھے، اور جس کا ایک مسیحی ملک میں جانا صرف چند دن کے لئے، اور کسی مسیحی سے ملنا چند منٹوں کے لئے ثابت ہے اس کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت ادا کی ہے، کہ یہودیوں کے لئے "**المغضوب علیھم**" کا لفظ استعمال کیا ہے، اور عیسائیوں کے لئے "**ولا الضآلین**" کا لفظ آیا ہے۔

تنہا یہ لفظ قرآن مجید کے منزل من اللہ اور وحی الٰہی ہونے کے لئے کافی ہے، مسیحیوں کے لئے دس الفاظ استعمال کئے جا سکتے تھے، عربی جیسی وسیع زبان میں پچاس لفظ ہو سکتے تھے اور سب منطبق ہوتے، لیکن اس میں ایک کھلا ہوا فرق رکھا گیا ہے، یہود کے لئے "**المغضوب علیھم**" کا لفظ آیا ہے۔

یہود کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ "**المغضوب علیھم**" (غضب الٰہی کے مورد و مستحق) ہیں، انھوں نے انسانی اخلاقیات و رجحانات، انسانی کردار و عمل اور معاشرۂ انسانی پر جو سلبی اور انتشار انگیز اثرات ڈالے ہیں، اور صدیوں تک تاریخ انسانی میں

تخریبی و سازشی کردار ادا کیا ہے، ان کے ساتھ خدا کا جو معاملہ رہا ہے، اور ان میں ہر دور میں جس طرح کی بغاوت اور جس طرح کی سرکشی پیدا ہوئی ہے، انھوں نے جس طرح اپنے آپ کو خدا کی برکتوں اور نصرتوں سے محروم کیا ہے، ان کے لئے ''المغضوب علیھم'' سے زیادہ کوئی اور لفظ موزوں نہیں(۱)۔

اور یہ بھی قرآن کریم کا معجزہ ہے کہ اس نے عیسائیوں کے لئے ''الضآلین'' کا لفظ استعمال کیا ہے! ''ضآلین'' کے کیا معنیٰ ہیں؟ آپ کلکتہ جانا چاہتے ہوں اور دہلی جانے والی گاڑی پر بیٹھ جائیں، اس کو کہتے ہیں راستہ بدل دینا اور پھر اسی راستہ پر چلتے رہنا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی جتنا زیادہ چلتا ہے، منزلِ مقصود سے اتنا ہی دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

عیسائیت تیز چلی اور اب تو ہوائی جہاز پر جا رہی ہے (ہوائی جہاز بھی اسی کے پیرووں کی دین ہے) تو یہ عیسائیت صرف زمین کے رقبہ میں نہیں، اپنے مذہبی اور دینی سفر میں بھی ہوائی جہاز کی رفتار سے چلی، یعنی چل کر منزلِ مقصود سے دور نہیں بلکہ اڑ کر دور ہوئی۔ آج کی موجود مسیحیت بالکل دوسری مسیحیت ہے، جس کو سینٹ پال کا تحفہ اور اس کی دین کہنا چاہئے!(۲)۔

---

(۱) نبی خاتم ودین کامل ص ۱۵۔۱۸(۲) ''خلفائے اربعہ کی ترتیب خلافت میں قدرت وحکمت الٰہی کی کارفرمائی'' ص ۱۷۔۱۸

رمضان المبارک کا پیغام

يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ.

''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے قبل ہوئے ہیں، عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ!'' (البقرہ۔ ۱۸۳)

قرآن کریم کی یہ وہ آیت ہے جس سے رمضان المبارک میں روزہ کی فرضیت کا اعلان ہوا، اور تمام مسلمانوں کو، اُس زمانہ کے مسلمانوں کو اسی آیت سے علم ہوا، اور قیامت تک یہی آیت اس کی دلیل رہے گی، اس میں کچھ باتیں ہیں سوچنے اور غور کرنے کی، نکتہ کی ہیں، پہلے ہم اس کا ترجمہ کریں گے، پھر ایک خاص بات کی طرف اشارہ کریں گے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:- اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو۔

پہلے ایمان کا تذکرہ کیا گیا

اس خطاب میں بھی بڑی بلاغت و حکمت ہے، کہ ایک ایسی چیز جو نفس پر شاق اور دشوار ہے، جس کے لئے بڑی ہمت کی ضرورت ہے، اس کی بنیاد ایمان

کو بنایا گیا، اسی لئے پہلے ایمان کا تذکرہ کیا گیا، کہ اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو، اللہ تعالیٰ کی تمام باتوں کو قبول کرنے کا عہد کر چکے ہو، اور دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے ہو اور اپنے کو اللہ کے حوالہ کر چکے ہو، کہ وہ ہمارا مالک ہے، ہمارا حاکم ہے، جو حکم دے گا ہم اس پر عمل کریں گے، اس سے مطلب نہیں کہ اس میں کچھ مزہ ملے گا یا نہیں، دنیا میں فائدہ ہوگا یا نہیں، وہ آسان ہے یا مشکل ہے، ایک بات ہے یا دس بات ہیں، ایک مرتبہ کرنا ہوگا، دس یا بیس مرتبہ کرنا ہوگا، سو پچاس مرتبہ کرنا ہوگا، اس سے کوئی بحث نہیں، جب ہم نے اللہ کی غلامی قبول کرلی، اس کی عبودیت کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا، اور اعلان کر دیا کہ ہم تو حکم کے بندے ہیں جو وہ حکم دے گا ہم اسی پر عمل کریں گے، اس لئے یہ اللہ تعالیٰ کی حکیم ذات ہی اس حکم کو اس طرح شروع کر سکتی ہے، ورنہ دنیا کے جو قوانین ہیں، جن باتوں کا حکومتیں اعلان کرتی ہیں، اور جو نئے نئے قوانین بنتے ہیں، اور جو نئی نئی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، ان کے لئے کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ کروگے تو بچ جاؤ گے، اس پر عمل نہ کروگے تو سزا پاؤ گے، بس، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، حالانکہ وہ حاکم مطلق ہے، زمین و آسمان کو پیدا کرنے والا ہے، اور سب کی زندگیاں، سب کی جانیں، سب کی عزتیں اسی کے قبضہ میں، کسی طرح کہہ دیتا، کہہ سکتا تھا، اس کا حق تھا، لیکن اس نے کہا:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا — اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو۔

تو اللہ تعالیٰ نے ہم تمام مسلمانوں کی قوت ایمانی کو آواز دی ہے، قوت ایمانی کو جگایا اور اس کو بنیاد بنایا ہے، اے وہ لوگو! جو اس بات کا عہد کر چکے ہو کہ ہمیں تو

بات ماننا ہے، ہم تو حکم کے بندے ہیں۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ. تم پر روزے فرض کئے گئے، جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے۔

روزے کی فرضیت میں انسانی فطرت کی رعایت

یہ انسان کی فطرت ہے، اللہ تعالیٰ فطرت انسانی کا بنانے والا اس کا خالق ہے، اس کی رعایت کرنے والا بھی ہے، کسی مجبوری سے نہیں، اپنی حکمت سے بھی، اپنی رحمت سے بھی، کہ جب وہ کسی بات کا حکم دیتا ہے، تو اس بات کے لئے زمین تیار کر دیتا ہے تاکہ انسان اس کو آسانی سے قبول کر سکے، اس لئے انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کو انوکھی اور نرالی معلوم دیتی ہے، اس سے گھبراتا ہے اور چونک اٹھتا ہے، اچھا یہ بھی کرنا ہوگا؟ لیکن جب اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ہوتا آیا ہے، لوگ کرتے آئے ہیں، تو پھر وہ اس کو سنتا ہے، خوشگواری کے ساتھ مانتا اور آسانی کے ساتھ تابع داری کرتا ہے۔

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض تھے، چنانچہ مذاہب اور اخلاقیات کی تاریخ، اور قوموں اور ملکوں کی تاریخ سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ ہر مذہب میں کسی نہ کسی شکل میں روزہ رہا ہے، مذہبی اور تاریخی کتابوں میں تفصیل موجود ہے، کہ اس کی کیا شکل اور کیا تعداد تھی، کیا وقت تھا، کہاں سے شروع ہوتا تھا، کیا پابندیاں تھیں، یہ ایک علمی تاریخی مسئلہ ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

تقوے کا صحیح مفہوم

یہاں ایک بات کی طرف توجہ دلائی ہے، جب کسی زبان کا لفظ کسی زبان میں آتا ہے تو اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے اصلی معنیٰ کھو دیتا ہے، اور اس کے ساتھ ذہن کے سوچنے کے بہت سے طریقے لگ جاتے ہیں، انہی میں سے ایک لفظ "تقویٰ" اور متقی کا ہے، ہمارے یہاں متقی کے معنیٰ ہیں، بڑا عبادت گزار، راتوں کو بہت کم سوتا ہو، اور نہ سوتا ہو تو اور زیادہ متقی ہے، اور نہ کھاتا ہو، اور اگر وہ مسلسل عبادت کرتا ہو، تو اور بڑا متقی ہے، اور کثرت سے نماز پڑھتا ہو، نماز ہی میں اس کا دل لگتا ہو، جب دیکھو نماز پڑھ رہا ہے تو اور بڑا متقی ہے اور ذرا ذرا سی چیز میں شبہ سے بچتا ہو، متقی ہے! لیکن عربی میں جہاں سے یہ لفظ آیا ہے، "تقویٰ" کے معنی زیادہ عبادت گذار اور زیادہ شب بیدار کے نہیں ہیں، کہ بڑا عبادت گذار، شب بیدار، دن کو روزے رکھنے والا، رات کو عبادت کرنے والا، نمازیں پڑھنے والا ہے بلکہ عربی زبان میں "تقویٰ" ایک مستقل صفت کا نام ہے، تقویٰ عبادت کا نام نہیں، تقویٰ خوف کا نام ہے، تقویٰ تلاوت یا تسبیح کا نام نہیں، تقویٰ ایک مستقل صفت ہے، تقویٰ ایک مزاج ہے، تقویٰ ایک ملکہ ہے، تقویٰ ایک طبیعت ہے، رمضان تو اس لئے آتا ہے کہ ہم کو متقی بنائے "لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ" دیکھنے میں یہ چھوٹا کلمہ ہے، اور اگر کہا جائے تو بھی یہ چھوٹا سا کلمہ ہے، ورنہ تو قرآن کا چھوٹا کلمہ بھی معجزہ ہے، تو اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رمضان ہے تو تقویٰ ہے، اور رمضان گیا تو اب وہ تقویٰ نہیں ہے، اس کا نام تقویٰ نہیں ہے۔

"تقویٰ" کے معنیٰ ہیں لحاظ و شرم کی عادت، پاس و لحاظ کی عادت پڑ جانا، مثلاً یہ کہ کوئی بچہ ہے، اس کو اگر صحیح تعلیم دی گئی ہے، اسے اچھا ماحول ملا ہے، اور اس کی صحیح تربیت کی گئی ہے تو بڑوں کا ادب کرنے لگتا ہے، بڑوں کا ادب کے کیا معنیٰ ہیں کہ بڑوں کے سامنے کوئی ایسا کام، ایسی حرکت نہیں کرے گا جو بے ادبی میں شمار ہو، جس سے ان بڑوں کی توہین ہوتی ہو یا اُن بڑوں کا مذاق اُڑتا ہو، یا حقارت ہوتی ہو، تو کہا جائے گا اس لڑکے کو بڑا پاس و لحاظ ہے، ادب سیکھ گیا ہے، ایسے ہی طالب علم کا ادب و لحاظ، ایسے ہی مرید کا ادب و لحاظ، ایسے ہی ملازم کا ادب و لحاظ، تو تقویٰ کے معنیٰ ہیں ادب و لحاظ کے، کہ کرنے سے پہلے یہ سوچنا کہ یہ کام کیسا ہے، اس کو خوش کرنے والا ہے یا ناراض کرنے والا ہے، اور اگر دین کے دائرہ میں دیکھئے، تو یہ دیکھنا کہ دین و شریعت کے مطابق ہے یا نہیں اس کی عادت پڑ جانا، یہ ہے تقویٰ! چنانچہ اس کی دلیل ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو فاروق اعظم اور امیر المومنین ہیں، اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد صحابہ کرامؓ میں سب سے بڑا درجہ انھیں کا ہے، مسلمانوں کے خلیفہ تھے، امیر المومنین تھے، قرآن مجید ان کے سامنے ہی نازل ہوا اور پھر اہل زبان ہیں، اور اہل زبان بھی کیسے ہیں کہ اس زمانہ کی ٹکسالی زبان جو ہر زمانہ میں معتبر رہے گی، سکّہ رائج الوقت کی طرح، وہ وہیں پلے بڑھے، وہی زبان بولنے والے اور صحابہ کرام وہ تھے کہ کسی چیز کے پوچھنے میں ان کو کوئی شرم نہیں آتی تھی، وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ اپنے علم کو صحیح کریں، اور بڑھائیں، تو انھوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود کا نام لے کر کہا، یہ بتاؤ کہ "تقویٰ" کسے کہتے ہیں، تو انھوں نے کہا امیر المومنین! آپ ایسے راستہ چلے

ہیں، کہ دونوں طرف کانٹوں کی باڑھ لگی ہو، (ادھر بھی کانٹوں کی قطار ادھر بھی کانٹوں کی قطار ہے) اور راستہ تنگ، حضرت عمرؓ نے فرمایا ہاں! ایسا اتفاق ہوا ہے، انھوں نے کہا، پھر آپ نے کیا کیا؟ حضرت عمر نے فرمایا، دامن سمیٹ لیا، آستین وغیرہ دیکھ لی کہ کہیں کانٹوں میں پھنس نہ جائے، کہا: یہی تقویٰ ہے! کہ زندگی اس طرح گذاری جائے، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی کام ایسا کر بیٹھے جو خدا کو ناراض کرنے والا ہو، مسئلہ کے خلاف ہو، ناجائز ہو، تو اس آیت میں جس میں بہت سے لوگ غور نہیں کرتے کہ عربی زبان کے مزاج سے واقف نہیں ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ روزے اس لئے فرض کئے گئے کہ ہم متقی بن جائیں، کہ جو ۲۹ دن یا ۳۰ دن روزے رکھے گا رمضان ختم ہو گیا، عید کا چاند نکلنے لگا، تو وہ متقیوں میں ہو گیا، "اللہ اکبر" کہ جس نے دن کو روزہ رکھا، کچھ کھایا نہیں، اور کئی کئی قرآن شریف ختم کئے، رات میں عبادت کی اور تراویح سنی، یہ متقی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امتحان میں پاس ہو گیا چھٹی ملی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ رمضان کے مہینہ میں حلال، پاک طیّب چیزیں رمضان کے دن کے اوقات میں اللہ کے حکم سے، اللہ کی مرضی سے پاک وصاف چیزیں چھوڑیں، ایک دن دو دن نہیں، ۲۹ دن ۳۰ دن پانی نہیں پیا، حالانکہ پانی سب سے بڑی نعمت ہے۔

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ اللہ جل شانہ فرماتا ہے کہ ہم نے پانی ہی سے ہر زندہ چیز پیدا کی ہے۔

اور کھانا نہیں کھایا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دیا تھا، گھر میں وہ چیزیں موجود تھیں حلال کمائی سے تھیں، لیکن نہیں کھایا، کیوں نہیں کھایا، کیوں نہیں پانی پیا، وہ چیزیں

جو انسان بہ حیثیت انسان کے اور بشری تقاضوں کے کرتا ہے، تعلقات بھی اس میں ہیں، تصرفات بھی اس میں ہیں، اس میں اعمال بھی ہیں، یہ سب چیزیں ہم نے چھوڑ دیں محض اللہ کے حکم سے، کہ اللہ تعالیٰ نے صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک حلال و پاک چیزوں کے استعمال سے بھی روکا ہے، کہ تمھارے حلق سے پانی کا ایک قطرہ نہ اترنے پائے، تمھارے حلق میں کھانے کا ایک دانہ نہ جانے پائے، تو جب ہم نے اللہ کے حکم سے یہ پاک وطیّب چیزیں چھوڑی ہیں تو اب جب رمضان المبارک ختم ہو گیا، تو اس سے یہ بات بھی ہم پر واضح ہو جانی چاہئے کہ جو ناپاک چیزیں ہیں اور ناپاک کیا ہیں؟ ہم آپ سمجھتے ہیں کہ جسے گندگی لگ جائے، گندی چیز پڑ گئی، وہ ناپاک ہو گئی جب کہ سب سے بڑی ناپاک چیز گناہ، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔

تو جس طرح ہم نے اللہ کے حکم سے رمضان کے دنوں میں حلال و پاک طیّب چیزیں چھوڑیں تو اسی اللہ کے حکم سے غیر رمضان کے دنوں میں گناہوں کا ارتکاب کیسے کریں، ہم اللہ کو ناراض کرنے والی چیزیں کیوں کر گذریں، ہم جھوٹ کیوں بولیں، ہم جھوٹی گواہی کیوں دیں؟ ہم کسی مسلمان کی دل آزاری کیوں کریں، ہم کسی کا حق کیوں ماریں، ہم بہتان کیوں لگائیں، ہم چوری کیوں کریں، ہم ظلم کیوں کریں، ہم کسی کا خون کیوں بہائیں، ہم کسی کا دل کیوں توڑیں، بس ساری چیزیں جو آپ جانتے ہیں، ان چیزوں سے بچنے کی عادت، خیال، دھیان پیدا ہو جائے، یہ ہے تقویٰ!

''تقویٰ'' مزاج کا نام ہے، تقویٰ عبادت کا نام نہیں ہے

عبادت اور ہے اور تقویٰ اور ہے، تقویٰ مزاج کا نام ہے۔ انسان عبادت تو کر

رہا ہے لیکن معاملات میں اور غصہ کی حالت میں اور دنیاوی حالات میں انسانی عبادت دھری کی دھری رہ جاتی ہے، تو اس کا نام تقویٰ نہیں ہے، اسی طرح صرف طاعات میں لگنا، معصیت سے بچنا، یہ "تقویٰ" نہیں ہے، بلکہ تقویٰ یہ ہے کہ "مزاج" بن جائے، روزہ فرض اس لئے کیا گیا ہے تاکہ تمھارے اندر صفتِ تقویٰ آجائے "لعلکم تتقون" کہا، لعلکم تعبدون یا لعلکم تشکرون یا لعلکم تحتجون نہیں کہا، بلکہ یہ کہا "لعلکم تتقون" کہ عبادت میں لگنا یہ کسی مصلحت پسندی یا نفس پرستی کا نہ ہو، بلکہ اللہ سے شرم کرنا، یہ تمھارا مزاج اور طبیعت بن جائے۔

تو "تقویٰ" کے معنیٰ ہیں لحاظ و شرم کی عادت، پاس و لحاظ کی عادت پڑ جانا، کہ کرنے سے پہلے یہ سوچنا کہ یہ کام کیسا ہے؟ خدا کو خوش کرنے والا ہے یا ناراض کرنے والا، اور اگر دین کے دائرہ میں دیکھئے تو یہ دیکھنا کہ دین و شریعت کے مطابق ہے یا نہیں؟ جائز ہے یا ناجائز؟ اللہ اور اس کے رسولؐ کے فرمان کے مطابق ہے یا نہیں؟ اس کی عادت پڑ جانا، یہ ہے تقویٰ، اور یہی "لعلکم تتقون" کا مفہوم ہے(۱)۔

---

(۱) (۱) تعمیر حیات ۲۵؍فروری ۱۹۹۲ء۔ (۲) ارکان اربعہ ص ۲۵۷ تا ص ۲۵۹ (۳) رمضان اور اس کے تقاضے (از حضرت مولانا مد ظلہ) ص ۳۳۔ ۳۴۔ ۴۵۔ ۵۱) سے مشترک طور پر ماخوذ ہے۔

عید الفطر کا پیغام

﴿یُرِیْدُاللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ وَلِتُکْمِلُوْا الْعِدَّةَ وَلِتُکَبِّرُوْااللّٰهَ عَلٰی مَا هَدَاکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ. وَاِذَا سَأَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْن.﴾

"اللہ تمھارے حق میں سہولت چاہتا ہے، اور تمھارے حق میں دشواری نہیں چاہتا، اور یہ (چاہتا ہے) کہ تم شمار کی تکمیل کر لیا کرو، اور یہ کہ تم اللہ کی بڑائی کیا کرو، اس پر کہ تمھیں راہ بتادی، عجب نہیں کہ تم شکر گزار بن جاؤ، اور جب آپ سے میرے بندے میرے باب میں دریافت کریں تو میں تو قریب ہی ہوں، دعا کرنے والے کی دعاء قبول کرتا ہوں، جب وہ مجھ سے دعاء کرتا ہے، پس لوگوں کو چاہئے کہ میرے احکام قبول کریں، اور مجھ پر ایمان لائیں، عجب نہیں کہ ہدایت پا جائیں"۔

یہ سورۂ بقرہ کی وہ آیتیں ہیں، جن کا تعلق رمضان المبارک سے ہے، اور جن کی ابتدا ہوتی ہے "یٰأَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ" اور اسی میں یہ آیت ہے "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدیً لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ"۔

اس میں اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے، اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، اُس کا منشا اور ارادہ تمھارے ساتھ آسانی کا ہے، "وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ" وہ تم کو مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا، یہ ۳۰ یا ۲۹ دن کے جو روزے ہیں کوئی پہاڑ نہیں ہیں، یہ مسلسل چلتے ہیں اور جلد ختم ہو جاتے ہیں، اس کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے، "وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدَاکُمْ" اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو، اس پر کہ اللہ نے تم کو ہدایت دی، اللہ نے ہدایت کی جو نعمت تم کو عطا فرمائی ہے، اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو۔ "وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ" اور تاکہ تم شکر کرو۔

اس آیت میں عید کا بھی ذکر کر دیا

اللہ جل شانہ نے اس آیت میں عید کا بھی ذکر کر دیا، عید کا نام تو نہیں آیا، لیکن عید کا منشا، عید کا مقصد، اور عید کا وظیفہ، عید میں کرنے کا کام، یہ سب اس میں آگیا، کہ جب اللہ تعالیٰ رمضان میں روزہ کی توفیق دے، کہ رمضان آئے اور خیریت کے ساتھ، توفیق الٰہی کے ساتھ، دن کے روزوں کے ساتھ، رات کی عبادتوں کے ساتھ گذر جائے، "وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدَاکُمْ" اللہ کی بڑائی بیان کرو اس پر کہ اللہ نے ہدایت دی، ایمان و اسلام کی دولت سے نوازا، اور پھر توفیق دی، اگر ان میں سے ایک چیز بھی نہ ہوتی تو کہاں کا رمضان اور کہاں کا روزہ، دنیا میں پچاسوں قومیں ہیں، سیکڑوں قومیں ہیں وہ اتنا جانتی ہیں کہ رمضان کا مہینہ مسلمانوں میں آتا ہے، جیسے ہمارے یہاں مہینہ آتا ہے، انھیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ کب رمضان آیا اور کب ختم ہو گیا، اور ان کے مہینوں اور رمضان میں کیا فرق ہے۔

تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دی، ہم کو اسلام کی دولت سے نوازا، جس نے ہمیں صحت دی، ایسی صحت جس سے روزہ رکھ سکیں، اور پھر اس کے بعد سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ توفیق دی، سب کا انحصار توفیق پر ہے، ساری چیزیں جمع ہیں مگر توفیق نہیں تو کچھ نہیں، یعنی روزہ رکھنے کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے، عمر! تو اللہ کے فضل سے زندگی ہے، جوانی چاہئے، بلوغ چاہئے، تو وہ بھی موجود ہے، صحت چاہئے تو وہ بھی موجود ہے، اور روزے کے مسئلے معلوم ہونے چاہئیں تو وہ بھی معلوم ہیں، حکومت روکتی، قانون روکتا، یا ڈاکٹر ہی نے کہا ہوتا کہ تمھارے لئے روزہ رکھنا نامناسب ہے، نقصان دہ ہے، تو یہ بھی نہیں ہے، پھر روزہ کیوں نہیں ہو رہا ہے، توفیق نہیں ہے۔

توفیق کا مطلب

توفیق وہ چیز ہے جس کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہو سکتا، توفیق کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا رحمت کا ارادہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کا اس کے دل میں یہ خیال اور جذبہ ڈال دینا کہ یہ کام کرنا ہے، کہ تمام رکاوٹوں اور موانع کو ہٹا دینا ہے، اور پھر اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ فیصلہ کرنا کہ یہ کام ہو، یہ شخص روزہ رکھے، نماز پڑھے، ان سب کے مجموعے کا نام توفیق ہے، اتنی لمبی جو ہم نے عبارت بیان کی وہ عربی کے قرآن مجید کے ایک لفظ میں آگیا ہے اس کا نام ہے ''توفیق''۔

آپ دیکھیں گے، اپنے محلّہ میں دیکھیں گے، کہ ماحول موجود، سارے اسباب موجود، شرائط موجود، فضا موجود، لیکن روزہ نہیں اس لئے کہ توفیق نہیں،

اب اللہ نے تم کو ساری چیزیں اور ساتھ میں توفیق بھی عطا فرمائی، اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو، "ولتکبروا اللہ علیٰ ما ھداکم"۔

اس کو چھٹی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا

چنانچہ مسنون بھی یہ ہے کہ عید آئے، عید الفطر ہو، تو آہستہ آہستہ تکبیر کہتا ہوا آئے، اور عید الاضحیٰ ہو تو ذرا بلند آواز سے "اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر وللہ الحمد" پکارتا ہوا آئے، اور مسنون یہ ہے کہ ایک راستہ سے آئے، اور دوسرے راستہ سے جائے، تاکہ ساری فضا اس سے معمور ہو جائے، اور وہاں کے رہنے والوں کے کانوں میں یہ فضا پڑ جائے، اور وہ زمین گواہی دے، اور جب تک عید کی نماز کے انتظار میں بیٹھا رہے، یہ کہتا رہے، "وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدَاكُم وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" تاکہ تم شکر کرو، کہ اللہ نے ہمیں توفیق دی، اللہ نے ہم سے روزے رکھوائے، کوئی بیماری وغیرہ کے باعث چھوٹ گیا تو اس کے لئے بھی نیت اچھی کی، اور دنیا میں جتنے بھی خوشی کے تہوار ہیں سب میں خوشی ہوتی ہے، یعنی اس میں جو فرائض ہوتے ہیں، روزمرہ کا جو معمول ہے، وہ بھی معاف ہو جاتا ہے، لیکن اسلام تنہا مذہب ہے، کہ اس میں خوشی کے دن کام بڑھا دیا جاتا ہے، کام ایسا بھاری نہیں ہوتا کہ آدمی کہے کہ کام نہ ہوتا، نہیں بلکہ کام ایسا مبارک ہوتا ہے، ترقی دینے والا ہوتا ہے، اور معقول ہوتا ہے، اور انسانیت و شرافت کا ہوتا ہے، یہ جو دو رکعتیں آپ نے پڑھیں وہ روز کی نہیں ہوتیں، ہاں کوئی اشراق و چاشت پڑھے، جو فرض و واجب نہیں ہیں، لیکن عید کی نماز بڑھا دی گئی، اور تہوار آپ

دیکھیں گے تو اس میں عبادات معاف ہو جاتے ہیں، کوئی پوجا کرے یا نہ کرے، چرچ جائے یا نہ جائے، کرسمس ہے چھٹی کا دن ہے، اور یہاں تو کام بڑھا دیا گیا کہ فجر کی نماز پھر ظہر کی نماز درمیان میں دوگانہ اور بڑھا لیں، یہ ہے اسلام میں شکر کا طریقہ، شکر کا طریقہ چھٹی نہیں ہے، بلکہ بات یہ ہے ع

اس کو چھٹی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا

اس اُمّت کو سبق یاد ہو گیا ہے الحمد للہ۔ ساری اُمّتیں سبق بھلا بیٹھیں، بات یہ ہے کہ روئے زمین میں کوئی اُمّت ایسی نہیں جس کو سبق یاد ہو، تنہا یہ اُمّت ہے جس کو سبق یاد ہے، کچا پکّا جیسا بھی ہو، تو جب اس کو سبق یاد ہوا چھٹّی نہیں ملی، سبق یاد کرنے والے لڑکے کو، مکتب میں پڑھنے والے کو چھٹّی نہیں ہے، بلکہ اس کی ذمّہ داریاں ہیں، اور اس کو اپنی اس نعمت کا شکر ادا کرنا چاہئے، اس سے اس میں اضافہ ہوگا کمی نہیں ہوگی۔

تو دو رکعت یہ، اور فطرہ الگ دینا پڑتا ہے، ہر وقت کی بات نہیں دوسرے ادیان کے تہواروں میں یہ نہیں بلکہ وہاں تو کھاؤ پیو، وہاں معاملہ یک طرفہ ہے، اور یہاں لینے سے زیادہ دینا ہے، غریبوں کو فطرہ دو، اللہ کے سامنے دو رکعت شکرانہ کی نماز پڑھو، اور پھر تکبیر پڑھو اور اللہ کا شکر ادا کرو۔ "وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" (۱)۔

---

(۱) "عید الفطر کا پیغام" مطبوعہ تقریر سے تلخیص کی گئی۔

نبیؐ خاتم و دین کامل

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا. (سورہ المائدہ۔ ۳)

آج ہم نے تمھارے لئے تمھارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمھارے لئے اسلام کو دین پسند کیا۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین کے تعلق سے دو چیزیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا وعدہ اور مذاہب و ادیان کو بنیادی طور پر ان کی ضرورت ہے ایک اشاعتِ دین دوسرے حفاظتِ دین۔

اشاعتِ دین

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، قرآن مجید میں دونوں کے بارے میں واضح اشارات موجود ہیں، مثلاً اشاعتِ دین کے لئے صاف کہا گیا ہے:-

هُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ. وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ.

(سورہ التوبۃ۔ ۳۳)

وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ اس (دین) کو (دنیا کے) تمام دینوں پر غالب کرے اگرچہ مشرک ناخوش ہی ہوں۔

اور کہیں فرمایا گیا:-

وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ. — اگرچہ کافروں کو بُرا ہی لگے۔

(سورۃ التوبۃ۔ ۳۲)

"لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین تمام ادیان پر غالب ہو کر رہے گا اور محض سیاسی، انتظامی طور پر اور اقتدار اعلیٰ کی حیثیت سے نہیں، بلکہ دلائل کے لحاظ سے بھی اور تسخیر ذہنی و تسخیر عقلی کے میدان میں بھی۔

دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کو بشارت دی گئی اور پیشین گوئی کی گئی ہے:-

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ. وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجاً. فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ. اِنَّهٗ كَانَ تَوَّاباً.

(سورہ النصر)

جب اللہ کی مدد آپہونچی اور فتح (حاصل ہو گئی) اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ غول کے غول خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت مانگو وہ معاف کرنے والا ہے۔

"يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجاً." کا دل کش منظر آنحضرت ﷺ کی حیات طیّبہ ہی میں دکھا دیا گیا، لیکن یہ منظر بارہا سامنے آتا رہا ہے۔

تیسری طرف سورۂ نور میں کہا گیا ہے:-

وَعَدَاللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ. وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْناً. (سورۃ النور۔ ۵۵)

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا، جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا، اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کیلئے پسند کیا ہے مستحکم و پائدار کر دے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا۔

"تَمْكِيْنَ فِي الْاَرْضِ" کا نتیجہ اشاعتِ دین بھی ہے اسی لئے فرمایا گیا:-

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ. (سورہ الحج۔۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور بُرے کاموں سے منع کریں۔

یہ الفاظ بڑے جامع، وسیع، معنیٰ خیز اور فکر انگیز ہیں، اور تاریخ ان کی حرف بحرف تصدیق کرتی ہے۔

حفاظتِ دین

جہاں تک صیانت و حفاظتِ دین کا تعلق ہے جو دوسرا رکن ہے، اور بہت اہم رکن ہے، قرآن میں اس کی ضمانت دی گئی ہے، اور اس کے لئے ایک عظیم اور چونکا دینے والا اعلان کیا گیا ہے، اور تاریخ کو اس کا شاہد بنایا گیا ہے، وہ خدا کا یہ فرمان اور قرآن مجید کا یہ اعلان ہے:-

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ. (سورہ الحجر۔۹)

بیشک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اُتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

صاف صاف کہا گیا ہے کہ ہم نے "الذکر" یعنی قرآن مجید کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے براہ راست اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے(۱)۔

(۱) تلخیص از نبی خاتم و دین کامل ادیان و ملل کی تاریخ میں اس کی اہمیت و خصوصیت ص ۵ تا ص ۱۰

باب ۵

تہذیب ومعاشرت

"ہر دور میں:-

دنیا کے لئے ضرورت رہی ہے کہ ایک مکمل معاشرہ، ایک ملت اور عالمگیر دعوت کی سطح پر اسلامی زندگی پائی جائے......

آج بھی:- دنیا کی ضرورت یہ ہے کہ:-

- ☆ کسی ملک کا پورا معاشرہ اسلامی زندگی کی نمائندگی کر رہا ہو!
- ☆ اسلامی اخلاق کیسے ہوتے ہیں؟
- ☆ مسلمان کس طرح اس پر یقین رکھتا ہے کہ "الصدق ینجی، والکذب یھلک"؟
- ☆ اس کے دل کی گہرائی میں یہ بات بیٹھ گئی ہو کہ صحیح کردار نجات دیتا ہے! کامیاب کرتا ہے اور غلط بیانی اور غلط طرز زندگی انسان کو ہلاک کرتی ہے!
- ☆ اس کو یقین ہو کہ "اَلْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ" انجام متقین ہی کا ہوتا ہے!
- ☆ اس کو یقین ہو کہ "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا" (کامیاب ہوا جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور ناکام ہوا جس نے اس کو خاک میں ملا دیا)!
- ☆ اس کو یقین ہو "وإن الدار الأخرة لهي الحيوان" (آخرت کی زندگی ہی حیات اصل ہے)
- ☆ اس کو یقین ہو کہ نصرت اللہ کی طرف سے آتی ہے!

اچھے اعمال میں تاثیر ہے، غلط اعمال کرنے سے ناکامی ہوتی ہے اور صحیح زندگی اختیار کرنے سے کامیابی ہوتی ہے!!"۔

ماخوذ از "تحفۂ پاکستان صفحہ ۲۰۔۲۱۔"

اسلامی معاشرہ

"وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُوْلٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ. فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَّاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ" (الحجرات: ۷)

قرآن مجید صحیح اسلامی معاشرہ کا معیار یہ پیش کرتا ہے کہ اس کے ضمیر و خمیر میں صالح اقدار و اخلاق کی محبت رچ بس گئی ہو اور اس کا مزاج بن گئی ہو، اس کو فسق سے، ظلم سے اور نفس پرستی سے طبعی و مزاجی طور پر وحشت اور اِبا ہو، اس میں کوئی ایسی دعوت جس میں سرکشی، ہوا و ہوس، انسانوں کے حقوق کی پامالی، انسانی طبیعت کو بے مہار چھوڑ دینے کی دعوت ہو، جس میں تفریح طبع یا نفس کی خواہشات و جذبات کی تسکین کے لئے بڑے سے بڑے ملی اور اجتماعی مفاد کو قربان کر دینے کی صلاحیت ہو اس دعوت و تحریک سے یہ معاشرہ اِبا اور انکار کر رہا ہو اور اس کو اس سے ایسی نفرت ہو جس کو اردو میں "گھن آنا" کہتے ہیں، اس کو اس کے معاملہ میں ایسی کیفیت کا سامنا کرنا ہوتا ہو جس کو تکدر و تنغص کے الفاظ سے ادا کیا

جا سکتا ہے۔

قرآن مجید اس اسلامی معاشرہ کے بارہ میں (جس کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کی صحبت و تربیت اور قرآن مجید کی تعلیمات پر پڑی تھی) شہادت دیتا ہے، قرآن کہتا ہے:-

"وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْإِيْمَانَ وَزَيَّنَهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُوْلٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ. فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَّاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ" (الحجرات: ۷)

"لیکن خدا نے تم کو ایمان عزیز بنایا، اور اس کو تمھارے دلوں میں سجا دیا اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے تم کو بیزار کر دیا، ایسے ہی لوگ تو راہ راست پر ہیں، اللہ کے فضل و انعام سے"۔

جو حضرات عربی داں ہیں وہ ان الفاظ کی قوت کو اور ان کا جو درجۂ حرارت ہوتا ہے، (الفاظ کا بھی ایک ٹمپریچر ہوتا ہے وہ اہل زبان ہی سمجھتے ہیں) یعنی تمھیں ایمان اور اس کے مظاہر کو دیکھ کر وہ مسرت و اہتزار اور انبساط کی وہ کیفیت حاصل ہوتی ہے جو کسی جمیل سے جمیل پیکر، اور کسی دل کش سے دل کش چیز سے طبعی طور پر حاصل ہوتی ہے، "وَزَيَّنَهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ" یہ عقیدہ اور عقل و شعور کے دائرہ سے آگے کی بات ہے، یہ ایک طبعی و نفسیاتی کیفیت ہے، معاشرہ اور ان صالح اقدار و اخلاق اور مفید و نافع دعوتوں کے درمیان وہ رشتہ قائم ہو جائے جس کو کسی عملی دلیل، اور عمیق غور و فکر کی ضرورت نہ ہو، خود بخود دل اس کی طرف کھنچے۔

اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا لیکن قرآن مجید کا اعجاز اور فطرت انسانی کی وہ

عمیق و دقیق معرفت ہے جو صرف خالق کائنات کو حاصل ہوتی ہے کہ اس کے بالمقابل صفتوں کا بھی ذکر کیا، اور فرمایا:-

"وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرِ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ"

اور ناگوار و ناخوش گوار، اور گویا ناقابل برداشت بنادیا، کفر کو، فسق کو، عصیان و نافرمانی کو، وہ اسلامی معاشرہ جو دنیا کے لئے قابل تقلید ہو سکتا ہے، جس کی بنیادیں مضبوط و مستحکم ہیں، جو زمانہ کی گرم و سرد ہواؤں کا مقابلہ کر سکتا ہے، جو ہر قسم کے امتحانات اور آزمائشوں سے کامیاب طریقہ پر گزر سکتا ہے، یہ وہ معاشرہ ہے جس کے اندر نیکی کی محبت رچ بس گئی ہو، اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہو۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اسی معاشرہ کی تعریف میں کہتا ہے:-

﴿اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ. وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا. وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾. (الفتح: ۲۶)

"جب کافروں نے اپنے دلوں میں ضد کی، اور ضد بھی جاہلیت کی، تو خدا نے اپنے پیغمبر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی، اور ان کو پرہیزگاری کی بات پر جمائے رکھا، اور وہ اسی کے مستحق اور اہل تھے"۔

ان الفاظ پر آپ غور کیجئے "اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ" دل میں اہل کفر کے حمیت جاہلیت نے انگڑائیاں لیں، قوم پرستی، نسل پرستی، مفاد پرستی، نفس پرستی، یہ سب "حمیت جاہلیت" میں شامل ہے، یہاں تک کہ لسانی عصبیت بھی اسی میں آتی ہے، آپ نے دیکھا ہے کہ لسانی عصبیت

نے کتنے طاقتور عامل، کتنے بڑے (Factor) کا کام کیا ہے، اس لسانی عصبیت نے ماضی قریب میں وہ گل کھلائے، خون کے دریا بہائے اور اس طرح انسانیت اور اخلاقی اقدار کو نظر انداز کیا گیا، اس طرح انسان نے انسان کو شکار کیا، اور اس طرح انسان نے انسان کا خون بہایا، جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے، یہ سب حمیت جاہلیت کا کرشمہ تھا، ع

تو خود حدیث مفصّل بخواں ازیں مجمل!

اللہ تعالیٰ اس موقعہ پر فرماتا ہے، "وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى" اس مفہوم کو کئی طرح سے ادا کیا جا سکتا تھا، اللہ نے ان کی زبان پر کلمہ تقویٰ جاری کیا، لیکن نہیں "وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى" فرمایا، ان کے لئے کلمہ تقویٰ کو لازم و ملزوم بنا دیا، یعنی وہ ان کا شعار بن گیا، شعار ہی نہیں بلکہ مزاج بن گیا، آپ جانتے ہیں کہ مزاج، عادتوں، تربیت و صحبت کے اثرات، عقلی و تعلیمی جدوجہد کی کوششوں سے ماوراء چیز ہے، مزاج وہ ہے جو ہر چیز پر غالب ہو کر رہتا ہے۔

ہم میں سے بہت کم لوگوں نے غور کیا ہوگا کہ یہاں پر "اَلْزَمَهُمْ" کیوں کہا؟ یعنی کلمہ ان کا شعار، ان کا مزاج بن گیا، ان کو كَلِمَةَ تَقْوٰى ...... کے حدود سے کوئی باہر نہیں لے جا سکتا، "وَكَانُوْا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا" فرما کر اس پر اور مہر لگا دی، کلمہ تقویٰ کو انھوں نے آگے بڑھ کر بے اختیارانہ طریقہ پر قبول کیا، ان کے اندر وہ کلمہ تقویٰ جذب ہو گیا، پھر اس سے بڑھ کر قرآن ایک نازک پیمانہ بیان کرتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ انسانی اخلاق و نفسیات کی پوری تاریخ میں (جہاں تک میرا مطالعہ ہے) قرآن مجید نے اس معاشرہ کی جو خصوصیت بیان کی ہے وہ ایسی ہے کہ

اس کے آگے خود انسانی تخیل کا جانا بھی مشکل ہے، کہتا ہے:-

﴿لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّقَالُوْا هٰذَا اِفْكٌ مُّبِيْنٌ﴾(النور:)۔

''جب تم نے وہ بات سنی تھی تو مومن مردوں اور عورتوں نے کیوں اپنے دلوں میں نیک گمان نہ کیا، اور کیوں نہ کہا یہ صریح طوفان ہے''۔

جب تمھارے سامنے ایک مومن فرد پر، ایک پاکباز ہستی پر تہمت لگائی گئی تو تم نے اپنے اوپر قیاس کیوں نہ کیا، آئینہ میں اپنی صورت کیوں نہیں دیکھی، اور سنتے ہی یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ ہم نہیں کر سکتے تو وہ ہستی بھی نہیں کر سکتی، خدا نے اسلامی معاشرہ کو ایسا بنایا کہ اس کا ہر فرد دوسرے فرد کا آئینہ ہے، ہر فرد دوسرے فرد کا مصدق و شاہد ہے، شاہد ہی نہیں مدعی ہے، اس کی طرف سے مدافعت کرنے والا، سینہ سپر ہے اور خم ٹھونک کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ ایسا نہیں ہو سکتا، معاشرہ نبوت کے سانچہ میں ایسا ڈھل کر نکلا تھا کہ اس کا ہر فرد دوسرے فرد کا آئینہ تھا ؎

لگایا تھا مالی نے اک باغ ایسا
نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پودا

یہ ہے اسلامی معاشرہ جس پر پورے طور پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، اور جس پر ذمہ داری اور دنیا کی رہنمائی کا بڑے سے بڑا بوجھ ڈالا جا سکتا ہے، اس پر نسل انسانی کی رہبری اور قیادت کے بارہ میں پورا اعتماد کیا جا سکتا ہے(۱)۔

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵؍ جولائی ۱۹۸۶ء

معاشرت انسانی بلکہ حیات انسانی

مرکب ہے مردو عورت سے

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّیْ لَا أُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ
مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰی بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ.

ہم نے آپ کے سامنے سورۂ آل عمران کی آیت کا ایک ٹکڑا پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے اہل ایمان کی دعاؤں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان اہل ایمان نے خوب دل کھول کر دعائیں کیں، معمولی دعائیں نہیں تھیں، بڑی مومنانہ دعائیں، بڑی مبصرانہ دعائیں، بڑی مردانہ دعائیں! مردانہ لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے ﴿رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیَ یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ آمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا﴾۔ ایک مردانہ دعا ہے، ﴿رَبَّنَا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَیِّئَآتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ، رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیَامَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ﴾۔ ایسی بلند ہمتی کی دعائیں تھیں۔ انھوں نے ایک بات اور کہی تھی ﴿"رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا

---

(۱) سورہ الفتح: ۲٦

مُنَادِيَ يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ﴾ ہم نے ایک پکارنے والے کو، تیرے ایک منادی کو پکارتے ہوئے سنا کہ "آمِنُوْا بِرَبِّكُمْ" (اپنے رب پر ایمان لاؤ) "فآمنّا" (ہم ایمان لائے) "وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّآتِنَا" ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہمارے گناہوں سے در گذر کر۔

ظاہر ہے کہ ان دعاؤں میں ذہن مردوں ہی کی طرف جائے گا، منادی اور قبول کرنے والے مرد، اور میں یہ کہوں کہ پیش پیش رہنے والے اور اس کو مردانہ وار لبیک کہنے والے مرد تھے تو یہ بھی صحیح ہے، لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ جب اجر کا اور دعاؤں کی قبولیت کا ذکر کرتا ہے تو مردوں کے ساتھ۔ حالانکہ وہاں پر کوئی سیاق و سباق اور قرینہ نہیں ہے۔ خاص طور سے عورتوں کا ذکر کرتا ہے۔ دوسری جنس، جنس لطیف کا بھی ذکر کرتا ہے "فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ" دعا کرنے والے مرد ہیں اور فرماتا ہے اللہ نے ان کی دعا قبول کی۔

رحمتِ الٰہی میں مساوات کامل ہے

یہاں پر کوئی ادیب ہوتا، کوئی انشاء پرداز ہوتا، کوئی مقنن ہوتا، کوئی ماہر نفسیات ہوتا، کوئی بڑا عورتوں کی آزادی کا حامی اور محرک ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ یہاں پر عورتوں کو فراموش کر دیتا...... کیا موقع تھا، کیا ذکر تھا، ساری دعائیں مردوں کی اور سارے کاموں میں مرد ہی پیش پیش تھے لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمت دیکھئے وہ خالق ذکور و اناث دونوں جنسوں کا خالق ہے، دونوں پر اس کی یکساں شفقت کی نظر ہے۔ وہ رب العالمین ہے۔ فرماتا ہے "فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّی لَا اُضِیْعُ

عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ" ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کی اور جواب دیا کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا "عامل" کا لفظ تذکیر کا ہے۔ یہاں تک مردوں ہی کا ذکر تھا "لَا اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ" میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا، کسی محنت کرنے والے کی محنت کو، کسی کوشش کرنے والے کی کوشش کو، کسی قربانی دینے والے کی قربانی کو، ضائع نہیں کرتا۔ "مِنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثٰى"۔ یہاں پر ایک دم سے عورتوں کو یاد فرمایا اور ان کو شرف بخشا، وہ عمل کرنے والا، وہ دعا کرنے والا چاہے مرد ہو یا عورت۔ اس سے زیادہ، یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمت میں، (میں اور کسی چیز میں نہیں کہتا، لیکن میں اس کو پورے وثوق کے ساتھ اور خم ٹھونک کر کہتا ہوں) اور کسی چیز میں مساوات ہو یا نہ ہو اور بعض چیزوں میں مساوات، اسلامی شریعت سے تحفظ، اور فطرت انسانی کی معرفت پر مبنی بصیرت سے کام لیتی ہے لیکن ایک چیز ڈنکے کی چوٹ پر کہی جا سکتی ہے کہ رحمتِ الٰہی اور بخشش الٰہی میں مساوات کامل ہے اس میں کوئی تحفظ نہیں ہے، کسی قسم کا ریزرویشن نہیں، کسی قسم کا امتیاز نہیں اور اس کی دلیل یہ آیت ہے، "فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ"۔

پورا سیاق و سباق دیکھئے تو آنکھیں کھل جائیں گی اور اعجاز قرآنی سے بڑھ کر رحمت یزدانی کا آدمی قائل ہو جائے گا اور کوئی جھوم اٹھے اور کسی پر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے اور خاص طور پر میں اپنی عزیز بہنوں سے کہتا ہوں، اگر ان پر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے اور اگر کسی بڑے شکر کی حالت میں مدہوشی کی حالت طاری ہو جائے اور اس کے رونگٹے رونگٹے سے شکر کے ترانے نکلیں بلکہ اُبلیں تو بھی

بالکل بجا ہے اور برمحل ہے، یہاں یہ کوئی موقع نہ تھا مردوں نے بھی (اللہ ان کو معاف کرے) اپنی دعاؤں میں اپنی بہنوں کا تذکرہ نہیں کیا تھا، اپنی ماؤں تک کا تذکرہ نہیں کیا تھا، حالانکہ ماں تو ماں ہے ہی۔ انھوں نے دعا اپنے لئے کی تھی ساری ضمیریں مذکر کی۔ لیکن اس رب العالمین کی رب العالمینی دیکھئے اور اس کی رحمۃ للعالمینی دیکھئے فرماتا ہے "فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّيْ لَا أُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى" اور پھر اس کے بعد مہر لگاتا ہے "بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ" تم بھول کیوں گئے تھے یعنی گویا تنبیہ کی گئی ان دعا کرنے والے مردوں کو کہ تم اپنے جسم کے اتنے بڑے حصہ کو، حیات انسانی کے ایک اتنے اہم عنصر کو بھول کیوں گئے تھے؟ بلکہ اپنے لئے شرط حیات کو بھول گئے تھے۔ تو تم بھولے، ہم نہیں بھولے، تم سو بار بھولو، ہزار بار بھولو لیکن ہم بھولنے والے نہیں ہیں۔ ﴿فِيْ كِتَابٍ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَىٰ﴾ حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا تو ان کے رب العزت نے جواب دیا "اَنِّيْ لَا اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ" میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں، بغیر سیاق و سباق کے فرماتا ہے "مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى" چاہے وہ عمل کرنے والا مرد ہو یا عورت، کیا تعجب کی بات ہے؟ تم ہو ہی ایک دوسرے سے مستغنی نہیں۔ معاشرت انسانی بلکہ حیات انسانی مرکب ہے ان دونوں عنصروں سے، ان کا انفصال ہو ہی نہیں سکتا ہے۔

عربی کا لفظ "اضاعت"

جب میرا ذہن اس آیت کی طرف گیا تو معانی اور مضامین کا ایک عالم سامنے

آگیا کہ لا اضیع کی وسعت اور اس کی بے پایانی دیکھئے کہ اس نے یہاں پر "لَا أُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ" فرمایا، میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ عربی کا لفظ "اضاعت" کا استعمال ہوا ہے یعنی اس کی کوشش کا نتیجہ یہاں دنیا میں بھی ظاہر ہوگا اور آخرت میں بھی ہوگا۔ یہ آیت دنیا و آخرت دونوں پر حاوی ہے۔ آیت یہ نہیں کہتی کہ عورتیں عبادت کر کے دنیا میں تو کوئی نتیجہ نہ پائیں گی۔ محنت کریں علم کے لئے اور علم حاصل نہیں ہوگا، محنت کریں تربیت میں اور اس کا نتیجہ حاصل نہیں ہوگا، محنت کریں زندگی کو پُر لطف، بامعنی اور بارونق بنانے کی اور اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے اور سارا اجر آخرت کے لئے اٹھا رکھا جائے بلکہ جس میدان میں تم دونوں محنت کروگے، اس میں انہی کوششوں کا نتیجہ دیکھوگے، چنانچہ میں عبادت کے متعلق تو کیا کہوں عبادت میں اگر آپ صرف اسلام کی تاریخ دیکھئے اور حقیقت میں محفوظ تاریخ تو وہی ہے، ہماری مجبوری، انسانیت کی مجبوری، علم انسانی کی مجبوری، تقدیرات انسانی کی مجبوری کی تاریخ تو محفوظ امتِ محمدیؐ سے ہے، وہ علمی ترقیوں کی ہے، روحانی ترقیوں کی ہے اور مسائل کے نتائج ظاہر ہونے کی ہے، آپ دیکھئے کہ اس کا پورا امکان تھا کہ ولایت کے میدان پر پوری اجارہ داری مردوں کی ہوتی، اس لئے کہ ولایت کا میدان، قبولیت عند اللہ کا میدان بڑی خصوصیات کا طالب ہے اور اس کو مردوں سے کچھ مناسبت ہے، مجاہدہ کرنا، جہاد کرنا، رات رات بھر نمازیں پڑھنا، روزے رکھنا اور یہ مردوں کے لئے آسان ہے۔

میں اس میں تفصیل کے ساتھ نہیں جانا چاہتا۔ میں تو قرآن مجید کے اس اعجاز

کا لطف اٹھانا چاہتا ہوں اور بتانا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "لَا اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ"...... "عمل" بھی یہاں نکرہ، "عامل" بھی یہاں نکرہ، کسی عمل کرنے والے کے عمل کو میں ضائع نہیں کرتا جس میں تم کوششیں کروگے، کوشش کروگی اگر تم نے عبادت میں کوشش کی تو ہم تم کو رابعہ بصریہ کے مقام اور اس سے بھی آگے کے مقام تک پہونچا سکتے ہیں(۱)۔

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ر فروری ۱۹۸۱ء

معاشرۂ انسانی کا باہمی ارتباط

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْراً وَّنِسَاءً. وَاتَّقُوْا اللهَ الَّذِىْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ. اِنَّ اللهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً.

"لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تم کو ایک شخص (یعنی آدم) سے پیدا کیا، اس سے اس کا جوڑا بنایا، پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد و عورت (پیدا کر کے روئے زمین پر) پھیلا دیئے، اور خدا سے جس کے نام کو تم اپنی حاجت براری کا ذریعہ بناتے ہو ڈرو، اور (قطع مودت) ارحام سے (بچو)، کچھ شک نہیں کہ خدا تمھیں دیکھ رہا ہے"۔ (النساء:۱)

یہ آیت سورہ نساء کی ہے، سورہ نساء کا نام ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام نے طبقہ اناث کو اور جنس لطیف کو کیا مقام دیا ہے!

میں سمجھتا ہوں کہ طبقۂ اناث کے متعلق اسلام کا تصور اور مرد و عورت کی باہمی ذمہ داری اور تعلقات کی نوعیت پر یہ آیت پوری روشنی ڈالتی ہے، پہلے تو اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ اشارہ فرمایا ہے کہ ان دو طبقوں کی خلقت ایک ہی طرح ہوئی

ہے، اور ان دونوں کی قسمت ایک دوسرے سے ایسی وابستہ ہے گویا ایک جسم کے دو حصے ہوں، مرد و عورت کی جسمانی ساخت میں معمولی تبدیلی اس وجہ سے ہے کہ دونوں زندگی کا سفر خوشگواری سے طے کر سکیں۔

پہلے تو ان دونوں طبقوں کا وجود نفس واحدہ سے ہے پھر اس نفس واحدہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، اس تقسیم کے باوجود ان میں کوئی تضاد کوئی بیر نہیں بلکہ وہ جا کر ایک ہی نقطہ پر جمع ہو جاتے ہیں، اس دنیا میں سفر کرنے والے انسان کو ہم سفر اس کی جنس سے دیا گیا ہے، اور وہ اسی کے جسم کا حصہ ہے، پھر اس کے بعد ان دونوں سے نسل انسانی کی آفرینش، اور افزائش ہوئی، اللہ تعالیٰ نے دونوں کی رفاقت محبت اور ہم سفری میں بڑی برکت عطا فرمائی کہ جو دو تھے ان سے ہزاروں ہوئے اور ہزاروں سے لاکھوں، کروڑوں ہوئے، یہاں تک کہ صحیح تعداد کا شمار کمپیوٹر بھی نہیں لگا سکتا کہ کتنے انسان پیدا ہوئے؟ اس کو صرف خدا جانتا ہے، ''کثیراً'' کے لفظ سے خدا نے ان کی کثرت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

سائل بھی اور مسئول بھی

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''تم اس خدا سے ڈرو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو'' قرآن مجید میں انقلابی طور پر یہ تصور پہلی مرتبہ پیش کیا گیا ہے کہ انسانی سوسائٹی کا ہر فرد ایک دوسرے کا محتاج ہے ہر ایک سائل ہے اور ہر ایک مسئول ہے، پھر تقسیم اس طرح نہیں کہ سائلین ایک طرف ہیں اور مسئولین دوسری طرف بلکہ جو سائل ہے وہ مسئول بھی ہے، اور جو مسئول ہے وہ

سائل بھی ہے "تساؤل" (مشترک سوال وجواب) ایک ایسی زنجیر ہے جس میں ہر ایک بندھا ہوا ہے، ہماری تمدنی زندگی ایک جال ہے، جس میں ہر ایک دوسرے کا ضرورت مند ہے۔

مرد عورت کے بغیر اپنا قدرتی اور فطری سفر خوشگوار طریقہ سے طے نہیں کر سکتا اور کوئی شریف خاتون، رفیق حیات کے بغیر خوشگوار طریقہ سے زندگی نہیں گزار سکتی، اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو دوسرے کا ایسا سائل اور محتاج بنا دیا ہے کہ اس کے بغیر زندگی نہیں گذر سکتی۔

خدا کا نام بیگانوں کو یگانہ بناتا ہے

پھر بھی یہ فرمایا گیا کہ سوال جس کے نام پر تم کرتے ہو وہ خدا ہے، اسلامی معاشرہ خدا کے عقیدے، خدا کی عظمت، خدا کی قدرت اور خدا کی وحدت کے عقیدے پر وجود میں آتا ہے، ایک مسلمان مرد کی مسلمان خاتون سے ہم سفری اور رفاقت جب جائز ہوتی ہے، جب وہ خدا کا نام بیچ میں لائیں، خدا کا نام ہی بیگانوں کو یگانہ بناتا ہے، دور کو نزدیک کرتا ہے، غیروں کو اپنا بناتا ہے، اور جن کی پرچھائیں بھی پڑنا گوارا نہ تھی ان کو ایسا قریب اور عزیز بنا دیا جاتا ہے کہ ان کے بغیر زندگی کا صحیح تصور بھی نہیں ہو سکتا، وہ ایک دوسرے کے رفیق حیات اور ذمہ دار بن جاتے ہیں، شوہر اور بیوی کا تعلق ایسی محبت واعتماد کا تعلق ہے کہ بعض اوقات وہ والدین کے تعلق سے بھی بڑھ جاتا ہے، جو بے تکلفی، جو اعتماد، جو الفت، جو سادگی، جو فطریت ان کے درمیان ہوتی ہے، کسی اور رشتہ میں اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا، یہ سب

اللہ کے نام کا کرشمہ ہے، خدا کا نام بیچ میں آتا ہے تو ایک نئی دنیا وجود میں آجاتی ہے، کل تک جو غیر تھا، یا غیر تھی، وہ اپنوں سے بھی زیادہ بڑھ کر اپنا بن جاتی ہے، ایک مسلمان مرد، ایک مسلمان عورت، ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلف نہیں ہو سکتے، ایک دوسرے کے ساتھ بعض اوقات سفر بھی نہیں کر سکتے، ایک دوسرے کے لئے نامحرم ہیں لیکن جب خدا کا نام بیچ میں آجاتا ہے تو ایک مقدس رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔

یہ ایک قرآنی معجزہ ہے کہ "تساء لون به" کہہ کر معاشرۂ انسانی کا باہمی ارتباط، پیوستگی، وابستگی اور ہر ایک کا ایک دوسرے کے ساتھ جڑا ہونا ایسا بیان کر دیا کہ کوئی بڑے سے بڑا منشور اور بڑے سے بڑا چارٹر بھی اس کو بیان نہیں کر سکتا، فلسفۂ اجتماع و عمرانیات (سوشیالوجی) کی بڑی ضخیم کتاب بھی اس کو نہیں بیان کر سکتی۔

پھر یہ فرمایا کہ جس کا نام بیچ میں لا کر حرام کو حلال کرتے ہو، ناجائز کو جائز کرتے ہو اور اپنی زندگی میں انقلاب عظیم لاتے ہو، اس پاک اور بڑے نام کی لاج بھی رکھنی چاہئے، زوجین کے گہرے اور محکم تعلق کو قرآن مجید نے ایک دوسرے انداز میں بھی بیان کیا ہے، فرمایا "هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ" (تم ایک دوسرے کا لباس بن جاتے ہو) یہ بھی قرآن مجید کا ایک معجزہ ہے، کہ اس کے لئے "لباس" کا لفظ استعمال کیا، جو ستر پوشی اور زینتِ زندگی کی اہم ضرورت ہے، "لباس" کے لفظ میں وہ سب کچھ آگیا جو زوجین کے باہمی تعلق و اعتماد کے متعلق زیادہ سے زیادہ کہا جا سکتا ہے، تم ان کے لئے لباس ہو اور وہ تمھارے لئے

لباس ہیں، لباس کے بغیر جس طرح انسان حیوانیت سے قریب تر نظر آتا ہے، ایک صحرائی مخلوق نظر آتا ہے، ویسے ہی ازدواجی زندگی کے بغیر انسان غیر متمدن نظر آتا ہے، اس کو غیر متمدن اور غیر مہذب سمجھنا چاہئے(۱)۔

(۱) نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں۔

اسلامی معاشرہ میں عورتوں کا مقام و مرتبہ

إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِيْنَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِيْنَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْراً وَالذَّاكِرَاتِ.
أَعَدَّاللّٰهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَّأَجْراً عَظِيْماً.

"بالیقین جو مرد اور جو عورتیں مسلم ہیں، مؤمن ہیں، مطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں، صابر ہیں، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں، اللہ نے ان کے لئے مغفرت اور بڑے احسان کا اجر مہیا کر رکھا ہے"۔ (الاحزاب۔ ۳۵)

اللہ کو اپنی بندیوں سے کتنی محبت ہے

جس وقت قرآن مجید کی تلاوت ہو رہی تھی میرا ذہن ایک دم سے ایک

عجیب و غریب نکتہ کی طرف گیا مجھے ایک سرور و کیفیت حاصل ہوئی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کو دیکھئے کہ جب ذکر کرتا ہے بڑے بڑے مقامات کا، ہم جیسے ٹوٹی پھوٹی عربی جاننے والے اس کو دو جملوں میں ادا کر سکتے ہیں مرد اور عورت سب شریک ہیں تو دس مرتبہ دو الگ الگ ضمیریں لاتا ہے اور ایک ایک صفت کا ذکر کرتا ہے، اللہ کو اپنی بندیوں سے کتنی محبت ہے ﴿إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِيْنَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ الْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِيْنَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِيْنَ اللهَ كَثِيْراً وَالذَّاكِرَاتِ. ﴾

اگر خدا کا معاملہ نہ ہوتا تو میں کہتا اللہ کو بڑا مزہ آرہا تھا ہر ایک کا الگ الگ ذکر کیا۔ کسی باپ سے پوچھئے جس کے چار یا سات بیٹے ہوں اس کا جی چاہے گا کہ ہر ایک کا نام لے کر وہ بتائے اور ہر ایک پر اس کو لطف آئے گا، اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات بہت عالی ہے۔ انسانی خصوصیات اس کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتیں، لیکن اس کو انسانی ادب و انشا کے لحاظ سے دوسرے طریقہ سے بھی ادا کیا جا سکتا تھا "وغیرہ" کا لفظ تو اس وقت تک ایجاد نہیں ہوا تھا مگر مسلمان مرد اور عورتیں اور ایمان لانے والے اور ایمان لانے والی عورتیں اور اس طریقہ سے دوسرے تمام فضائل میں شریک ہونے والے مرد اور عورت، لیکن ایک ایک کو الگ الگ کر کے بیان کیا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اسلام اور ایمان میں تو مرد اور عورت شریک ہو سکتے ہیں، قانتات فرمانبرداری میں، اس میں بھی ممکن ہے لیکن صادقین اور صادقات

میں تو مشکل ہے، اس میں عورتیں جھوٹ بول دیتی ہیں کبھی اپنی کمزوری چھپانے کے لئے بھی، کبھی اپنے کھانے کی خرابی چھپانے، کبھی اپنے بچے کی بُری عادت پر پردہ ڈالنے کے لئے، کبھی سو جانے کی کمزوری پر، اور عورتیں سچائی میں مردوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہیں یہ تو مردانہ کام ہے، بہادری کا کام ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے لیکن الصابرین والصابرات، وہ صبر کہاں کر سکتی ہیں ہمیشہ یہی دیکھا ہے سب سے پہلے ان پر صدمہ کا اثر پڑتا ہے، سب سے پہلے ان ہی کی زبان سے فریاد نکلتی ہے، بعض وقت تو ایمان خطرہ میں پڑ جاتا ہے، بعض وقت تو اولاد کا غم۔ اللہ محفوظ رکھے یا عزیزوں کا غم سب سے پہلے عورت پر پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فطرت انسانی سے واقف تھا، اللہ تعالیٰ دلوں کے چور سے واقف تھا کہ ہم اپنی بہنوں سے بدگمانی کریں گے الصابرین والصابرات جی نہیں صبر کے میدان میں عورتیں کسی حال میں مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ وَالْخَاشِعِیْنَ وَالْخَاشِعَاتِ۔ اب آیا معاملہ مال کا تو عورت مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔ حاتم کا نام تو سنا ہوگا حاتمہ کا نام نہیں سنا ہوگا، اس لئے صدقہ میں عورتیں کیا دیں گی وہ تو جمع کرنے والی ہیں وہ بڑی سوگھڑ عورتیں ہیں۔ بہت گرہست عورت ہے یعنی بچا بچا کر رکھنے والی۔ اس لئے فرمایا، وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ، اچھا صاحب روزہ بڑا مشکل معاملہ ہے، وَالصَّائِمِیْنَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِیْنَ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْراً وَّالذَّاکِرَاتِ اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَغْفِرَۃً وَّاَجْراً عَظِیْماً۔

اتنی لمبی اعمال کی فہرست یہ کیوں بیان کی تاکہ معلوم ہو کہ اللہ تبارک و تعالیٰ جس طرح اپنے بندوں پر شفقت کرتا ہے اسی طرح اپنی بندیوں پر شفقت

کرتا ہے، اس کی صفت ربوبیت اور اس کی صفت رحمت مردوں اور عورتوں کے ساتھ ایک ساتھ کام کرتی ہے اور ان پر سایہ فگن ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اتنے جمع مذکر سالم، جمع مونث سالم ...... میں کتنی چیزیں جمع کر دیں کہ دوسرا آدمی اس کو سمجھے گا کہ یہ اس کے بلاغت کے خلاف ہے کیا اندازہ تھا کہ یہ سمجھا جائے کہ ایک طرف تو بیبیاں اور شریف بیٹیاں اور خواتین سمجھیں کہ ہر میدان میں فضائل انسانی میں، مکارم اخلاق میں، فضائل اعمال میں وہ مردوں سے پیچھے نہیں ہیں اور ان کو اجر و انعام ملے گا اور ان کی صنف اس کے مغائر نہیں ہے اُن کے مقصد آفرینش کے مغائر نہیں ہے ان کی صنفی خصوصیات مجروح کرنے والی نہیں ہیں۔

قرآن کریم میں مردوں کے ساتھ عورتوں کے ذکر کا اہتمام

ہم آپ سے ایک طالب علم اور عربی جاننے والے کی حیثیت سے کہتے ہیں کہ یہ صرف کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ مرد و عورت سب کے سب درجے حاصل کر سکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جب ذکر کرتا ہے ایسے مراتب کا، تو مردوں کے لئے صیغہ الگ اور عورتوں کے لئے الگ ذکر کرتا ہے: "إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتَ وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ"۔ اور ہر لفظ کے ساتھ ایک مرد کے لئے صیغہ ہے، ایک عورت کے لئے، کوئی پوچھے کہ بھئی اتنا کہہ دیا ہوتا کہ ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾ نہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ عبادت کی یہ قسم صرف مردوں کے ساتھ مخصوص ہے، عورت اس میں کوئی

درجہ نہیں حاصل کر سکتی۔ روزہ رکھنے میں ان کا ذکر ہے، عبادت کرنے میں ان کا ذکر ہے، اور اللہ کی یاد کرنے میں ان کا ذکر ہے "وَالذّٰاکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْراً وَّ الذّٰاکِرَاتِ" اللہ کا ذکر کرنے میں الذّٰاکرین مذکر کا صیغہ بھی استعمال کیا گیا ہے اور مؤنث کا بھی۔ اس لئے کہ دوسرے مذاہب کی تاریخ اور ان کی کتابیں بتاتی ہیں کہ وہاں بہت سے کمالات اور بہت سی صفات صرف مردوں کے لئے مخصوص کر دی گئی ہیں اور یہ بات دماغ میں بیٹھی ہوئی تھی اور ایک بالکل بدیہی بات سمجھی جاتی تھی کہ یہ صرف مردوں کا کام ہے عورت اس میں ہاتھ نہ لگائے، وہ ترقی نہیں کر سکتی ہے، اس کو اس سے بڑا کوئی امتیاز نہیں حاصل ہو سکتا ہے لیکن قرآن میں ایک ایک عبادت کے ساتھ، عبادت کی ایک ایک قسم کے ساتھ مرذوں کے لئے الگ لفظ اور الگ صیغہ ہے اور عورتوں کے لئے الگ صیغہ ہے۔

قرآن مجید میں عورتوں کے نام سے مستقل ایک سورۃ

اور پھر دیکھئے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ قرآن مجید کی بڑی سورتوں میں سے ایک سورۃ کا نام ہی عورتوں کے نام پر رکھا گیا ہے "سورۃ النساء" کیا ہندو مذہب کا کوئی جاننے والا بتائے گا کہ اس کے مذہب میں اور اس کی کسی مقدس کتاب میں عورت کے نام سے کوئی لیکھ ہو یا اس کے عنوان سے ذکر ہو۔ لیکن جہاں پر ایک سورۃ سورۂ بقرہ ہے، سورۂ آل عمران اور پھر ساری سورتیں قرآن مجید کی ہیں وہیں ایک سورۃ النساء بھی ہے اور پہلے دن سے اس وقت تک اس کا یہ نام چلا آ رہا ہے اور یہ عورتوں کے لئے ہے، ترقی اور علم دین حاصل

کرنے اور دین میں ترقی اور اس میں امتیاز پیدا کرنے اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے اور اللہ کا مقبول بندہ اور بندی بننے اور اس کے یہاں اونچا مقام حاصل کرنے کی پوری پوری صلاحیت اور پورے امکانات اور پہلی صدی سے لے کر اس وقت تک موجود ہیں اور آج بھی ایسا ہو سکتا ہے۔

اخلاقی احتساب میں بھی شریک ہیں

قرآن مجید صرف طاعات و عبادت اور مذہبی فرائض ہی کے سلسلہ میں مردوں اور عورتوں کی مساوات و شرکت کا ذکر نہیں کرتا، بلکہ اس کی تعلیمات کی رو سے باصلاحیت مرد علماء اور بڑے ہمت و عزم رکھنے والے مردوں اور نمایاں افراد کے ساتھ ساتھ اخلاقی احتساب "امر بالمعروف، نہی عن المنکر" یعنی اسلامی معاشرے کی نگرانی و رہنمائی، اس کو غلط راستے پر چلنے سے روکنے اور صحیح راستہ پر چلانے کے سلسلہ میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی ذمہ داری میں شریک ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ایمان والے مردوں، ایمان والی عورتوں کو ایک متحدہ اور خیر و تقویٰ پر تعاون کرنے والی جماعت کی ایک محاذ کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے، وہ فرماتا ہے:-

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ، يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ،وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَوَيُطِيْعُوْنَ اللهَ

ایمان والے (مرد) اور ایمان والی (عورتیں) ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، نیک باتوں کا آپس میں حکم دیتے ہیں، اور بُری باتوں سے روکتے ہیں، نماز کی پابندی رکھتے ہیں، زکوۃ دیتے رہتے ہیں، اور اللہ اور اس کے

وَرَسُوْلَهٗ، أُوْلٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ.

(سورۂ توبہ: ۷۱)

رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ ان پر ضرور رحمت کرے گا، بے شک اللہ بڑا اختیار والا ہے، اور بڑی حکمت والا ہے۔(۱)

---

(۱) ۱۔ تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ر فروری ۱۹۸۱ء

۲۔ تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵ر اپریل ۱۹۸۶ء

۳۔ تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۹۶ء

تینوں مختلف تقریروں سے مشترک اخذ و تلخیص ہے۔

اچھی زندگی کی ضمانت

مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ.

''جو شخص بھی کوئی نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت۔ بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو، تو ہم اس شخص کو (دنیا میں تو) بالطف زندگی دیں گے، اور (آخرت میں) ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے''۔(سورہ نحل۔ ۹۷)

مرد اور عورت کا الگ الگ تذکرہ

یہ آیت ذہن کو بہت متوجہ کرنے والی ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے عمل صالح کے تذکرہ میں مرد اور عورت کا الگ الگ تذکرہ کرتے ہوئے توجہ دلائی ہے۔ اس طرح عورت کو بھی اسی توجہ کا مستحق دکھایا ہے جس کا مرد کو، اور عملِ صالح کا جو فائدہ بتایا ہے وہ بہت عظیم ہے، عمل صالح کا فائدہ یوں تو سب کو معلوم ہے اور اس کا ذکر بھی سب کرتے ہیں لیکن اس آیت میں جو فائدہ بتایا گیا ہے وہ اپنی خاص نوعیت و اہمیت رکھتا ہے جو بہت اہم ہے لیکن اس کی طرف اس آیت کے پڑھنے

والوں کا ذہن عموماً کم گیا ہے، گذشتہ زمانے سے لے کر اس وقت تک کتنے حفاظ گزرے ہیں اور حافظوں کو قرآن حفظ یاد ہے اور ہوگا اور عالموں نے اس کی تفسیر بیان کی ہے لیکن بہت کم اس پر غور کرنے کی نوبت آئی کہ اس میں کتنی بڑی بشارت سنائی گئی ہے وہ یہ کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

کہ جو بھی نیک کام کرے گا (مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ) مرد ہو یا عورت (من ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً) ہم اس کی ضرور اچھی زندگی گزروائیں گے۔

یہ سب ساری دوڑ دھوپ دنیا میں جو ہو رہی ہے، امریکا سے لے کر انڈونیشیا تک اور ہماری اسلامی دنیا میں مراکش سے لے کر شمالی افریقہ پھر یمن، انڈونیشیا اور ملیشیا تک سب کا حاصل یہ ہے کہ اچھی زندگی کیسے حاصل ہو، اس کے لئے کیا کوشش کی جائے، اور اس کے کیا اسباب اور کیا ذرائع ہیں اور کس طرح یہ دولت حاصل کی جائے، آپ دیکھیں گے کہ پرائمری اسکولوں سے لے کر یونیورسٹی تک، یونیورسٹیوں کے بعد خاص مضمون کی بڑی بڑی جو یونیورسٹیاں، جامعات اور بڑی اکیڈمیاں ہیں، جو غور و فکر کرنے کے لئے ہی بنائی اور قائم کی گئی ہیں اور بڑے بڑے مصنفین ہیں ان سب کا جو مشترک موضوع ہے وہ یہ کہ ایسی زندگی کیسے حاصل ہو۔ یہاں تک کہ سیاست اور انتخابات اور جمہوریت اور صحافت، یہ ساری چیزیں بھی اس کی معاون ہیں، کم سے کم یہ کہ وہ اس کا اعلان کرتی ہیں کہ ہم اس کا راستہ دکھائیں گے، رہنمائی کریں گے۔

اچھی زندگی کی ضمانت

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ایک بہت بڑی بشارت سنائی ہے "مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ

الصَّالِحَاتِ"، جو اچھے کام کرے گا اور اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق ہوں، کام اللہ کی منشاء کے مطابق ہوں، اس کے رسولؐ کی منشاء و فرمان کے مطابق ہوں اور دینی احکام کے مطابق ہوں، پھر آخری آسمانی صحیفہ قرآن مجید کے مطابق ہوں تو ہم اس کی اچھی زندگی گزروائیں گے، اس میں دنیا کی زندگی بھی آجاتی ہے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس میں صرف آخرت ہی کی بشارت دی گئی ہے، "حیٰوۃً طیّبۃً" جو لوگ عربی جانتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں نکرہ کا لفظ ہے "الحَیٰوۃُ الطَّیِّبَۃُ" بھی نہیں کہا گیا ہے۔ "فَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً" ہم ہر طرح کی اچھی زندگی اس کی گزروائیں گے۔ یہ ساری کوشش اس بات کی ہو رہی ہے، یہ دوڑ دھوپ، یہ محنتیں، اور یہ راتوں کا جاگنا، اور یہ کتابوں پر محنت کرنا، پرائمری سے لے کر یونیورسٹیوں تک پڑھنا پڑھانا، اور پھر اس کے بعد ڈگریاں حاصل کرنا، کوئی انجینیرنگ کا راستہ اختیار کرتا ہے، اور کوئی ادب اور لٹریچر کا راستہ اختیار کرتا ہے، سب کا مشترک مقصد اور ہدف و نشانہ یہ ہے کہ اچھی زندگی حاصل ہو۔

اور کیا آدمی چاہتا ہے کہ بڑی تنخواہ ہو، رہنے کے لئے اچھی بڑی کوٹھی اور سواری کے لئے اعلیٰ درجہ کی موٹر اور ہوائی جہازوں پر سفر کرنا اور پھر اس کے بعد سیاست میں آئے تو وزیر اعظم بن جانا اور پھر پارلیمنٹ میں ممبر بن جانا سب اس لئے کیا جاتا ہے کہ ہم آرام اور سُکھ کی زندگی گذار سکیں، اس کو سُکھ کہتے ہیں، یہ ایک عام لفظ ہے اور بہت وسیع کہ ہم سُکھی ہوں، دُکھی نہ ہوں، ہم سُکھ کی زندگی گذار سکیں، اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کی ضمانت لے لی ہے اور فرمایا ہے کہ اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ نیک عمل کرے، ہمارے احکام کے مطابق اگر عمل ہوگا

"فَلَنُحْيِيَنَّهُ" لام کے ساتھ کہا، جب کہنا ہوتا ہے عربی میں ایسا ضرور ہوگا، ایسا ضرور کریں گے تو اس کو لَنَفْعَلَنَّ، لَنَذْهَبَنَّ لِنَعْلَمَن کے وزن پر استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے حالانکہ اللہ کا قول، فرمان خداوندی ہے، اس میں شک کیا ہو سکتا تھا، لیکن ہمیں اطمینان دلانے کے لئے مردوں اور عورتوں کو اطمینان دلانے کے لئے ہم ضرور اس کی اچھی زندگی گزروائیں گے اور کیا چاہئے کہ دنیا میں یہ کس لئے دوڑ دھوپ ہو رہی ہے، کس لئے اپنی صحتیں خطرے میں ڈالی جا رہی ہیں، کس لئے مقابلے ہیں، کس لئے یہ دوڑ دھوپ ہے؟- سب اسی لئے ہے کہ اچھی زندگی گزرے-!

اب اچھی زندگی کسی نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اچھی تنخواہ ہو، حالانکہ اچھی تنخواہ میں اچھی زندگی گزرنا ہرگز یقینی نہیں۔ لاکھوں مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ اچھی بڑی تنخواہ ہے لیکن زندگی اچھی نہیں۔ یا صحت خراب ہے۔ یا آپس میں نااتفاقی ہے، یا اطمینان قلبی نہیں ہے، کوئی ڈر لگا ہوا ہے، یا کوئی خطرہ ہے، یا کوئی ایسا مرض ہو گیا ہے، کوئی عارضہ ہو گیا ہے، کچھ ہو گیا ہے، وہم ہونے لگا ہے، یا صحت میں بھی خرابی آگئی ہے کہ بڑی تنخواہ، بڑی کوٹھی، شاندار موٹر سب ہے، اولاد ہے، لیکن مزہ نہیں آرہا ہے زندگی میں۔

نعمت، جس کو زندگی کی نعمت کہتے ہیں وہ حاصل نہیں ہو رہی ہے، تو یہ بات سوچنے کی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو ہمارے احکام پر عمل کرے گا، ہماری شریعت پر عمل کرے گا، ہمارے رسولؐ کے فرمانوں پر عمل کرے گا، نہ وہ دیکھے گا کہ رسموں میں کیا ہوتا ہے، نہ یہ دیکھے گا کہ کون سی چیز بڑے فخر کی سمجھی جاتی ہے، کس بات پر

تعریفیں ہوتی ہیں، کس بات میں عزت ملتی ہے، کس بات میں دولت ملتی ہے، کوئی اس کا خیال نہیں کرے گا، کوئی اس کا خیال نہ کرے۔ صرف یہ کہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم ہے، شادی بیاہ کس طرح ہونا چاہئے، بچوں کی پرورش کیسے کرنی چاہئے، گھر میں کس طرح کی زندگی رائج کرنی چاہئے، نمازوں کی پابندی ہو، پردہ ہو، حیا و شرم ہو، ایک دوسرے کا احترام ہو، غرور نہ ہو، تعلّی نہ ہو، اسراف و فضول خرچی نہ ہو، ناجائز رسمیں نہ ہوں، اور یہ دوسروں کو خوش کرنے کے لئے۔ اللہ کو ناراض کرنا بالکل آسان سمجھا جائے یہ نہ ہو......

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر یہ باتیں نہ ہوں گی تو ہم ضرور اس کی اچھی زندگی گزروائیں گے یعنی دنیا میں بھی، اور اس کی ہزاروں نہیں لاکھوں مثالیں ہیں، اگر آپ حدیث پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ جن گھروں میں اور جن خاندانوں میں شریعت کی پابندی کی گئی، احکامِ خدا اور احکامِ رسولؐ پر عمل کیا گیا اور اسلامی زندگی کا جو نمونہ اور سانچہ ہے، اسلامی زندگی کا جو ماڈل ہے۔ وہ اختیار کیا گیا، رسموں کو نہیں دیکھا گیا، رواج کو نہیں دیکھا گیا، بلکہ یہ دیکھا گیا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم کیا ہے؟ جن لوگوں، خاندانوں، برادریوں اور جن ملکوں اور جن معاشروں نے اور جس سوسائٹی نے اس پر عمل کیا اس کو اللہ نے دنیا میں جنت کی زندگی کا مزہ چکھا دیا۔ اس میں شبہ نہیں، ہم مبالغہ سے نہیں کہہ رہے ہیں، دنیا ہی میں ان کو جنت کی زندگی کا مزہ آگیا کہ بس معلوم ہوتا تھا کہ ہم جنت میں ہیں، محبت کا دور دورہ ہے، ایک دوسرے کا حق ادا کیا جاتا ہے، یہاں کسی کا حق مارا نہیں جاتا، کسی کو حقارت و ذلت کی نظر سے دیکھا نہیں جاتا، کوئی فضول بات نہیں کہی جاتی، کوئی ناجائز آمدنی

باہر سے نہیں، بس اللہ پر توکل اور اللہ کا نام لینا، پابندی کے ساتھ نماز پڑھنا، حلال روزی کھانا، حرام کا پیسہ کیا حرام کی پائی بھی گھر میں نہ آنے پائے، جن گھروں میں اس کی پابندی کی گئی ان کے گھر جنت کا نقشہ ہیں، ان گھروں پر بادشاہوں کے محلات اور شاہوں کی کوٹھیاں قربان، ان کے سامنے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی جیل خانہ ہے، دیکھنے میں باہر سے کتنی شاندار کوٹھی ہے، بڑی بڑی دیواریں ہیں، یہ سب ہے لیکن اندر جہنم کی زندگی ہے۔ بیوی اور شوہر میں محبت نہیں ہے، ماں بیٹے میں محبت نہیں ہے، نہ ماں میں وہ شفقت ہے، نہ بیٹے میں وہ احترام ہے، نہ کسی کمزور پر ترس آتا ہے نہ کسی غریب کی مدد کی جاتی ہے اور سوائے کھانے پینے اور سوائے فخر و غرور کے اور دکھاوے کے لئے مظاہرے کرنے کے کوئی اور یہاں کام ہی نہیں ہے۔

آپ اس بات کا خیال رکھیں اور یہ اللہ نے موقع دیا ہے کہ مرد عورت دونوں کوشش کرکے اور شریعت کے مطابق زندگی گزار کر اور اللہ کی فرمانبرداری کرکے اور اس کے رسولؐ کی شریعت پر چل کر وہ بڑی سے بڑی ترقیاں حاصل کرسکتے ہیں اور ترقیاں بھی کیسی روحانی ترقی ...... اس لئے کہ یہ دولت، علم کی دولت مردوں کے ساتھ مخصوص نہیں، مرد و عورت دونوں کے لئے ہے(۱)۔

تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰/۱اکتوبر ۱۹۹۶ء

ازدواجی زندگی کے رہنما خطوط

یَاۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِیْراً وَّنِسَاءً وَاتَّقُوْا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَاءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْباً(۱). یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ(۲). یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِیْداً یُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَیَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِیْماً(۳).

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا (یعنی اول) اُس سے اُس کا جوڑا بنایا، پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد عورت (پیدا کر کے روئے زمین پر) پھیلا دیئے، اور خدا سے ڈرو جس کے نام کو تم اپنی حاجت براری کا ذریعہ بناتے ہو، ڈرو اور (قطع مؤدت) ارحام سے (بچو) کچھ شک نہیں کہ خدا تمھیں دیکھ رہا ہے۔ مؤمنو! خدا سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔ مؤمنو! خدا سے ڈرا کرو، اور سیدھی بات کہا کرو، وہ تمھارے اعمال درست کردے گا، اور تمھارے گناہ بخش دے گا، اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا، تو بے شک بڑی مراد پائے گا۔

(۱) سورہ النساء: ۱۔ (۲) سورہ آل عمران: ۱۰۲۔ (۳) الاحزاب: ۷۰ تا ۷۱

نکاح ایک مسلسل عبادت ہے

یہ نکاح، یہ عقد کوئی غیر اجتماعی یا فطری ضرورت کی تکمیل نہیں ہے بلکہ ایک عبادت ہے، انبیاء علیہم السلام کی سنت رہی ہے اور سید الانبیاء محمد رسول اللہؐ کی محبوب سنت اور شعار ہے، اس لئے اس کے ساتھ جیسا کہ اسلام کا قاعدہ ہے ایک پیغام ہے اور اہم ذمہ داری کا احساس دلایا گیا ہے۔ اللہ کی بندگی کا، عبودیت کا، اور اپنی ذمہ داری کا، اور اس کے متعلق جو احکام ہیں، شریعت کے جو حقوق و فرائض ہیں، ان کی بھی یاد دہانی کی گئی ہے۔

یہ جو آیتیں پڑھی گئیں یہ نکاح کے خطبہ کی آیتیں ہیں اور وہ مشہور ہیں، ثابت ہیں، ان میں پورا پیغام ہے، خوشگوار فریضہ کے لئے بھی اور ساری عمر کے لئے بھی، اور ساری زندگی کے لئے ضابطۂ حیات اور ہدایات ہیں، اور پوری زندگی کے بارے میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکام اور اس کی ہدایات کا ذکر آگیا ہے۔ یہ آیت سورۃ النساء کی ہے، اسی سے عورتوں کا درجہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نام سے ایک طویل سورۃ نازل ہوئی جس کا نام سورۂ نساء ہے اس سے معلوم ہوا کہ پورے اسلامی معاشرے میں عورتوں کا ایک درجہ، ان کا ایک مقام ہے اور ان کے حقوق ہیں اور اس کے فرائض ہیں، ان کے بارے میں احکامات ہیں جیسا کہ پہلی آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے:- یاایھا الناس سے خطاب کیا گیا ہے اس لئے کہ یہ انسانی حیثیت رکھتا ہے، قلبی حیثیت رکھتا ہے، یاایھاالناس سے خطاب کیا گیا ہے کہ اے انسانو! کہ جب تم انسان ہو، تمھاری ضروریات ہیں، فطری

تقاضے بھی ہیں بلکہ شرعی، فطری، اخلاقی تقاضہ یہ ہے کہ ایک رفیق حیات ہو، کوئی بھی ایسا جوڑا ہو، جس سے وہ اپنی زندگی کو شرعی طریقے پر بھی، طبعی طریقے پر بھی اور فطری طریقے پر بھی مکمل کر سکے، خود اللہ نے خطاب کیا ہے کہ اے لوگو! ڈرو اور لحاظ کرو اپنے پروردگار کا کہ جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور پھر اسی سے اس کا جوڑا بھی پیدا کیا۔

نسل انسانی کے آغاز کا ذکر

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کے آغاز کا ذکر کیا ہے۔ یہ مبارک ترین آغاز ہے دنیا کی تاریخ جس سے بنتی ہے اور جس سے ہم سب کا تعلق ہے، ہمارے آباو اجداد کا تعلق ہے، اگلی نسلوں کا بھی تعلق ہے، اور انشاء اللہ پچھلی نسلوں کا بھی ہوگا۔ نسلِ انسانی کے آغاز کا جس سے اس دنیا میں اور زندگی میں معنویت پیدا ہوئی اور اس کی قدر و قیمت پیدا ہوئی، جس کا اللہ تعالیٰ ذکر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو ایک انسان سے شروع کیا لیکن اسی کے ساتھ اس کا جوڑا پیدا کیا اور دونوں کے مل جانے سے، نکاح سے اور شرعی طریقہ پر اخلاقی اور قانونی طریقہ پر اللہ کے حکم کے مطابق جو ان لوگوں نے تعلق قائم کیا اس میں ایسی برکت ہوئی کہ آج ساری دنیا، یہ خرابہ، زمین جس کو کہتے ہیں یہ آباد ہے، یہ دنیا ویران ہوتی اگر انسان نہ ہوتا، تو اللہ تعالیٰ نے اس آغاز کا ذکر کر کے گویا فال نیک کے طور پر، بشارت کے طور پر کہا کہ دو کے ملنے کو تم معمولی بات نہ سمجھو، دو ہی تھے جو ملے تھے شروع میں جن سے اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی نسل پیدا کر دی۔

یہ ایک ایسے مبارک واقعہ کی یاد دہانی ہے جس سے انسان نصیحت حاصل کر سکتا ہے اور اطمینان و اعتماد حاصل کر سکتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ سے بڑی بڑی امیدیں قائم کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس اللہ سے ڈرو اس کا پاس و لحاظ کرو جس نے تم کو ایک اکیلی ہستی سے پیدا کیا تھا، اتنی بڑی دنیا اور ایک اکیلی ہستی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ اس کی شریک زندگی پیدا کیا، ان دونوں کو ملایا اور ان دونوں کے ملنے سے مردوں اور عورتوں کی وہ تعداد پیدا کی جن کو کوئی دنیا کا اعداد و شمار کرنے والا، کوئی تاریخ داں اور نہ کوئی حساب داں شمار کر سکتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس اللہ سے ڈرو، شرم کرو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، یہ ایک خاندان کا دوسرے خاندان سے، ایک شریف مسلمان خاندان کا دوسرے شریف مسلمان خاندان سے سوال کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو سب کچھ دیا ہے ہمارے فرزند کو اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا ہے۔ زندگی عطا کی، عقل و ہوش عطا کی، علم عطا کیا اور دوسری صلاحیتیں بھی دے رکھی ہیں۔ لیکن اس کی زندگی میں ایک خلا ہے، وہ خلاء پر نہیں ہو سکتا بغیر ایک رفیقۂ حیات کے، ایک شریک زندگی کے، آپ ہمیں ایک شریک زندگی دیجیے۔

سوال و جواب کا رشتہ

یہ بھی ایک سوال ہے، نہایت مہذب سوال ہے، لیکن بہر حال سوال ہے اور ہماری پوری زندگی سوالات و جوابات کا ایک جال ہے جس میں ہر حلقہ جال کے

دوسرے حلقہ سے پیوست ہے، اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا، ہر انسان سائل ہے، ہر انسان مسئول ہے۔ ایک بڑے سے بڑا انسان بھی سوال پر مجبور ہے، یہ بیع و شراء کا، یہ خرید و فروخت کا معاملہ کیا ہے؟ سوال ہے، یہ حاکم و محکوم کا تعلق کیا ہے، سوال و جواب ہے یہ آپس کے عزیزانہ تعلقات کیا ہیں سوال و جواب، یہ تعلیم و تعلم کیا ہے، پڑھنا لکھنا کیا ہے، استاد و شاگرد کے درمیان سوال و جواب ہے۔ سوال و جواب کا رشتہ آپ دیکھیں گے ہماری پوری زندگی میں چھایا ہوا ہے، اگر ایک طالب علم پڑھتا ہے تو وہ سائل ہے، ایک استاد پڑھاتا ہے تو وہ مسئول ہے، اسی طرح سے جس کے پاس کوئی چیز ہے اور دوسرا اس کا محتاج ہے جو محتاج ہے وہ سائل ہے اور جس کے پاس چیز ہے وہ مسئول ہے، لیکن وہی مسئول جو کسی کو دے رہا ہے وہ کسی اور کا سائل ہے، اس دنیا میں کوئی فرد سائل ہونے سے مستثنیٰ نہیں ہے، بڑے سے بڑا معزز یہاں تک کہ کسی مملکت کا صدر بھی ایک طرح کا سائل ہے، نہایت معزز سائل، بڑے اختیارات رکھنے والا سائل، لیکن ہے وہ بھی سائل ہی، اس کو بھی ضرورت ہے، اگر اس کی مملکت کے انسان نہ ہوں اس کے کام چلانے والے نہ ہوں، جن پر حکومت کرتا ہے کم سے کم وہ نہ ہوں تو وہ کاہے کا حاکم ہوا اور کاہے کی اس کی مملکت ہوئی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس اللہ سے ڈرو، اس کا پاس رکھو، جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، تمھیں کیسے جرأت ہوئی ایک خاندان کی ایسی ہستی کو مانگنے کی جس پر کسی غیر کی نگاہ نہیں پڑ سکتی، جس کو پردہ میں رکھا جاتا ہے، جس کی عزت کو اپنے خاندان کی عزت سمجھا جاتا ہے، اس کو مانگنے کی تم کو جرأت

کیسے پیدا ہوئی؟ یہ اللہ کے نام کا واسطہ تھا، یہ اسلام کا رشتہ تھا، یہ اسلام کا اشتراک تھا۔ یہ وہ چیز تھی جو دو خاندانوں کو ملاتی ہے، جو افراد کو ملاتی ہے، بعض اوقات قوموں کو ملاتی ہے، بعض اوقات نسلوں کو ملا دیتی ہے، تو جس خدا کے نام پر تم سوال کر رہے ہو، لڑکے والوں نے لڑکی والوں سے سوال کیا تو اس نام کا اتنا ہی فائدہ نہ سمجھو کہ کام نکال لیا بلکہ اس نام کا ہمیشہ ادب ملحوظ رکھو اور جب یہ نام لیا جائے تو اس کا احترام کرو اور اس نام کا حق ادا کرو، اگر اذانیں ہو رہی ہیں تو اس میں اس کا نام لیا جا رہا ہے اگر شریعت کا حکم بیان کیا جا رہا ہے تو اس میں اس کا نام لیا جا رہا ہے۔ اگر حلال و حرام کی بحث ہے تو اس میں اللہ ہی کا نام بیچ میں ہے، اگر کوئی کسی کو ڈراتا ہے کہ خدا سے ڈرو تو اس میں بھی خدا ہی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بڑی خود غرضی کی بات ہے اور شرافت کے معیار سے گری ہوئی بات ہے کہ آدمی اپنا کام نکال لے اس کا نام لے کر پھر بھول جائے ایک مسلمان کو یہ نہیں چاہئے۔ فرماتا ہے کہ واتقوا اللہ الذی تسآءلون بہٖ اس خدا سے ڈرو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو۔

رشتہ داریوں کا بھی خیال کرو

"وَالْاَرْحَامِ" اور رشتہ داریوں کا بھی خیال کرو۔ آج نیا رشتہ قائم ہو رہا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی نیا رشتہ قائم ہوتا ہے تو پرانے رشتوں کو بھلا دینا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ بعض بعض معاشرتوں میں اور بعض تہذیبوں میں، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ نہیں، یہ رشتہ مبارک لیکن اس سے پہلے کے جو رشتے

ہیں وہ سب اپنی جگہ پر ہیں، جو حقوق و فرائض ہیں، ان کی ذمہ داریاں اپنی جگہ پر ہیں، ماں اپنی جگہ پر ہے باپ اپنی جگہ پر ہے، بہنیں اپنی جگہ پر ہیں، بھائی اپنی جگہ پر ہے، ایک نئے رشتہ سے وہ رشتے ختم نہیں ہوں گے، فرمایا "وَالْاَرْحَامِ" رشتہ داریوں کا خیال رکھنا جس کا جو حق ہے اسے ادا کرنا۔ لڑکے کو بھی یہ نصیحت ہے، لڑکی کو بھی یہ نصیحت ہے، ان کے گھر والوں کو بھی یہ نصیحت ہے۔

اور اگر کوئی کہے کہ یہ تو وقت کی بات ہے کون دیکھتا ہے اور کون جانتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْباً" بے شک اللہ دیکھنے والا ہے وہ ہر ایک کے ساتھ ہے اور ہر وقت ہے۔

مرتے دم تک مسلمان رہنا

دوسری آیت جو میں نے پڑھی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جتنا کہ ڈرنے کا حق ہے اپنی طرف سے معیار مقرر نہ کرو کہ ہم تو بہت ڈرتے ہیں جسے اللہ کہے کہ ہاں یہ ڈرنا ہے، جسے شریعت کہے کہ ہاں یہ ڈرنا ہے، جس کو خوف کہتے ہیں، جس کو ڈرنا کہتے ہیں، جس کو احتیاط کہتے ہیں، جس کو قانون پر چلنا کہتے ہیں وہی معتبر ہے، تو اللہ سے ڈرو جتنا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے "وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ" یہ خدا کے پیغمبر ہی کے کہنے کی بات تھی ورنہ کوئی مبارکباد دینے والا، کوئی عزیز بھی اس موقع پر یہ نہیں کہتا، پیغمبر پیغمبر ہے وہ ایسی ابدی حقیقتوں کا اعلان کرتا ہے جو حقیقتیں کبھی فنا نہیں ہوتیں، اللہ تمھیں مبارک کرے ایسی بہت سی خوشیاں تمھیں مبارک کرے۔ اور

یہ خوشیوں کا ایک سلسلہ ہوگا انشاء اللہ، لیکن اس کو نہ بھولنا کہ تمھیں اس دنیا سے جانا ہے "وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ" زندگی گذارو فرمانبرداروں کی طرح اور جب جاؤ تو فرمانبرداروں کی طرح، ہمارا سر خدا کے سامنے جھکا ہوا ہو، ہمارے دل میں خدا کی محبت اور اس کے رسول کی عظمت ہو، ہماری زبان پر اس کا کلمہ ہو۔

قولِ مرداں جان دارد

اس کے بعد آخری آیت جو ایجاب و قبول سے پہلے پڑھنے والی ہے اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِیْداً" اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچی بات کہو کہ "قول مرداں جان دارد" یہ پتھر کی لکیر نہیں ہے کہ زبان ہلا دی اور کہہ دیا کہ ہم نے قبول کیا بلکہ جب یہ کہو کہ ہم نے قبول کیا تو سوچ سمجھ کر اور اس کی پوری ذمہ داریوں کو اپنے ذہن میں تازہ کر کے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں، ان کا کیا مطلب ہے اور اس کے کیا تقاضے ہیں، اس کا سلسلہ کہاں تک جائے گا؟

فرماتا ہے کہ اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچی و پکی بات زبان سے نکالو اگر تمھیں سچی اور پکی بات زبان سے نکالنے کی عادت پڑ گئی تمھارا کیریکٹر بن گیا، تمھارا کردار بن گیا، تمھارا اصول زندگی بن گیا تو کیا نتیجہ ہوگا یہی نہیں کہ یہ عقد صحیح ہو بلکہ، "یُصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ" اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہارے تمام کاموں کو درست کر دے گا۔

آج دنیا کی ساری خرابی، ہمارے تمدن میں سب کچھ ہے، سارے وسائل و ذرائع موجود ہیں، کتنی ایجادات ہیں اور کتنے آرام حاصل کرنے کے ذرائع ہیں،

لیکن کیا چیز کم ہے؟ ذمہ داری کا احساس نہیں......! آدمی جو چاہتا ہے اپنا کام نکالنے کیلئے، نکال لیتا ہے پھر بھول جاتا ہے......فرمایا "یُصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ" اس کی برکت سے تمھارے سارے اعمال کو اللہ درست فرمادے گا، تمدن کی چول بیٹھ جائے گی، معاشرہ کا مزاج درست ہو جائے گا، ہر ایک کو راحت ملے گی اور یہ نہ ہوگا کہ انسان ایک بازار میں ہے یا جنگل میں ہے جہاں پرندوں سے کام ہے یا سوداگروں سے کام ہے اور کسی کو کسی سے مطلب نہیں، جیسی ضرورت سمجھی ویسی زبان سے نکال دیا۔ "یُصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ" اللہ اس کی برکت سے تمھارے سارے اعمال درست فرمادے گا۔

"وَیَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ" اور پھر یہ ایک عبادت ہے، نبی کی سنت ہے، اس لئے اس کے ذریعہ سے اللہ تمہارے گناہوں کو بھی معاف کردے گا......

عام طور سے نکاح کی تقریب کو ایک رسمی، فکری اور معاشرتی تقریب سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ عبادت ہے اس کے بعد جو زندگی گزرے گی وہ عبادت میں گزرے گی اور جیسا کہ اس زمانے کے شاہ محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ آدمی جب تک نماز پڑھتا ہے اس کو ثواب ملتا ہے، سلام پھیرا تو ثواب ختم ہو گیا لیکن نکاح کرنے کے بعد سے آخر وقت تک ثواب ملتا رہے گا، کما کر لائے گا کھلائے گا۔ اس نیت سے ثواب ملے گا، محبت کے ساتھ بولے گا، ساتھ رہے گا اس کا ثواب برابر رہے گا۔ فرمایا: "وَمَنْ یُّطِعِ اللہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِیْمًا"۔ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا تو وہ پورے طور پر کامیاب ہوا۔(۱)

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ر فروری ۱۹۸۸ء و ۲۵ر جولائی ۱۹۹۷ء کی دو مختلف تقریروں سے مشترک ماخوذ ہے

انسانی معاشرہ میں عدل و احسان (انصاف و نیکی) کی اہمیت

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ. يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ.
(النحل۔۹۰)

بے شک اللہ تعالیٰ اعتدال اور احسان کا اور اہل قرابت کو دینے کا حکم فرماتے ہیں، اور کھلی برائی اور مطلق برائی اور ظلم سے منع فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ تم کو اس لئے نصیحت فرماتے ہیں کہ تم نصیحت قبول کرو۔

زندگی کا دستور العمل

قرآن مجید کی یہ آیت نماز جمعہ کے خطبہ کا جزء ہے، ہر ہفتہ مسلمان اسے سنتے ہیں، پڑھتے ہیں، چونکہ ہم عربی زبان سے ناواقف ہیں، عام طور پر خطبہ اور نمازوں میں جو عربی میں پڑھا جاتا ہے، اس کو غور کرنے کی چیز نہیں سمجھتے، بلکہ عبادت کا ایک وظیفہ سمجھتے ہیں، اس میں کیا سبق ہے؟ کیا پیغام ہے؟ اس پر غور کرنے یا کسی جاننے والے سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، انہی میں یہ آیت بھی ہے جو دراصل پوری زندگی کا منشور ہے MANIFESTO

دستور العمل، ضابطہ، قانون، ہدایت نامہ (Directive) ہے، اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے عدل کا، احسان کا، یہ نہیں کہتا کہ کس کے ساتھ انصاف و احسان کرنا چاہئے بلکہ مطلق انصاف اور احسان کا حکم دیتا ہے، ہر شخص کو انصاف، احسان اور نیکی کرنا چاہئے، اس کے بعد جب دینے دلانے کا ذکر آتا ہے تو اس میں تھوڑی سی تخصیص کرتا ہے "وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبیٰ" پھر اس میں بھی ذکر خونی رشتہ کا نہیں کہ چچا زاد بھائی ہوں، ماموں زاد ہوں، اولاد ہو، بلکہ کہتا ہے قربت والے لوگ، قربت کئی طرح کی ہوتی ہے، رشتہ کی قربت، پڑوس کی قربت، ہم وطنی کی قربت، پیشے کی قربت، قرآن مجید میں دوسری جگہ اس کی ذرا سی تشریح آئی ہے، زیادہ دور کے، زیادہ قریب کے، اس میں بھی کچھ گنجائش ہے، صرف یہی نہیں بلکہ خونی رشتے ہوں۔

پھر اللہ تعالیٰ بے حیائی کے کاموں، نامعقول باتوں اور نامناسب رویئے سے روکتا ہے، تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

آج انصاف صورت پہچان کر، ناپ تول کر، دیکھ بھال کر، سوچ سمجھ کر کیا جاتا ہے، معاملہ اپنے کسی عزیز، کسی ہم مذہب، ہم برادری، ہم قبیلے کا ہو تو انصاف کے لئے دل کھل جاتا ہے، تقاضہ پیدا ہوتا ہے، انصاف کرنا آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن انصاف کا معاملہ کسی ایسے فرد کا ہو جس سے کوئی خونی رشتہ نہیں، جس کے ساتھ انصاف کرنے میں کوئی خاص مادّی فائدہ نہیں، تعریف و تحسین نہیں بلکہ تنقید کا اندیشہ ہے تو وہاں انصاف کے لئے قدم نہیں اٹھتا، قلم نہیں چلتا۔

انصاف کیلئے بھی کسی ٹریڈ مارک، برادری، خاندان، دیش اور قوم (Nation)

کی ضرورت پڑتی ہے۔

مگر وہ انصاف جو برائے انصاف ہو، وہ انصاف جو خدا کا حکم سمجھ کر، کسی کا حق مان کر، کسی سچائی کو تسلیم کر کے کیا جائے اور جو بے لاگ ہو، غیر جانبدار ہو، وہ انصاف بہت مشکل ہے، اور اس انصاف کے لئے وہی اللہ کے بندے تیار ہوتے ہیں جن کے دل میں خدا کا خوف اور انسانیت کا احترام ہوتا ہے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔

ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

حدیث میں آتا ہے "الخلق عیال اللہ" ساری مخلوق اور جتنے انسان ہیں، وہ خدا کا کنبہ ہیں، یہ آخری بات اس مذہب نے کہی ہے جس کو عیقدۂ توحید پر ذرا سی آنچ گوارا نہیں، آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں ہر وہ چیز جس سے توحید مجروح ہوتی ہو ناپسندیدہ ہے، یہاں تک کہ گنتی میں بھی وتر کو پسند کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت میں جو مذہب اتنا حساس (Sensitive) ہو وہ مذہب تمام مخلوق کو خدا کا کنبہ کہتا ہے، یہ کتنی بڑی بات ہے، قرآن مجید کا تہائی حصہ عقیدۂ توحید پر مشتمل ہے، سورۂ اخلاص کو قرآن مجید کا تہائی حصہ کہا گیا ہے، اس میں ہے "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ. اَللّٰهُ الصَّمَدُ. لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ. وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُواً اَحَدٌ" (اے محمد ﷺ! کہہ دیجئے اللہ ایک ہے، وہ بے نیاز ہے۔ سب اس کے ضرورت مند ہیں اور اس کو کسی کی ضرورت نہیں۔ نہ اُس نے کسی کو جنم دیا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا، اور اس کا کوئی ہمسر نہیں)۔

وہ اسلام جس نے سورۂ اخلاص کو "قلب قرآن" اور ثُلثِ قرآن کہا ہے، خدا کی مخلوق اور خدا کے بنائے ہوئے انسانوں کو چاہے وہ کسی بھی مذہب و ملّت کے ہوں، چاہے وہ کسی بھی دیس اور ملک کے ہوں، چاہے وہ کسی بھی نسل یا رنگ کے ہوں، چاہے کسی بھی خاک و خون کے ہوں، اللہ کا کنبہ اور خاندان قرار دیا ہے، اللہ نے سب انسانوں کی پرورش اپنے ذمہ لی ہے۔

انسانوں میں خدا کا پیارا کون ہوگا؟ وہ نہیں جو بہت زیادہ عبادت کرے اور مالا جپے، بلکہ وہ زیادہ پیارا ہوگا جو اس کے کنبے کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچائے، تمام انسانوں کو خدا کا کنبہ کوئی اور مذہب قرار دیتا تو ذہن اسے قبول کر سکتا تھا، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ مذہب جو توحید کے بارے میں ایسا ذکی الحس ہے کہ دوسرا کوئی مذہب نہیں، وہ اسلام کہتا ہے کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے، یہ آخری بات ہے جو اس مذہب نے کہی، اب کہنے کی کوئی بات باقی نہیں رہی۔

انصاف بے رنگ ہوتا ہے

انصاف و احسان کو اللہ تعالیٰ نے کسی کے ساتھ مخصوص نہیں کیا، وہ تو آسمان سے برسنے والے پانی کی طرح بے رنگ ہوتا ہے، اگر آپ اس پانی کو کسی رنگین بوتل میں ڈالتے ہیں تو رنگین نظر آتا ہے، لیکن جب آسمان سے پانی برسا تھا تو اس کا کوئی رنگ نہیں تھا، اسی طریقہ سے انصاف و احسان کا کوئی رنگ نہیں ہے، ہاں اگر انصاف کرنے والا مسلمان ہے تو اس کی نسبت سے کہا جائے گا کہ مسلمان مُنصف، اگر ہندو ہے تو کہا جائے گا کہ ہندو مُنصف۔ مسلمان اور ہندو یہ تو

بوتلوں کے رنگ ہیں، لیکن انصاف اور احسان کا کوئی رنگ نہیں، یہ تو بے رنگ ہیں، بے رنگ رہیں گے اور انھیں بے رنگ رہنا چاہئے۔

کہا گیا ہے "اِنَّ اللّٰهَ يَأمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ" یہ عمومی حکم ہے، "اِنَّ اللّٰهَ يَأمُرُ بِالْعَدْلِ مَعَ الْمُسْلِمِيْنَ، اِنَّ اللّٰهَ يَأمُرُ بِالْإِحْسَانِ اِلَى الْمُسْلِمِيْنَ" نہیں کہا گیا، الحمدللہ رب العلمین کہا گیا ہے، دنیاؤں کا پالنے والا "رب المسلمین، رب الھنود، رب المسیحیین، رب العرب، رب العجم"، یعنی مسلمانوں کا رب، ہندوؤں کا رب، عیسائیوں کا رب، عربوں کا رب، عجمیوں کا رب نہیں کہا گیا۔

تمام جہانوں کا پالنہار، ستارے، چاند، سورج، کہکشاں، نظامِ شمسی، دنیا کے تمام براعظم، نباتات، حیوانات غرض پوری کائنات کے رب نے عدل و انصاف کو بالکل عام رکھا ہے، وہ قومی انصاف، ملکی انصاف، خاندانی انصاف (Family Justice) نہیں، عام انصاف ہے "اِنَّ اللّٰهَ يَأمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ" میں یہی عمومیت ہے۔

قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ فرمایا گیا "وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَئَانُ قَوْمٍ عَلٰى اَلَّا تَعْدِلُوْا. اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى" کسی گروہ، کسی جماعت، کسی برادری سے اگر تم کو تھوڑی شکایت ہو، کدورت ہو، دل میں میل ہو تو یہ بات تمھیں اس حد تک نہ آمادہ کرے کہ تم ان کے ساتھ ناانصافی کرو، جب بھی موقع انصاف اور تول کا آئے تو ترازو جھکنے نہ پائے، پورا پورا حق دو، انصاف سے کام لو کیوں کہ یہ خدا کو خوش کرنے والی چیز اور اس کی ہدایت پر عمل ہے۔

یاد رکھئے! عدل و انصاف اور احسان کو عام ہونا چاہئے، ہم سب کو، خواہ ہم کسی

قوم، کسی مذہب کے ماننے والے ہوں، ہمارے پیدا کرنے والے نے، ہمیں روزی پہونچانے والے ہمارے مالک نے حکم دیا ہے کہ انصاف و احسان میں تفریق نہیں ہونی چاہئے، کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دینی چاہئے(۱)۔

"إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ" اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ انصاف کے اصول کو اپنائیے، اور احسان کو اپنا شعار بنائیے، انصاف تو یہ ہے کہ جتنا دینا ہے دے دو، اور احسان یہ کہ اس سے بھی زیادہ کرلو، اگر تمھارے ساتھ کسی نے ناانصافی کی اور تم انصاف کرو، یہ احسان ہوگا، یہ اعلیٰ اخلاق کی تعلیم ہے(۲)۔

---

(۱) تحفہ انسانیت ص ۶۰۔۶۸ تلخیص۔ (۲) تحفہ دین ودانش ص ۱۷۔

صحت مند معاشرہ کی زندگی کے تین ستون

لَاخَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍمِّنْ نَّجْوٰهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ.

(النساء۔ ۱۱۴)

ان لوگوں کی بہت سی مشورتیں اچھی نہیں، ہاں (اس شخص کی مشورت اچھی ہو سکتی ہے) جو خیرات یا نیک بات یا لوگوں میں صلح کرنے کو کہے۔

آپ غور کریں گے تو یہ تین چیزیں ایسی ہیں، جن پر ایک صالح معاشرہ قائم ہو سکتا ہے، وہ معاشرہ کے تین ستون ہیں، صدقہ، جب تک کہ ایک کو دوسرے کے ساتھ عملی ہمدردی نہ ہوگی، آدمی کی مدد کا جذبہ سینہ کے اندر کارفرمانہ ہوگا، اور وہ ایثار نہ کرے گا، کوئی معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا، ''او معروف'' معروف بھی قرآن مجید کا ایسا لفظ ہے کہ اس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا یعنی معقول و مستحسن بات، جو چیز عُرف میں داخل ہے، اور جس کو فطرتِ سلیم رکھنے والے سب بالاتفاق اچھا کہتے ہیں، اس کا جو حکم دے گا، اب ہر جگہ کا معروف الگ ہوگا، یہاں کا معروف یہاں کے لحاظ سے ہوگا، دوسرے مقام کا معروف وہاں کے لحاظ سے ہوگا، ''او معروف او اصلاح بین الناس'' عام طور پر قبیلوں، خاندانوں میں ''افساد ذات

البین" کا منظر نظر آتا ہے، یعنی آپس کے تعلقات کشیدہ ہیں، بستی بستی، گاؤں گاؤں، قصبے قصبے یہ بیماری پھیلی ہوئی ہے، خاص طور پر جہاں شرفاء آباد ہیں، کسی دل سوختہ شاعر نے یہاں تک کہہ دیا کہ ؎

بہ ہر جا جمع می آیند سادات

فسادات، فسادات، فسادات

اس کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جہاں سادات جمع ہوں، پھر ماشاء اللہ سادات ہی سادات ہیں، اور یوں بھی تشریح ہو سکتی ہے کہ پھر ناانصافیاں ہی ناانصافیاں اور جنگ و جدل ہی کا منظر نظر آئے گا۔

مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے، چور وہیں آتا ہے، جہاں مایہ ہوتی ہے، تو جو جتنا اونچا ہوتا ہے، اسی پر شیطان حملہ کرتا ہے، تو یہ سادات، شیوخ، صدیقی، فاروقی، انصاری، قریشی اور ان کی مختلف شاخیں عثمانی، علوی، عباسی جہاں ہوتے ہیں، ان میں شیطان بہت کامیاب ہو جاتا ہے، اس لئے کہ ان کو ایک دوسرے سے مکدر کرنے اور شاکی بنانے کا کام دوسروں کے مقابلہ میں آسان ہوتا ہے، ان کی حیثیت، حیثیتِ عُرفی بلند ہوتی ہے، کچھ ان کی توقعات ہوتی ہیں، کچھ ان کی عادتیں ہوتی ہیں، کچھ وہ اپنا حق سمجھتے ہیں، شیطان اسی راستہ سے آتا ہے، دیکھو فلاں نے تمھیں سلام ٹھیک سے نہیں کیا، وہ حقیر سمجھتے ہیں، مالی حالت کچھ کمزور ہو گئی ہے، اب وہ اس طرح جُھک کر سلام نہیں کرتے، اب دل صاف نہیں ہے۔

ہر مقام کو ان کی ضرورت ہے

یہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ یہ واقعی ہر جگہ مشترک ہیں، صدقہ، معروف، اصلاح بین الناس، ہر مقام کو ان کی ضرورت ہے، جہاں صدقہ بند ہو جائے، محبت کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، ہنس کر بولنا بھی صدقہ ہے، میٹھی زبان رکھنا اور خوش کلامی بھی صدقہ ہے، اگر کسی کا کوڑا گر جائے، اور وہ سواری پر ہو تو اٹھاکر اس کو دے دو یہ بھی صدقہ ہے، راستہ سے کانٹا ہٹادینا بھی صدقہ ہے، صدقہ کی سیکڑوں قسمیں ہیں، ایک صدقہ کہہ دیا اس لئے کہ یہ سب پر حاوی ہے، یعنی خیر سگالی کا جذبہ، خیر خواہی اور مدد کا جذبہ، اس کے بغیر کوئی معاشرہ، کوئی اجتماعی زندگی اول تو وجود میں نہیں آسکتی اور اگر آئے تو رہ نہیں سکتی، اور پھر معروف "او اصلاح بین الناس" یہ قرآن ہی کہہ سکتا تھا، یہ آیت بھی معجزہ ہے، پورا تمدنِ انسانی پورا معاشرۂ انسانی اسی پر قائم ہے، صدقہ معروف، اصلاح بین الناس، آج ہر جگہ آپ دیکھیں گے کہ اس کے خلاف ہو رہا ہے، کہیں صدقہ کا دروازہ بند ہے، تو کہیں معروف کا دروازہ بند ہے، تو کہیں دونوں چیزیں ہیں، لیکن اصلاح بین الناس کا دروازہ بند ہے، بگاڑنے والے، لڑانے والے پچاس اور ملانے والا ایک .... تو ان تین چیزوں کا خیال رکھئے صدقہ، معروف، اصلاح بین الناس۔

چوتھی شرط اللہ نے یہ لگائی ہے، اس کار خیر میں نیت ہونی چاہئے رضائے الٰہی کی "وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ" ایک اچھا عمل، سیاسی اغراض سے بھی ہو سکتا ہے، تمدنی اور مادّی اغراض سے بھی ہو سکتا ہے، یہ سب اغراض ہیں،

لیکن یہاں اللہ نے فیصلہ کر دیا، "وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْراً عَظِيْماً"۔ جو اللہ کی رضا کے لئے کام کرے اس میں ثواب ہے، یہ نہیں کہ صاحب ہم کریں گے تو وہ بھی کرے گا، اور اچھا ہے کہ اچھی زندگی گذرے گی، یہ نہیں، بلکہ خالص اللہ کی رضا کے لئے۔(۱)

---

(۱) تحفہ دین ودانش ص ۸۹ تا ص ۹۳

باب ٦

تعلیم و تربیت

"میرا عقیدہ ہے کہ علم ایک اکائی ہے، جو بٹ نہیں سکتی، اس کو قدیم و جدید، مشرقی و مغربی، نظری و عملی میں تقسیم کرنا صحیح نہیں، اور جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے۔

دلیلِ کم نظری قصہ جدید و قدیم

میں علم کو ایک صداقت مانتا ہوں جو خدا کی وہ دین ہے جو کسی ملک و قوم کی ملک نہیں، اور نہ ہونی چاہئے، مجھے علم کی کثرت میں بھی وحدت نظر آتی ہے، وہ "وحدت" سچائی ہے، سچ کی تلاش ہے، علمی ذوق ہے، اور اس کو پانے کی خوشی ہے،..........

"میں علم، ادب، شاعری، فلسفہ، حکمت، کسی میں اس اصول کا قائل نہیں ہوں کہ جو اس کی "وردی" پہن کر آئے، وہی "عالم" اور "دانشور" ہے، اور یہ مان لیا گیا ہے کہ جس کے جسم پر وردی نہ ہو وہ نہ مستحق خطاب ہے، نہ لائقِ سماعت، میں علم کی آفاقیت اور علم کی تازگی کا قائل ہوں جس میں خدا کی رہنمائی ہر دور میں شامل رہی ہے، اگر خلوص ہے، اور سچی طلب ہے تو خدا کی طرف سے کسی وقت فیضان میں کمی نہیں"۔ (مولانا علی میاں ندوی)

ایک غیر متوقع آغاز

إقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ. خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. إقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ.
الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ.

”آپ پڑھئے اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ، جس نے (سب کو) پیدا کیا ہے، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا ہے۔ آپ (قرآن) پڑھا کیجئے، اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی ہے، (جس نے) انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دے دی جنھیں وہ نہیں جانتے تھے“۔

(العلق: ۱۔۵)

غارِ حرا میں نبی امیؐ پر یہ پہلی وحی اترتی ہے (جبکہ چھ سو سال(۱) کے طویل وقفہ کے بعد زمین کا آسمان سے بلکہ آسمان کا زمین سے وحی و نبوت کے ذریعہ رابطہ قائم ہوا تھا) تو اس میں عبادت کا حکم اور اللہ کی معرفت اور اطاعت وغیرہ کوئی ایجابی، یا بتوں کے ترک کرنے یا جاہلیت اور اس کے عادات و اطوار پر نکیر جیسی کوئی سلبی بات نہیں کہی گئی، اگرچہ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر اہم تھیں اور

(۱) یہ طویل مدت سیدنا عیسیٰ علیہ وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام کی نبوت پر گذری تھی۔

اپنے اپنے موقعہ پر ان کی وضاحت و تبلیغ کی گئی، بلکہ کلمہ (اِقرا) سے اس وحی کا آغاز ہوا :-

اس طرح یہ تاریخی واقعہ ظہور پذیر ہوا، جس نے مؤرخین و مفکرین کے غور و فکر کے لئے نئے اور وسیع آفاق مہیا کئے، اور یہ اس حقیقت کا بلیغ اور واضح اشارہ تھا کہ اس نبی امّی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ انسانیت اور مذاہب کی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوگا، جو وسیع و عمیق معنوں میں قرأت (خواندگی) اور پڑھنے لکھنے کا وسیع و ترقی یافتہ دور اور علم کی حکمرانی کا عہد زرّیں ہوگا، اور علم و دین دونوں مل کر نئی انسانیت کی تشکیل و تکمیل کریں گے۔

مگر اس (علم و تعلّم) کا آغاز اس نبوت کی آغوش میں اور اس مالک کے نام سے ہوگا (جس نے اس کائنات اور انسان کو پیدا کیا ہے) تاکہ وہ اللہ کے یقین اور اس کی صحیح معرفت کے رنگ میں رنگا ہو اور اس کی روشنی و نگرانی میں اپنا سفر جاری رکھ سکے، اس لئے فرمایا :-

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ. آپ پڑھئے اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے (سب کو) پیدا کیا ہے۔

اس کے ساتھ انسان اپنی حقیقت اور خلقت کو بھی جانتا ہو، تاکہ اپنی ہستی کو نہ بھولے اور حد سے نہ بڑھے، اور علم و عقل، صنعت و حرفت اور تسخیر کائنات کے سلسلے میں اپنی فتوحات سے دھوکہ نہ کھائے، اس لئے فرمایا :-

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔

پھر قلم کی عزت افزائی کی اور اس کی قدر و قیمت بڑھائی، اور علم و قرأت اور

تعلیم و تربیت کے میدان میں اس کے کارنامے کا ذکر کیا، جس کا مکہ اور جزیرۃ العرب میں جاننا آسان نہ تھا، جہاں وہ صرف چند آدمیوں ہی کے پاس تھا، اسی لئے جزیرۃ العرب میں پڑھے لکھے شخص کو "الکاتب" کہا جاتا تھا، اسی سیاق میں فرمایا گیا:۔

اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. جس نے کہ قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی۔

پھر انسان کی اس صلاحیت کی طرف اشارہ کیا گیا کہ وہ دینی و کائناتی حقائق علوم و صنائع، انکشافات و ایجادات کی جدید ترین معلومات حاصل کر سکتا ہے، اور اپنے علم کے حدود بڑھا سکتا ہے، مگر ان سب کا ماخذ و مصدر تعلیم الٰہی اور انسان کی ایسی تخلیق ہے کہ وہ مجہول کو معلوم اور مفقود کو موجود کر سکے، اس لئے فرمایا گیا:۔

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَم. انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دے دی جنھیں وہ نہیں جانتا تھا(۱)۔

(۱) ماخوذ از تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات ص ۹۷ تا ۸۹

منصبِ نبوت کے فرائض چہارگانہ

هُوَالَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ.
(الجمعہ۔۲)

وہی تو ہے جس نے اَن پڑھوں میں انھیں میں سے (محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) پیغمبر، بنا کر بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور خدا کی کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں، اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ اور ساتھ میں آپؐ کے منصبِ نبوت کے فرائض اور اس کی ذمہ داری کے سلسلہ میں فرمایا "ھو الذی بعث......والحکمۃ"!

یہ ہیں نبوت کے چار شعبے جو اللہ تعالیٰ ان کے نائبین کو بطریقِ نیابت، بطریقِ خلافت عطاء فرماتا ہے، جو گویا فرائض چہار گانہ ہیں۔

تلاوت

پہلا فریضہ اور پہلا شعبہ ہے، تلاوتِ آیات، قرآن مجید کی آیات کو پڑھ کر

سنا دینا، یہ بھی اتنی اہم چیز اور ایسا بلند فریضہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے منصبِ نبوت کے شعبوں کے سلسلہ میں سب سے پہلے اسی کو ذکر فرمایا۔ اس کے بعد بعض آیتوں میں آتا ہے "يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ" تعلیم کتاب و حکمت کو مقدم کیا ہے، اور یہ سیاق و سباق کے مطابق ہے، یہ بڑے اہل نظر کا کام ہے۔ وہ بتائے گا کہ یہاں کیوں مقدم کیا ہے۔ اور یہاں کیوں مؤخر کیا ہے، کیا ماحول ہے، سورہ کا مرکزی نکتہ کیا ہے، یہ تو کام کرنے کا ہے، کتاب کی تعلیم یہ علومِ دینیہ ہیں، قرآن و حدیث ہیں، تفسیر ہیں!

تزکیۂ نفس

دوسرا فریضہ ہے، یعنی نفس کا تزکیہ کرتا ہے، اخلاقِ رذیلہ کو نکال دیتا ہے، حسد کو، قہر کو دور کرتا ہے ،حُب دنیا اور حُب جاہ کو نکالتا ہے، اس کے بجائے اللہ کی محبت، آخرت کا، جنت کا شوق دل میں بٹھاتا ہے، "یزکیھم" نفوس کی تربیت کرنا، نفوس کو مہذب بنانا، اخلاقِ رذیلہ نکالنا، اور اخلاقِ فاضلہ پیدا کرنا، اور وہ صفت پیدا کرنا، جس کا قرآن مجید میں دوسری جگہ ذکر ہے۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيْمَانَ، وَزَيَّنَهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ، وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ، أُوْلٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ.

لیکن خدا نے تم کو ایمان عزیز بنا دیا، اور اس کو تمھارے دلوں میں سجا دیا، اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے تم کو بے زار کر دیا، ایسے ہی لوگ تو راہ راست پر ہیں۔

(الحجرات۔ ۷)

قرآن مجید کے نزول کا مقصد یہ نہیں کہ وہ الفاظ اور حروف کی شکل میں، کتابوں میں اور اس کے بعد سینوں میں محفوظ ہو جائے، لوگ اس کو پڑھ سکیں، اور اس کو سنا سکیں، اور اس کو یاد کریں، اور پڑھتے رہیں۔ بلکہ نزول قرآن کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ عقائد کی اصلاح ہو، اور قلوب و نفوس کی اصلاح ہو، رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں فریضوں کی تکمیل فرمائی، صحابہ کرامؓ آپؐ کی اس محنت کا زندہ ثبوت تھے۔

تعلیم کتاب

تیسرا اور چوتھا کام کتاب و حکمت کی تعلیم ہے، "حکمت" سے مراد اخلاقِ فاضلہ ہیں، جیسا کہ ہمارے استاد اور اپنے زمانہ کے محقق مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق ہے کہ "حکمت" کا لفظ جہاں جہاں قرآن میں آیا ہے، اس سے مراد اخلاق ہے، "وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ" اس کے بعد جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ اخلاق ہی اخلاق ہے، پہلے "حکمت" کا لفظ استعمال کیا ہے، پھر اس کے بعد اس کی جو انواع بیان کی ہیں وہ سب اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں، سورۂ اسراء میں سارے اخلاق بیان کرنے کے بعد فرمایا "ذٰلِكَ مِمَّآ أَوْحٰى إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ" (اے پیغمبر یہ ان (ہدایتوں) میں سے ہیں جو خدا نے دانائی کی باتیں تمھاری طرف وحی کی ہیں) یہاں اخلاقِ فاضلہ بیان کرنے کے بعد "حکمت" کا لفظ استعمال ہوا ہے، معلوم ہوا کہ "حکمت" سے مراد اخلاق ہے، اخلاقِ فاضلہ!

تو تیسرا اور چوتھا کام "کتاب و حکمت کی تعلیم" دینا ہے، پہلے قاری تلاوت کرتا ہے اور پھر اس کے بعد تزکیہ کا عمل کرتا ہے، اس میں قرآن مجید کی تفسیر،

اس کے حقائق کا بیان، اس کے علوم کا اظہار اور مقاصدِ قرآن اور مقاصد و حق کی تشریح و تفصیل سب شامل ہے، یہ ہے "يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ"!

پھر اس کی بھی ضرورت ہے کہ قرآن مجید کے طالب علموں میں اور اس کے حاملین میں اور سامعین میں تفقہ پیدا کیا جائے، اور یہ وہ چیز ہے جس کی طرف اشارہ ہے کہ "من يرد الله به خيراً يفقه في الدين" اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے، اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔

یہ درحقیقت حاملِ قرآن کے فرائض چہار گانہ اور حاملِ قرآن کی ذمہ داریاں اور اس کے کمالات اور اس کی گویا سیرت ہے! کوئی بھی جامعہ یا دار العلوم ہو، اس کا مقصد ان فضلاء کو تیار کرنا جو تلاوت، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیہ چاروں شعبوں میں انبیائے کرام کی نیابت کا حق ادا کر سکیں، تلاوت و حکمت ناقص رہے گی جب تک کہ تزکیہ اس کے ساتھ نہ ہو یعنی ہمارے علماء نفس کی غلامی کے پھندے سے نکل چکے ہوں، ان کو دولت اور عزت کی بڑی سے بڑی مقدار، اپنے اصولوں سے، اپنی دعوت سے، اپنے معیار سے، اپنی زندگی کے نہج سے نہ ہٹا سکیں (۱)۔

---

(۱) ۱۔ حدیث پاکستان ص ۱۴۲ ص ۱۴۳۔ ۲۔ تعمیر حیات جلد ۳ شمارہ ۱۳ محرم الحرام ۱۳۸۶ھ مشترک ماخوذ ہے

علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ. خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ. الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ.

(العلق۔۱۔۵)

(اے محمدؐ) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔

علم کی قسمت قلم سے وابستہ

مجھے بے اختیار وہ واقعہ یاد آتا ہے، جب عرب کے ایک خشک علاقہ میں ایک پہاڑ پر جو نہ بلند ﷺ اور نہ سرسبز (۱)، تقریباً چودہ سو سال پہلے پیش آیا تھا، اور جس نے تاریخ انسانی ہی نہیں، بلکہ تقدیر انسانی پر ایسا گہرا اور لازوال اثر ڈالا ہے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی، اور جس کا اس ''لوح و قلم'' سے خاص تعلق ہے، جس پر

(۱) اس موقع پر مقرر نے کہا کہ وہ سرزمین خشک اور وہ پہاڑ غیر سرسبز تھا لیکن حفیظ جالندھری نے خوب کہا ہے
نہ یاں پر گھاس اُگتی ہے، نہ یاں پر پھول کھلتے ہیں   مگر اس سرزمین سے آسمان بھی جھک کے ملتے ہیں

علم و تہذیب اور تحقیق و تصنیف کی اساس ہے، اور جس کے بغیر نہ یہ عظیم دانشگاہیں وجود میں آتیں، اور نہ یہ وسیع کتب خانے جس سے دنیا کی زینت اور زندگی کی قدر و قیمت ہے، میری مراد پہلی وحی کے واقعہ سے ہے، جو ۶/اگست ۶۱۰ء کے لگ بھگ نبی عربی محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر مکہ کے قریب غارِ حرا میں نازل ہوئی، اس کے الفاظ یہ تھے:-

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقْ. اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ. الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمَ. (العلق۔۱۔۵)

(اے محمدؐ) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا پڑھو اور تمھارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔

خالق کائنات نے اپنی وحی کی اس پہلی قسط، اور بارانِ رحمت کے اس پہلے چھینٹے میں بھی اس حقیقت کے اعلان کو مؤخّر اور ملتوی نہیں فرمایا کہ علم کی قسمت قلم سے وابستہ ہے، غار حرا کی اس تنہائی میں جہاں ایک نبی اُمّی اللہ کی طرف سے دنیا کی ہدایت کے لئے پیغام لینے گیا تھا اور جس کا یہ حال تھا کہ اس نے قلم کو حرکت دینا خود بھی نہیں سیکھا تھا جو قلم کے فن سے یکسر واقف نہ تھا، کیا دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر کہیں مل سکتی ہے؟ اور اس بلندی کا تصور بھی ہو سکتا ہے کہ اس نبی اُمّی پر ایک امت اُمّی اور ایک ناخواندہ ملک کے درمیان (جہاں جامعات اور دانشگاہیں تو بڑی چیز ہیں، حرف شناسی بھی عام نہ تھی) پہلی بار وحی نازل ہوتی ہے، اور آسمان و زمین کا رابطہ صدیوں کے بعد قائم ہوتا ہے، تو اس کی ابتداء ہوتی ہے ''اقرا'' سے، اس کی ابتدا ''اُعبد'' سے نہیں، اس کی ابتدا ''صَلِّ'' سے نہیں بلکہ اس

کی ابتدا ہوتی ہے "اقرأ" سے۔

جو خود پڑھا ہوا نہیں تھا، اس پر وحی نازل ہوتی ہے، اس میں اس کو خطاب کیا جاتا ہے کہ "پڑھو" یہ اشارہ تھا، اس طرف کہ آپ کو جو امت دی جانے والی ہے، وہ امت صرف طالب علم ہی نہ ہوگی، بلکہ معلّم عالم اور علم آموز ہوگی، وہ علم کی اس دنیا میں اشاعت کرنے والی ہوگی، جو دور آپ کے حصہ میں آیا ہے، وہ دور "اُمیّت" کا دور نہیں ہوگا، وہ دور وحشت کا دور نہیں ہوگا، وہ دور جہالت کا دور نہیں ہوگا، وہ دور علم دشمنی کا دور نہیں ہوگا، وہ دور علم کا دور ہوگا، عقل کا دور ہوگا، حکمت کا دور ہوگا، تعمیر کا دور ہوگا، انسان دوستی کا دور ہوگا، وہ دور ترقی کا دور ہوگا۔

علم کی ابتداء اسم رب سے ہونی چاہئے

"بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ" (اس پروردگار کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا) بڑی غلطی یہ تھی کہ علم کا رشتہ رب سے ٹوٹ گیا تھا، اس لئے علم سیدھے راستہ سے ہٹ گیا تھا، اس ٹوٹے ہوئے رشتہ کو یہاں جوڑا گیا، جب علم کو یاد کیا گیا، اس کو یہ عزت بخشی گئی تو اس کے ساتھ ساتھ اس کی بھی آگاہی دی گئی کہ اس علم کی ابتداء "اسم رب" سے ہونی چاہئے، اس لئے کہ علم اسی کا دیا ہوا ہے، اسی کا پیدا کیا ہوا ہے، اور اسی کی رہنمائی میں یہ متوازن ترقی کر سکتا ہے، یہ دنیا کی سب سے بڑی انقلاب آفریں، انقلاب انگیز اور صاعقہ آسا آواز تھی جو ہماری دنیا کے کانوں نے سنی تھی، جس کا کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا، اگر دنیا کے ادیبوں اور دانشوروں کو دعوت دی جاتی کہ آپ لوگ قیاس کیجئے کہ جو وحی نازل ہونے والی

ہے، اس کی ابتدا کس چیز سے ہو گی؟ اس میں کس چیز کو اوّلیت دی جائے گی؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے ایک آدمی بھی جو اس اُمّی قوم اور اس کے مزاج اور دماغ سے واقف تھا یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ...... جو پہلی وحی نازل ہو گی وہ "اقرأ" کے لفظ سے شروع ہو گی۔ "پڑھو" "اقرأ" قرأت کا لفظ ہے، یہاں خالص علم کا بھی لفظ نہیں ہے، یعنی اس کا تعلق کاغذ سے بھی ہے، اس کا تعلق نقوش سے بھی ہے اور اس کا تعلق قلم سے بھی ہے، وہ علم نہیں جو لدنی طریقہ پر آتا ہے بلکہ وہ علم جو قلم کے ساتھ ہے، کاغذ کے ساتھ ہے، صحیفوں کے ساتھ ہے، کتب خانوں کے ساتھ ہے، تجربوں کے ساتھ ہے، ذہانتوں کے ساتھ ہے، "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ"۔

یہ دین علم سے الگ نہیں ہو سکتا

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس دین کا مزاج بتا دیا گیا کہ یہ دین کبھی علم سے الگ نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ سب سے پہلے جو پیغام دیا گیا اس میں خود کہا گیا کہ "پڑھو" تو مسلمان بے پڑھے کیسے رہ سکتے ہیں۔ وہ مسلمان حقیقی مسلمان نہیں جو علم سے اپنا رشتہ توڑ لے، وہ اسلام کا صحیح نمائندہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ پہلی بات تو یہ انقلاب انگیز دعوت کہ "اقرأ" پڑھو" بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ" اپنے رب کے نام سے پڑھو ...... کہ علم کا سفر خدائے حکیم و علیم کی رہنمائی میں شروع کیا جانا چاہئے، اس لئے کہ یہ سفر بہت طویل، بہت پُر پیچ اور بہت پُر خطر ہے، یہاں دن دھاڑے قافلے لٹتے ہیں، قدم قدم پر مہیب و عمیق گھاٹیاں ہیں، گہرے دریا

ہیں، قدم قدم پر سانپ اور بچھو ہیں، اس لئے اس میں ایک رہبر کامل کی رفاقت ہونی چاہئے، ...... اور وہ رہبر کامل حقیقتاً خدا کی ذات ہے، اس لئے "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ" پڑھو، لیکن وہ مجرد علم و ادب نہیں، وہ علم مقصود نہیں جو بیل بوٹے بنانے کا نام ہے، جو محض کھلونے سے کھیلنے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو محض دل بہلانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو ایک کو دوسرے سے لڑانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو قوموں کو قوموں سے ٹکرانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو اپنے معدے کی خندق کو بھرنے کا ذریعہ سکھانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو زبان کو صرف استعمال کرنا سکھاتا ہے، بلکہ "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ. خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقْ. اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ. الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ." پڑھو تمہارا رب بڑا کریم ہے، وہ تمہاری ضرورتوں سے تمہاری کمزوریوں سے کیسے ناآشنا ہو سکتا ہے، "اِقْرَا وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" آپ خیال کیجئے کہ قلم کا رتبہ اس سے زیادہ کس نے بڑھایا ہوگا کہ اس غارِ حرا کی پہلی وحی نے بھی قلم کو فراموش نہیں کیا، وہ قلم جو شاید ڈھونڈھنے سے بھی مکہ کے کسی گھر میں نہ ملتا، اگر آپ اسے تلاش کرنے کے لئے نکلتے تو معلوم نہیں کسی ورقہ بن نوفل(۱) کے یا کسی "کاتب"(۲)(جو دیارِ عجم سے کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ کر آیا ہو) کے گھر میں ملتا ...... اور وہ قلم جس کا استعمال عربی شاعری میں بھی بہت کم ہے، آپ اگر عرب شعراء کے دیوان پڑھیں، پڑھتے ہی چلے جائیں تو اس میں قلم کا نام آپ بہت کم پائیں گے۔

---

(۱) عہد بعثت کے ایک عرب فاضل جو توارۃ و انجیل کے بڑے عالم تھے اور عبرانی زبان سے خوب واقف تھے۔

(۲) عرب بھی پڑھے لکھے آدمی کو "کاتب" کہتے تھے۔

سب کا خلاصہ علم الانسان مالم یعلم

اور پھر ایک بہت بڑی انقلاب انگیز اور لافانی حقیقت بیان کی کہ علم کی کوئی انتہا نہیں۔ "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ" سائنس کیا ہے؟ "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ"، ٹکنالوجی کیا ہے؟ "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ" انسان چاند پر جا رہا ہے یہ کیوں؟ "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ" یہ جو خلا کو ہم نے طے کر لیا ہے اور ہم نے دنیا کی وسعتیں سمیٹ لی ہیں اور دنیا کی طنابیں کھینچ لی ہیں اور سورج کی شعاعوں کو بقول اقبال کے گرفتار کر لیا ہے اور ستاروں کے درمیان اپنی رہگذر پیدا کی ہے، کیا ہے؟ "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ" علم اشیاء کی جہانگیری، یہ سب "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ" کا کرشمہ نہیں تو کیا ہے؟(۱)

---

(۱) ۱۔ حدیث پاکستان ص ۹۰ تا ۹۴ اور
۲۔ تحفہ کشمیر ص ۹۵ تا ۹۸ سے مشترک اخذ و تلخیص ہے۔

مدارسِ دینیہ کی افادیت اور فضلائے مدارس کا فرض

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً. فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ.

"(اور دیکھو) یہ تو ممکن نہ تھا کہ مومن سب کے سب نکل آئیں (اور تعلیم دین کے مرکز میں آکر علم و تربیت حاصل کریں) پس کیوں نہ ایسا ہو کہ ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل آئے تاکہ دین (کا علم سیکھے اور اس میں) سمجھ پیدا کرے، اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آئے تو لوگوں کو (جہل و غفلت کے نتائج سے) ہوشیار کرے تاکہ وہ برائیوں سے بچیں"۔ (التوبہ: ۱۲۲)

مدارس کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے

اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا قرآن مجید میں مدارس دینیہ کا تذکرہ ہے؟ کیا ان کے فرائض اور واجبات کا ذکر ہے؟ تو میں کہوں گا کہ قیامت تک کے لئے...... اس آیت میں مدارس کے فرائض اور ذمہ داریوں کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی گئی ہے، اس آیت میں مدارس کی ذمہ داری کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے...... "یہ تو عملاً ممکن نہیں کہ سب مسلمان گھروں سے نکل آئیں، تو ایسا کیوں نہیں ہوا کہ

مومنوں کی ہر جماعت میں سے ایک جماعت دین میں سمجھ پیدا کرنے کے لئے گھروں سے نکل کھڑی ہوتی، تاکہ جب یہ لوگ دین سیکھ کر اور اس میں گہری سمجھ پیدا کر کے اپنے ملک و قوم میں واپس جائیں، تو انھیں عصر حاضر کے فتنوں سے ڈرائیں، اور باخبر کریں، تاکہ ان کی قوم ان فتنوں سے چوکنا ہو جائے، اور ان فتنوں سے بچنے کی کوشش کرے"۔ حقیقت میں مدارس کا کام یہی ہے، کہ وہ ایسے افراد تیار کریں جو اپنے زمانہ کے نئے نئے فتنوں اور سازشوں سے واقف ہوں اور ان کے مقابلہ کے لئے پوری طرح تیار ہوں!

اس آیت میں اگرچہ مدارس کا نام نہیں لیا گیا ہے، (اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی شان اس سے بہت بلند بھی ہے) لیکن اس آیت میں بالکل مدارس کی تصویر آگئی ہے، اور ان کی ضرورت و افادیت بھی، اور اس میں مدارس کا فرض بیان کر دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے !" وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَافَّةً " یہ تو ممکن نہیں۔ اور آسان نہیں کہ مسلمان سب کے سب نکل کھڑے ہوں۔ اور ضروریات سے بالکل آنکھیں بند کر لیں، یعنی یہ ایک غیر ممکن سی چیز ہے، غیر طبعی ہے کہ سب مسلمان سب کام چھوڑ چھاڑ کر دین سیکھنے کے لئے نکل جائیں، نہ دوکان پر کوئی بیٹھنے والا، نہ کوئی خرید و فروحت کرنے والا، نہ کوئی ضرورت پوری کرنے والا، معلوم ہوا سارا شہر چلا گیا، مدرسہ کا طالب علم بن کر، تو یہ تو ہونے والی بات نہیں، اور یہ ممکن العمل بات نہیں، اللہ تعالیٰ ایسی بات نہیں کہتا، نہ اس کا مکلّف قرار کر دیتا ہے، نہ اس کا مطالبہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ انسانوں کا پیدا کرنے والا ہے

انسانوں کی کمزوریوں سے واقف ہے (اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ) اسی کی رکھی ہوئی کمزوریاں ہیں انسانی فطرت میں، انسانوں کی ضروریات سے واقف ہے، حالات سے واقف ہے، اسی لئے وہ ایسی چیزوں کا مکلّف نہیں کرتا جو انسان کے بس سے باہر ہو۔ فرمایا! یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تمام مؤمنین سب کے سب گھر چھوڑ کر باہر نکل جائیں، مدرسوں میں جاکر نام لکھالیں، یا ہجرت کر جائیں، وہاں جہاں علم حاصل ہوتا ہے۔وہاں علم کی تحصیل میں لگ جائیں اللہ تعالی نے اس کا مکلّف نہیں کیا۔

خود ہی قبل اس کے کہ کوئی عذر کرتا، اور کہتا کہ ایسا نہیں ہو سکتا، اللہ تعالی نے پہلے ہی فرما دیا، کہ ہونے والی بات نہیں کہ سب مسلمان کھڑے ہو جائیں ہاتھ جھاڑ کر، دامن جھاڑ کر، سب کاموں کو چھوڑ کر طالب علم بن جائیں، "وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّة"!

تفقہ حاصل کریں

پھر ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہر فریق میں سے، ہر جماعت میں سے اور ہر حلقہ میں سے کچھ لوگ اس کام کے لئے تیار ہو جائیں، کمربستہ ہو جائیں کہ وہ دین سیکھیں، "فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ" یعنی جو انسانی گروہ ہیں، پیشے ہیں، برادریاں ہیں، محلے ہیں، شہر ہیں، ان سے ایک ایک ٹولی اس کے لئے بالکل وقف ہو جائے کہ وہ دین سیکھے، "لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ" دین کی سمجھ حاصل کریں، دین میں گہری اور وسیع سمجھ (تفقہ) یعنی وہ دین کے احکام و

مسائل کا علم حاصل کریں۔

"تفقہ" بہت جامع لفظ ہے، اس میں احکام و مسائل، ان کی حکمتیں، مواقع استعمال، ان کے تطبیق کے مواقع، خطاب کے طریقے سب اس کے اندر آجاتے ہیں، "تفقہ" کا لفظ ایسا اللہ تعالی نے استعمال کیا ہے کہ اس سے جامع لفظ ہو ہی نہیں سکتا ہے، کہ "دین کی سمجھ حاصل کریں"! عربی زبان میں "سمجھنے" کے لئے بیسوں لفظ ہو سکتے ہیں، "فہم، معرفت، تعقل"۔ لیکن "تفقہ" کا لفظ خاص معنی رکھتا ہے، اس کے معنے ہیں، "دین میں گہری سمجھ حاصل کرنا" "دین کے ذخیرہ پر عمیقانہ نظر رکھنا" "زمانہ کی ضرورت کو سمجھنا اور بدلتے ہوئے زمانہ اور دائمی دین کے درمیان رشتہ پیدا کر سکنا"۔

فضلائے مدارس کا فرض

اس کے بعد فرمایا: " لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ" پھر اپنی قوم (مسلمانوں) میں تبلیغ و انذار کا فرض انجام دیں۔ یعنی اتنا ہی کافی نہیں کہ خود اپنی ذات کے لئے سیکھ کر بیٹھ گئے، اپنا کام نکال لیا، بات یہاں پر ختم نہیں ہو جاتی کہ خود دین سیکھ لیں، دین کی سمجھ حاصل کرلیں، فقیہ بن جائیں، عالم بن جائیں، محدث بن جائیں۔ بلکہ اس کے بعد فرمایا " وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ" جاکر اپنی قوم کو سمجھائیں۔ "قوم" کے معنی یہ نہیں کہ مسلمان ایک قوم ہیں، ہندو، ایک قوم ہے، ہندوستانی ایک قوم ہے، عرب ایک قوم ہے، اس کے لئے تو عربی میں "شعوب" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، "قوم" کے معنی ہیں "انسانوں کا مجموعہ"

انسانی جماعتیں،! "تو اپنی قوم" کا مطلب یہ نہیں کہ ہندوستانی ہندوستانیوں کو جاکر سمجھائیں، عرب عربوں کو سمجھائیں۔ نہیں بلکہ جہاں سے آئے ہیں اپنے اپنے خاندانون کو، محلے والوں، گاؤں والوں کو، قصبے والوں کو، برادری والوں کو جاکر سمجھائیں۔ "لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ"!

تو اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا مکلّف کیا ہے، جس کی ترغیب دی، اس آیت میں اس کے مقصد بیان کئے ہیں، ایک خود علم حاصل کریں، سمجھ حاصل کریں، علم یہ نوشت وخواند کا علم نہیں، اس کو علم و تفقہ نہیں کہا جاتا، " من یرد الله به خیرا یفقه فی الدین" میں دین کے مسائل و احکام اور ان کی علتیں ان کے مواقع استعمال، ان کی تعمیم وتخصیص کے مواقع سب اس کے اندر آجاتے ہیں، اس کے بعد فرمایا کہ ہم دعوت دیتے ہیں اس لئے نہیں کہ اپنی اصلاح کرلیں، اپنے لئے سامان نجات وہدایت مہیا کرلیں۔

"لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ" جاکر اپنی اپنی بستیوں میں ہدایت کا کام کریں، وعظ و ارشاد کا کام کریں، اور ان کو خطرات سے، مہلکات سے، کفر کے مہلکات سے، ان عقائد سے، ان اعمال سے کہ جن سے آدمی بالکل اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات وہ اسلام کی سرحد پار کر جاتا ہے، اور مسلمانوں میں اس کا شمار نہیں رہتا، بعض چیزوں سے ایمان چلا جاتا ہے، بالکل آدمی نے گویا ارتداد اختیار کرلیا، "لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ" تاکہ اپنی قوم (مسلمانوں) میں تبلیغ و انذار کا فرض انجام دیں، اور مسلمانوں کو کوئی خطرہ پیش آجائے، حلال و حرام، کفر وایمان کا کوئی مسئلہ آجائے تو اس میں وہ رہنمائی کرسکیں،

بتا سکیں کہ یہاں سے یہاں تک تو اسلام ہے، اس کے بعد کفر ہے، اور اگر تم سمجھنا چاہتے ہو، تو ہم تمہیں بتاتے ہیں، "قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى" (البقرہ۔۲۵۶) یہ رشد ہے، یہ غی ہے، یہ اسلام ہے، اور یہ جاہلیت ہے، یہ بتا سکیں، اس کے بعد کرنا نہ کرنا آپ کا کام ہے"!

" لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ" اپنے لوگوں کو جا کر ڈرائیں، "لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ" تاکہ وہ احتیاط کریں۔

آپ کو معلوم ہے کہ "لعل" کا لفظ قرآن مجید میں شک کے لئے نہیں آتا ہے، (کہ شاید ایسا ہو اللہ تعالی کے لئے ہر چیز یقینی ہے) علت اور تعلیل کے طور پر آتا ہے، تاکہ وہ ڈرائیں تاکہ وہ ڈر اور خوف کی زندگی گذارنے لگیں، حرام و حلال کا فرق سمجھنے لگیں، کیا چیز مہلک ہے، اور کیا چیز نجات دینے والی ہے، ان کو جاننے لگیں، اور اسی کے مطابق وہ عمل کریں، " لعلم یحذرون" اس میں سب آتے ہیں!

یہ دین دائمی ہے

ایک بات یاد رکھئے کہ یہ دین تو دائمی ہے، لیکن زمانہ بدلنے والا ہے، زمانہ ظرف ہے، اور زمانہ بدلتا رہتا ہے، لیکن دین کی حقیقت اور دین کی بنیادی باتیں اور تعلیمات نہیں بدلتیں، اس بدلنے والے زمانہ اور اس نہ بدلنے والے دین کے درمیان رشتہ پیدا کرنا، اور پیوند لگانا، یہ "تفقہ" کو چاہتا ہے، جو دین کی گہری سمجھ

اور انذار (دین پر عمل کرنے کی دعوت اور عمل نہ کرنے کی حالت میں انذار و تخویف اور برے نتائج سے ڈرانے) کا نام ہے۔

دین کی اصلیت اور حقیقت، دین کے واجبات و فرائض، دین کے حقائق و مطالبات میں تو ذرہ برابر فرق نہ آنے پائے، لیکن وہ دین زمانہ کا ساتھ دے سکے، زمانہ کی رہنمائی کر سکے، زمانہ کتنا ہی بدل جائے، تمدن کتنا ہی وسیع ہو جائے، مختلف علوم کی کتنی ہی ترقیاں ہو جائیں۔ انسان ہوا پر اڑنے لگے اور پانی پر چلنے لگے اور زمانہ لاکھوں میل حساب سے آگے بڑھ جائے۔ جس کو "تفقه في الدين" کی دولت حاصل ہے وہ ذہنی، فکری اور عقلی طور پر ثابت کر سکتا ہے کہ دین اس زمانہ میں بھی رہنمائی کر سکتا ہے۔ آج بھی وہ تمام مسائل اور ضروریات یہاں تک کہ زمانہ کے معموں اور پہیلیوں کو بجھا سکتا ہے۔ زمانہ کے ساتھ چلنے ہی نہیں بلکہ قیادت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور زمانہ کو بے راہ روی اور نسلِ انسانی کو خود کشی سے بھی بچا سکتا ہے۔ وہ اپنی جگہ، اپنی تعلیم و حقائق میں ابدی ہے، زمانہ کتنا ہی ترقی کر جائے، دین میں فرسودگی اور قدامت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کو (Out of Date) کہنا بھی صحیح نہیں ہوگا۔ البتہ زمانہ بدلنے والا ہے یہ اس کی تعریف ہے۔ برائی نہیں، زمانہ کہتے ہی اسے ہیں جو بدل سکے۔ وہ آثارِ قدیمہ ہیں جو بدل نہیں سکتے، یا ایسی چیز ہے جس میں زندگی نہیں، زندگی کے ساتھ تغیر و تبدل اور نمو نہ وارتقاء لگا ہوا ہے۔ زمانہ تو بدلے گا اور بدلنا چاہئے لیکن دین زمانہ کی طرح بدلتا بھی نہیں اور زمانہ کے پیچھے بھی نہیں رہ جاتا............

مدارس دینیہ اور ان کے علمبرداروں کی ضرورت وافادیت یہ ہے کہ اس

خصوصیت اور امتیاز کو اور خدا کی اس نعمت کو باقی رکھیں۔ ایک تو یہ کہ دین اپنی اصلی حالت میں ہو، جو اللہ کے رسولؐ لے کر آئے، اور خلفائے راشدین اور سابقین اولین اور عمومی طور پر پوری امت اس پر چلتی رہی اور تمام دنیا میں اس پر عمل رہا، دوسرے یہ کہ بالکل زمانہ کی ضرورت کو نہ سمجھیں۔ اور آنکھیں اور کان بند کرلیں۔ بلکہ زمانہ کی تبدیلی کو دیکھیں اور اس کا جائزہ لیں کہ کس حکم سے اس کا تضاد اور ٹکراؤ ہے اور کتنی چیزوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اور اس کی رعایت کی جاسکتی ہے۔

دین اپنی اصل پر بھی رہے اور وہ زمانہ کی رہنمائی بھی کرسکے اور زمانہ کا احتساب بھی، زمانہ کے جائز تقاضوں کو بھی سمجھ سکے۔ اور (دین وشریعت کے دائرے میں رہ کر) ان کو بھی پورا کرسکے۔ اسی کا نام ''تفقہ'' ہے اس سے بڑھ کر ''اجتہاد'' کا منصب قابلیت ہے جس کے لئے خاص شرائط اور معیار ہے۔

مدارس کے قیام وترقی، ان کی رہنمائی اور ان کے ذریعہ سے رہنمائی کرنے کے سلسلہ میں یہ سب حقائق پیش نظر رہنے چاہئیں۔ والحمدللہ اولاً وآخراً وظاہراً وباطناً (۱)

---

(۱) ۱۔ کاروان زندگی حصہ ششم ص ۲۰۲ تا ص ۲۰۸

۲۔ تحفۂ دین ودانش ص ۳۷ تا ص ۳۸

۳۔ تعمیر حیات ۱۰؍جون ۱۹۸۶ء سے مشترک اخذ وتلخیص ہے۔

صحیح دینی تعلیم وتربیت کے انتظام کے سلسلہ میں والدین
اور
سرپرستوں کی ذمہ داری

يَاأَيُّهَاالَّذِيْنَ آمَنُوْا قُوْا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَايَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاأَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَايُؤْمَرُوْنَ. سورہ التحریم: ٦

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو ایسی آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور جس پر تند خو اور سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں۔ جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے وہ بجالاتے ہیں۔

اے وہ لوگو! جو ایمان لاچکے ہو

آیت بڑی چونکادینے والی ہے، اور ایسی ہے کہ اگر اس کا خطرہ نہ ہو کہ بار بار جو چیز سامنے ہوتی ہے اس پر سے توجہ ہٹ جاتی ہے وہ روز مرہ کی چیزوں میں سے سمجھی جانے لگتی ہے۔ تو میں عرض کرتا اور اصرار کرتا کہ یہ آیت جلی حروف سے لکھوا کر دیواروں پر لگوادی جائے، مسجدوں میں بھی آویزاں کردی جائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے وہ لوگو جو خود ایمان لاچکے ہو۔ "يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا" یہ "آمنوا" ماضی کا صیغہ ہے، ہر لفظ پر غور کیجئے، قرآن مجید کا کوئی لفظ

اتفاقی یا بھرتی کا نہیں ہوتا یہ کوئی شاعری نہیں "اَیُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ" کہا جاسکتا ہے "اَیُّهَا الْمُسْلِمُوْنَ" کہا جاسکتا تھا، اے مسلمانو! اے جماعت مومنین! لیکن فرمایا "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا" اے وہ لوگو جو خود ایمان لاچکے ہو "قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَاراً وَقُوْدُ هَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ" بچاؤ اپنی جانوں کو، گھر والوں کو، اپنے متعلقین کو، اپنے ماتحتوں کو آگ سے جس کا ایندھن ہے آدمی اور پتھر۔

اس آیت کے مخاطب مسلمان تھے، صحابہ تھے، جو قرآن مجید کے نزول کے وقت موجود تھے۔ وہ اولین مخاطب تھے، یوں قیامت تک کی تمام مسلمان نسلیں اور جو بھی پیدا ہو اور اپنے کو مسلمان کہے وہ سب مخاطب ہیں، لیکن پہلے مخاطب اس کے وہ لوگ تھے جو رسول اللہؐ کے ہاتھ پر ایمان لاچکے تھے، آپ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا تھا، جن کو شرف صحابیت حاصل تھا، اور اس میں یقیناً وہ لوگ بھی تھے جو بیعتِ رضوان میں شریک رہے ہوں گے، جنھوں نے حدیبیہ میں درخت کے نیچے جان دینے پر بیعت کی تھی، اور جن کے متعلق ارشاد ہے: لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنِ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَافِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحاً قَرِیْباً. (سورالفتح: ۱۸) (اے پیغمبرؐ) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کررہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا اور جو (صدق وخلوص) ان کے دلوں میں تھا، وہ اس نے معلوم کرلیا تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انھیں جلد فتح عنایت کی۔

جن کو یہ انعام ملا تھا، اور جن کو قیامت تک کے لئے سند دی گئی ہے کہ اللہ ان سے راضی ہوا، ایسے سند یافتہ اور بلند مرتبہ لوگ بھی اس آیت کے مخاطب

ہیں جو بیعت رضوان میں شریک ہوئے تھے، اور عشرہ مبشرہ بھی اس میں یقیناً شامل ہیں اور کبارِ صاحبہ بھی اس میں شامل ہیں اور بدر اور اُحد کے ''زندہ شہید'' بھی مخاطب ہیں۔

پھر اس آیت کا کیا مطلب ہے؟

اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا کوئی آدمی جان بوجھ کر اپنے لڑکوں کو اپنے گھر والوں کو آگ میں جھونکتا ہے۔ آگ میں گھسنے دیتا ہے؟ اس کا کیا مطلب کہ اللہ کہتا ہے کہ اے وہ لوگو جو خود ایمان لا چکے ہو، اب تمھارا کام یہ ہے کہ اپنی جانوں کو بچاؤ۔ اپنے گھر والوں کو بچاؤ۔ دوزخ کی آگ سے، کیا کوئی واقعہ آپ نے سیرت میں ایسا پڑھا ہے کہ صحابہ کرام نے (معاذ اللہ) ارادہ کیا تھا کہ اپنے بچوں کو آگ کے حوالہ کردیں، یا بچے آگ میں کودنا چاہتے تھے اور صحابہ کرام اور اس وقت کے مسلمان خاموش بیٹھے ہوئے تماشا دیکھ رہے تھے، اور اس صورت حال پر راضی تھے، کیا ایسا کوئی واقعہ آپ کی نظر سے گزرا ہے؟ تو کیا بے ضرورت یہ بات کہی گئی ہے کہ اے وہ لوگو جو خود ایمان لا چکے ہو تمھارا کام یہ ہے کہ اپنی جانوں کو، اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔ یہ کون سی آگ تھی، اور کب یہ واقعہ پیش آیا تھا، یا پیش آنے والا تھا کہ مسلمانوں کے گھروں کے بچے آگ میں کودنا چاہتے تھے۔ اور ماں باپ سو رہے تھے، فکر نہیں کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس وقت وحی نازل کی، سب چونک گئے اور سب اپنے بچوں کی فکر میں لگ گئے کہ آگ میں چھلانگ نہ لگائیں، پھر اس آیت کا مطلب کیا ہے؟

کیا اس آیت کا مطلب اس کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہے کہ اپنے بچوں کو، اپنے گھر والوں کو ایسی چیزوں سے بچاؤ جو آگ تک لے جانے والی ہیں، جن کا انجام یہ ہونے والا ہے کہ دوزخ میں جائیں، ورنہ وہ کون سے انسان ہیں جو اپنے بچوں کو آگ کی طرف جاتے ہوئے دیکھیں اور ان کو روک نہ لیں؟ خطرہ صرف اس بات کا ہے کہ آدمی یہ نہ جانتا ہو کہ اس کے نتیجہ میں جلنا ہوتا ہے، تو مطلب یہ ہوا کہ ایسے اسباب سے بچاؤ جو دوزخ کی آگ تک پہونچانے والے ہیں۔ اس کو فقہ کی زبان میں "اسباب مؤدیہ" کہتے ہیں، یعنی وہ اسباب جو کسی نتیجہ تک پہونچانے والے ہوں، فقہاء کے نزدیک وہ بھی نتائج کے حکم میں داخل ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو ایسی دوا دے رہا ہے جس کے نتیجہ میں موت ہوتی ہے، چاہے وہ دیر سے ہو، یہ عمل قتل ہی کے مرادف ہے۔ اس لئے کہ اس نے وہ سبب اختیار کیا جس کے نتیجہ میں موت کا آنا یقینی ہے تو قانون بھی اس کو قاتل کہے گا۔ حکیم صاحبان ڈاکٹر صاحبان بھی اس کو قاتل ہی سمجھیں گے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ ایسی چیزوں سے بچاؤ جو آگ تک پہونچا دینے والی ہیں۔

صورت حال اس وقت یہی ہے

اب میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ صورت حال اس وقت یہی ہے، بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام نہ کرنا بچوں کو اس ماحول کے بالکل حوالہ کر دینا اور ان کو اس کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا جو اس بات کا نہ مکلّف ہے نہ اس بات کا مدعی، نہ اس بات کا اہل کہ وہ بچوں کو وہ تعلیم دے گا جس پر نجات موقوف ہے۔ پیغمبروں

کی لائی ہوئی وہ تعلیم جس سے ناواقفیت کے نتیجہ میں ایمان کا خطرہ ہے، آخرت کی ہلاکت ہے، تو اب یہ دیکھنا چاہئے کہ اس بات کو بچے کے لئے کیسے گوارا کیا جارہا ہے؟ موجودہ تعلیمی نظام صرف لادینی (SECULAR) نہیں، وہ ایک مثبت و معین نظام تعلیم (POSITIVE SYSTEM OF EDUCATION) ہے، ہندو دیومالا (HINDU MYTHOLOGY) اس میں شامل ہے۔ انگریزوں کے زمانہ میں تعلیم سیکولر تھی، بلی، کتے کے قصے ہوتے تھے اور ہم میں سے بہت سے لوگوں نے انگریزوں کے عہد حکومت میں انگریزی پڑھی ہے۔ اس وقت زبان سکھانے والی ابتدائی کتابوں سے نہ کسی کے عقیدہ پر اثر پڑتا تھا نہ کسی مخلوق کا تقدس پیدا ہوتا تھا اور نہ اس کائنات میں کسی مخلوق کا تصرف واختیار معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت بھیڑیئے، چیتے، بندر اور لومڑی اور بلی کتے کے قصے بچے پڑھتے تھے۔ ویسے کے ویسے ہی گھر آتے تھے جیسے جاتے تھے، لیکن اب صورت حال یہ نہیں ہے، سرکاری نصابی کتابوں میں عقیدہ پر اثر ڈالنے والے اسباق، قصے کہانیاں اور مضامین ہوتے ہیں اور جو کسر کتابوں میں رہ جاتی ہے وہ ماسٹر صاحبان پوری کرتے ہیں، بچوں کو کچھ اجتماعی کام ایسے کرنے پڑتے ہیں جو اسلام کے عقیدہ توحید کے منافی ہیں۔

اگر آپ نے بچہ کا نام کسی اسکول میں لکھایا اور باہر سے کوئی انتظام نہیں کیا گویا آپ نے بچہ کو ایک طرح کی ترغیب دی ہے کہ وہ ہر غیر اسلامی بات مانتا چلا جائے، اب اگر وہ مانتا چلا گیا اور باہر سے کوئی انتظام نہیں ہے نہ اردو جانتا ہے کہ دینی کتابیں پڑھ سکے، نہ محلے میں کسی مکتب کا انتظام ہے تو آپ بتایئے کیا آپ "قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَاراً" کے مخاطب نہیں ہیں؟

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :

"اے ایمان والو! بچاؤ اپنی جانوں کو اور اپنے گھر والوں کو اور اپنے تعلق والوں کو اور اپنے متعلقین کو۔ ان میں گھر والے اعزہ بھی شامل ہیں اور بچے اولاد اور پورا خاندانی سلسلہ بھی اس میں داخل ہے۔ "قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَاراً" اپنی جانوں کو بچاؤ اور اپنے گھر والوں کو بچاؤ دوزخ کی آگ سے۔"

دھوکہ میں نہ رہنا

جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ انسان بہت سی چیزوں سے بچ جاتا ہے۔ اپنی ترکیبوں سے بھی اور رشوتوں سے بھی اور سازشوں سے بھی اور ذہانت سے بھی اور زور آزمائی سے بھی۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ عالم الغیب ہے، اور انسانوں کو پیدا کرنے والا ہے۔ "اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ" (کیا وہ اپنے پیدا کئے ہوئے کو نہیں جانے گا) یہ ہو سکتا تھا کہ ذہن میں یہ بات آتی کہ اس دنیا میں اس کی زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ زندگی میں زیادہ کوشش کرنے کی ضرورت نہیں اور بہت دور دور تک اور دیر دیر تک نگاہ دوڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب وہاں پہونچ جائیں گے دیکھا جائے گا۔ وہاں کچھ کرلیں گے۔ کوئی ترکیب نکال لیں گے۔ بہت سے تجربے ہیں زندگی کے کہ آدمی سمندر کے کنارے پہونچ جاتا ہے اور بچ جاتا ہے۔ بالاخانہ کے بالکل سرے پر کھڑا ہوتا ہے اور پھر بعض مرتبہ وہ وہاں سے گرتے گرتے بچ بھی جاتا ہے۔ ترکیب کوئی ہو جاتی ہے اتفاقات بھی ہوتے ہیں اور اس طریقے سے آدمی کچھ دے دلا کر بھی بچ جاتا ہے۔ بلکہ دھینگا مشتی سے بھی بچ جاتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ عالم الغیب ہے لہٰذا اس نے اس کے بعد فرمایا، اس میں بڑی حکمت ہے (عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ) اس دھوکہ میں نہ رہنا کہ وہاں پہونچ کر بھی ہم بچ جائیں گے۔ جہنم کے کنارے پہونچ کر ہم خود بچ جائیں گے۔ اپنے کو بچالیں گے یا اولاد کو بھی بچالیں گے۔ اس پر ایسے فرشتے مقرر ہیں جو "غلاظ شداد" بڑے سخت ہیں اور بڑے درشت ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ جب کوئی لفظ فرمائے تو پھر اس کے بعد کوئی ٹھکانہ ہی نہیں اس کا، تو رونگٹے کھڑے ہوجانے چاہئیے۔ "غلاظ شداد" عربی کے ایسے سخت الفاظ ہیں جو عربی جاننے والے ہیں وہ ان لفظوں کی طاقت کو سمجھیں گے۔ اور اس کا زور سمجھیں گے۔ ایک ہی لفظ کافی تھا۔ "غِلَاظٌ" لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا "غلاظ شداد" بڑے سخت، بڑے درشت، بڑے بات کے پکے، دُھن کے پکے، کر گذرنے والے۔ "يَعْصُوْنَ اللهَ مَا أَمَرَهُمْ" اور پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اور تاکید فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے جو کام ان کے سپرد کیا ہے، جو ان کا فرض ہے اور جس کام پر مقرر ہیں اس میں نافرمانی نہیں کر سکتے۔

تو یہ تعلیم کا مسئلہ اپنے گھر والوں کو دین پر لگانے کا مسئلہ، دین سکھانے کا اور اپنے بچوں کو دین کی تعلیم دینے کا مسئلہ اور ان کو ایسی تعلیم دینا کہ جس سے وہ دوزخ کی آگ سے بچ جائیں اور خدا کے غضب سے اور خدا کے غضب کے مستحق بننے سے بچ جائیں ان کی زندگی ہدایت کی زندگی ہو اور ان کی موت سعادت کی موت ہو، اور ان کی آخرت فلاح ونجات کی زندگی ہو!! (۱)

---

(۱) آئندہ نسلوں کے اسلام کی حفاظت اور ایمان کی ذمہ داری دونوں مختلف تقریروں سے مشترک اخذ و تلخیص ہے۔

صنعتی اور سائنسی علوم کی تعلیم کی افادیت و اہمیت

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَأْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ.

(الحدید:)

اور لوہا پیدا کیا اس میں (اسلحہ جنگ کے لحاظ سے) خطرہ بھی شدید ہے۔ اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں، اور اس لئے کہ جو لوگ بن دیکھے خدا اور اس کے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں خدا ان کو معلوم کرے، بے شک خدا قوی (اور) غالب ہے۔

قرآن مجید میں صنعت کا ذکر

بہت سے لوگوں (خاص طور پر جن کی تعلیم جدید علوم کے اندر محدود ہے) کا ذہن کبھی اس طرف منتقل نہ ہوا ہو گا کہ قرآن مجید میں صنعت کا بھی ذکر ہے۔ اور ان ماہرین کا بھی ذکر ہے جنھوں نے اپنے وقت میں صنعت سے تعمیری کام کیا اور خدمت خلق انجام دی اور انسانیت کی اور اپنے ہم اعتقاد اور زیر اثر حلقہ کی حفاظت کی، یہ کم لوگوں کے ذہن میں آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ احسان رکھتے ہوئے اہمیت کے ساتھ ذکر فرماتا ہے کہ ہم نے لوہے

کو نازل کیا، پہلے خیال کیجئے کہ اس کے لئے عربی میں کئی لفظ ہو سکتے تھے۔ "خلقنا" کہا جاسکتا تھا یعنی "ہم نے پیدا کیا" لیکن نازل کرنے میں جو خصوصیت اور اہتمام ہے اور اس کے ساتھ قدرت اور رحمت خداوندی کا جو عنصر شامل ہے وہ کسی اور لفظ سے ادا نہیں ہو سکتا، آپ جانتے ہیں کہ ٹکنالوجی "Technology" اور تکنولوجی ہی نہیں بلکہ فن تعمیر (آرکی ٹیکچر) بھی ہے اور دوسری چیزیں فن حرب وغیرہ ہیں۔ جنگی مشقیں ہیں اور جنگی کارروائیاں ہیں، اور کتنے تعمیری اور دفاعی وحفاظتی کام ہیں ان سب میں لوہا ایک مرکزی کردار ادا کرتا ہے اور کوئی نظام صنعت وحرفت اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

صفتِ ربوبیت کا مظہر

یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ بیسیوں معدنی دھاتوں کو چھوڑ کر حدید (لوہے) کا انتخاب فرمایا اور (وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ) ہم نے لوہے کو نازل کیا اس میں بڑی طاقت ہے، وہ اللہ کی صفت ربوبیت کا مظہر ہے اور اس سے رفعت کا بھی ظہور ہوتا ہے وہ صرف تلوار بنانے کے لئے نہیں ہے، وہ صرف بندوق ڈھالنے کے لئے نہیں ہے، وہ صرف گولی کو وجود میں لانے کے لئے نہیں ہے اور اس کی شکل دینے کے لئے نہیں "فیہ منافع للناس" جو عربی داں حضرات ہیں وہ جانتے ہیں کہ نکرہ کا صیغہ جو ہوتا ہے اس میں بڑی عمومیت وکثرت ہوتی ہے، تو اس وقت "فیہ منافع للناس" اس میں بہت سے منافع ہیں لوگوں کے لئے۔

پھر اس کے بعد اتنا ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک پیغمبر حضرت داؤدؑ کا ذکر کرتا ہے کہ "وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ" ہم نے ان کو زرہ بنانے کا علم دیا۔ ہم

نے ان کو وہ علم دیا کہ جس سے وہ اجسام انسانی کی حفاظت کا کام لے سکیں، ہم نے ان کے لئے لوہے کو نرم کردیا، ان کو وہ حکمت عطا فرمائی جس سے کہ وہ لوہے سے شیشہ کا کام لے سکیں۔ لوہے سے کسی بہت کمزور دھات کا کام نے سکیں۔ اور تخریب ہی نہیں بلکہ تعمیر کا کام لے سکیں۔ یہ ایک ایک لفظ معجزہ کی حقیقت رکھتا ہے۔

پھر ایک فرد کا معاملہ نہیں بلکہ قرآن مجید آگے بڑھتا ہے اور حضرت سلیمان بن داؤد کے خدام (جن میں جن وانس ہیں) ان کے احکام ومنشاء کی تعمیل کرتے ہیں اور صنعتی وتعمیری کارنامہ انجام دیتے ہیں اور جو وہ چاہتے ہیں بناتے ہیں اس میں اس کی بھی تصریح کردی کہ وہ تخریبی مقاصد کے لئے نہیں کرتے جب اس میں سلیمانؑ کی رہبری شامل ہے اس میں ان کا حکم چلتا ہے اور ان کے اشارے سے کام ہوتا ہے تو وہ تعمیری ہوگا اور نافع خلائق ہوگا۔ "یَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَایَشَاءُ" یہ نہیں کہ جو چاہیں وہ بنالیں جو وہ چاہتے ہیں بناتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے، ان چیزوں کی اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی طاقتوں کو اللہ کے منشا کے مطابق اور نبی کو جو پیغام دیا جاتا ہے اور جو مقام عطا ہوتا ہے اس کے تقاضوں اور اس کی خصوصیات کے مطابق اس کو استعمال ہونا چاہئے، ساری دنیا کی خرابی یہ ہے کہ وہ چیزیں تخریبی اور سلبی (DESTRUCTIVE & Passive) مقاصد کے لئے استعمال کی گئیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمادیا کہ "یَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَایَشَاءُ" وہ آزاد نہیں تھے جو چاہتے بناتے، لوگوں پر حملہ کرتے اور قوموں کو تباہ کرتے اور ملکوں کو پامال کرتے۔(۱)

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ر دسمبر ۱۹۹۳ء

ایسے علماء بنو جن کے اندر تربیت کا مادہ ہو

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ. (آل عمران: ۷۹)

لیکن تم لوگ اللہ والے بن جاؤ بوجہ اس کے کہ تم کتاب سکھاتے ہو اور بوجہ اس کے کہ پڑھتے ہو۔

قرآن مجید کی یہ آیت بھی ایک مستقل معجزہ ہے بلکہ معجزات کا مجموعہ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ" لیکن تم اللہ والے بنو، پھر اس کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے ربانیین کا لفظ استعمال کیا ہے اس میں تربیت بھی داخل ہے، یعنی وہ عالم جو ایک طرف رب سے تعلق رکھتا ہو، رب سے اس کا تعلق صحیح ہو، اخلاص اس کو حاصل ہو، اور دوسری طرف اس کو ایمان واحتساب کا درجہ حاصل ہو، یعنی وہ دعوت وتربیت اور اصلاح کی طرف بھی متوجہ ہو۔

میں عربی زبان کے ایک طالب علم کی حیثیت سے نہیں جانتا کہ کوئی لفظ اتنا جامع ومعنی خیز اور ایسا توجہ طلب اور نظر افروز ہو سکتا ہے، علمائے امت اور علمائے اسلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ ربانیین کے لفظ سے یاد کرتا ہے، "اللہ والے بنو" لیکن اللہ تعالیٰ کی صفت میں "رب کا" لفظ انتخاب فرمایا گیا کہ ایسے علماء بنو جن کے اندر

تربیت کا مادہ ہو، تربیت کی صلاحیت بھی ہو، انھیں کو علمائے ربانیین کہتے ہیں۔ حقیقت میں علمائے ربانیین وہ ہیں "وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ" کہ اللہ تعالیٰ ان سے دین کی تعلیم کا بھی کام لے اور دین کی اشاعت کا بھی اور اصلاح کا بھی اور شریعت پر اور سنت پر عمل کرنے کا بھی، اور جو چیز ان کی امتیازی ہے وہ ایمان اور احتساب ہے اور یہی ربانیین کے لئے ضروری ہے کہ جو کام بھی کیا جائے اللہ کی رضا کے لئے کیا جائے، اللہ کی قدرت اور استعانت پر یقین کرتے ہوئے بھی اور پھر اجر وثواب کی لالچ سے کیا جائے۔

پھر اس کے بعد فرمایا کہ "بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ" کہ تم دوسروں کو کتاب کی تعلیم دو، اس کے ساتھ "تَدْرُسُوْن" کا لفظ بھی لگایا گیا جو ہمارے اور آپ سب کے لئے قابل غور ہے کہ عالم ربانی عالم کامل اور باکمال بن جانے کے بعد بھی ضرورت ہے کہ مطالعہ جاری رہے، استفادہ اور علمی سفر جاری رہے، علمی ترقی جاری رہے۔

طالبین علوم دینیہ امت کے نمائندہ وترجمان اور کتاب وسنت کے شارح اور دین حق کی طرف بلانے والے ہیں۔ اور ان علماء کو تیار کرنے کے لئے جو مدارس قائم ہیں ان کے لئے یہ آیت ایک پوری موعظت، پوری دعوت اور ایک پوری کتاب ہے۔ یعنی ایک عالم کو، ایک دینی مدرسہ کے فارغ کو، کس کو اپنا مقتدی بنانا چاہیئے۔ اور کیا اس کو طرز اختیار کرنا چاہیئے۔ اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیئے اور کس جامعیت کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیئے کہ ایک طرف تو علم راسخ ہو، علوم نبویہ پر پورے طور پر قدرت ہو، استحکام ہو، اتقان ہو، اتقان علمی ہو، پھر اس

کے ساتھ ساتھ عمل ہو، عالم کے شایانِ شان جو عمل ہے جو ذوق عبادت ہے جو ذوق طاعت ہے اور جو ایمان واحتساب کا مادہ ہے وہ پیدا ہونا چاہئے کہ آج ہم اللہ کی رضا کے لئے پڑھ رہے ہیں اور ہم یہاں سے فارغ ہونے کے بعد دین کا کام کریں گے۔ یہ نہیں کہ پڑھ کر نکلے، خلیج چلو، دوبئی چلو، شارقہ چلو، سعودی عرب چلو، نام توحج وعمرہ کا لیکن مقصود یہ کہ کہیں جگہ مل جائے اور مل جاتی ہے کوئی صاحب کسی سفری ایجنٹ کے یہاں کام کررہے ہیں کوئی صاحب دواؤں والی دوکان میں کام کررہے ہیں اور کچھ نہیں تو مسجد کے مؤذن بن گئے، خطیب بن گئے، یہ اس علم کی قیمت نہیں، یہ "کونوا ربانیین" کے انداز کی بات نہیں یہ اس کے خلاف ہے۔

یہ آیت تو قیامت تک پڑھی جانے والی آیت ہے، اللہ تعالیٰ قیامت تک اس امت میں علماء کو پیدا کرتا رہے گا اور پھر ایسے روحانی تربیت کرنے والے، اور پھر دینی تعلیم دینے والے اور پھر دین کے لئے کوشش ومجاہدہ کرنے والے پیدا کرنے کی دعوت دی جاتی رہے گی تو اس لئے ایک ایک لفظ معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ قرآنی بلاغت کا ایک نمونہ ہے۔(تعمیر حیات لکھنؤ)

باب ۷

احکام و مطالبات

"......میں قرآن مجید کا ایک حقیر طالب علم ہوں
اور واقعہ یہ ہے کہ میری تمام فکر، تحریر و تقریر
اور اظہار خیال کا مظہر اور مرکز بلکہ اس کا سرچشمہ
قرآن مجید کا محدود مطالعہ ہے۔
"چھوٹا منھ بڑی بات ہوگی"
لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ ع
آنچہ کردم ہمہ از دولت قرآن کردم
اللہ تعالیٰ نے جو کچھ لکھنے پڑھنے کی توفیق دی
اور اپنے مطالعہ کا حاصل پڑھنے والوں کے
سامنے رکھ دیا، وہ سب قرآن مجید ہی کا فیضان ہے......"

(مولانا علی میاں ندوی)

کل مسلمان اور مکمل اسلام

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَّلَا تَتَّبِعوا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ.

سورہ البقرہ: ۲۰۸

اے ایمان والو! اسلام میں سارے کے سارے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو کیونکہ وہ تمھارا صریح دشمن ہے۔

یہ آیت مستقل ایک دعوت فکر ہے

یہ سورہ بقرہ کی ایک بہت مختصر سی آیت ہے۔ لیکن یہ آیت زندگی کے لئے بلکہ پوری کائنات کے لئے اور زندگی کی اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ اور خاص طور سے امت اسلامیہ کے لئے یہ آیت مستقل ایک درس گاہ ہے اور مستقل ایک دعوت فکر ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اے ایمان والو! تم "سلم" میں داخل ہو جاؤ اور "سلم" کا ترجمہ میں نے مستند اور معتبر تراجم میں دیکھا حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولوی فتح محمد صاحب جالندھریؒ تک سب میں "سلم" کا ترجمہ اسلام سے کیا گیا ہے۔ شاہ صاحبؒ کے ترجمہ میں "مسلمانی" سے کیا گیا ہے،

یعنی اے ایمان والو! مسلمانی اور اسلام میں داخل ہو جاؤ، "وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطٰنِ" اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اسلام کو سمجھنے کی ضرورت ہے

پہلی بات یہ ہے کہ پہلے اسلام کو سمجھنے کی ضرورت ہے، میں معذرت کیساتھ یہ بات عرض کروں گا، بہت سے حضرات کے ذہن میں جنھوں نے تقابلی مطالعہ نہیں کیا ہے، اور مذاہب کی تاریخ پر ان کی نظر نہیں ہے، ان کے ذہن میں شاید یہ بات مستحضر اور تازہ نہیں ہوگی کہ اسلام وہ واحد مذہب ہے دنیا کا ایک اصول و عقیدہ اور مسلک زندگی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، ورنہ جتنے مذاہب ہیں وہ سب (مذاہب کے بانی نہیں کہتا اور نہ کوئی مذہب کا بانی ہوتا ہے) مذاہب کے داعیان اول کے نام پر یا ملکوں کے نام پر، یا طبقوں اور نسلوں کے نام پر وہ مذاہب ہیں، مثال کے طور پر (مجھے معاف کیا جائے) یہودی مذہب ہے، اس کی نسبت یہودا کی طرف ہے جو خاندانِ نبوت کے ایک فرد تھے، عیسائی، اس کی نسبت حضرت عیسیٰؑ کی طرف ہے، پھر مجوسی، وہ پارسی کہلاتے ہیں، فارس (ایران) ایک ملک ہے، کوئی عقیدہ یا کوئی طرز زندگی ایک دعوت الٰہی نہیں ہے، ہندویت، ہند ایک ملک ہے اور وہ اس کی طرف منسوب ہے، برہمنیت، الگ طبقہ اور ایک خاص نسل کی طرف منسوب ہے، بدھ مت گوتم بدھ کے نام سے موسوم و مشہور ہے، ایسے ہی جینی مذہب، واحد مذہب جو ایک مسلک زندگی، عقیدہ اور نبوت کی طرف منسوب ہے، وحی الٰہی اور اللہ کی براہ راست رہنمائی اور اس کے دیئے ہوئے احکام اور شریعت کی طرف منسوب ہے، وہ اسلام ہے۔ تو اسلام کا پورا دار و مدار عقیدہ پر ہے، شریعت پر ہے، اور وہ بالکل ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔

اب اس کے بعد سوچنے کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً. اے ایمان والو! اسلام اور مسلمانی میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔

بظاہر ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ "فی السلم" کے بجائے "فی الاسلام" کہا جاتا، یعنی اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ، مگر نہیں یہاں "سلم" میں داخل ہونے کو کہا گیا۔ یعنی خدا کے ساتھ تمھارا معاملہ فرماں بردارانہ، مطیعانہ، مصلحانہ اور مکمل ہونا چاہئے، عقائد میں بھی، فرائض وعبادت میں بھی، طرزِ معاشرت اور طریقہ زندگی میں بھی، تمھیں اللہ تعالیٰ کی تعلیمات اور سید المرسلین خاتم النبیین ﷺ کے لائے ہوئے اور بتائے ہوئے احکام کا پابند ہونا چاہئے اور تعلقات میں اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ اللہ کے دشمن سے وفاداری اور اطاعت وفرمانبرداری کا تعلق نہ ہو۔

"اسلام" کا لفظ "مسلم" ہی سے نکلا ہے، عربی زبان ولغت کے لحاظ سے "اسلام" کے معنی ہیں "اپنے کو حوالہ کر دیا، سلنڈر SURUENDER کر دیا، اور اپنی ہر چیز سے دستبردار ہو گیا۔ اپنی ملکیت سے، خواہش سے، مصالح ومفادات سے، فوائد وضرر اس فرق کے لحاظ اور احساس سے دستبردار ہو گیا۔ اپنے کو خدا کے احکام کے قدموں میں ڈالدیا، اور اپنے کو بالکل سپرد کر دیا۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً" خدا کا مطالبہ سو فیصدی ہو۔

اس میں یہ بات لحاظ کرنے کی ہے کہ اس میں بتایا گیا کہ سو فیصدی اسلام میں داخل ہو جانا چاہئے، مسلمان بھی سو فیصدی ہوں، اور اسلام بھی سو فیصدی ہو، نہ مسلمانوں میں کوئی تحفظ یا ریزرویشن (RESERVATION) ہے۔ نہ اسلام میں کوئی تحفظ، استثناء یا ریزرویشن ہے، یہ ایک نکتہ ہے جس کو آپ ساتھ لے جائیں اور اس کی اشاعت کریں، خدا کا

مطالبہ اور قرآن مجید کی صریح آیت ہے کہ سو فیصدی مسلمانوں کو سو فیصدی اسلام میں داخل ہونا چاہئے اور مذاہب کی طرح نہیں کہ عقائد لے لئے اور سب کچھ چھوڑ دیا۔ عبادات لے لئے اور اس کے زندگی کے قانون اور زندگی کے طرزِ حیات اور طرز معاشرت سے اور باہمی حقوق اور فرائض سے اور شرعی قانون پر چلنے سے تعلق نہیں ہے۔ ہر مذہب نے ایک ایک حصہ لے لیا ہے، کسی نے دو لیا ہے کسی نے تین، یہاں مطالبہ یہ کیا جا رہا ہے کہ سو فیصدی مسلمانوں کی سو فیصد ی مسلمانوں کو سو فیصدی اسلام میں داخل ہو جانا چاہئے۔ مسلمانوں میں تحفظ اور ریزرویشن نہیں ہے کہ مسلمان پچاس فیصدی کے پابند ہیں اور قائل اور عامل ہیں، اور پچاس فیصدی سے مستثنیٰ ہیں، یا پچھتر فیصدی رکھ لیجئے، یہاں تو مطالبہ ہے کہ سو فیصدی اسلام ہونا چاہئے۔ ایک فیصدی بھی خارج نہیں ہونا چاہئے، کسی قسم کے استثناء یا رعایت یا کسی قسم کا خصوصی معاملہ نہیں کیا گیا، ہم کو ملت اور اپنا جائزہ لینے کا ایک رہنما اصول دیا گیا ہے، بلکہ پیمائش کا آلہ دیا گیا ہے، پہلا مطالبہ اللہ کا یہ ہے اور قرآن مجید کا صریح حکم یہ ہے سو فیصدی اسلام میں داخل ہونا چاہئے نہ تو یہ کہ پڑھا لکھا طبقہ مستثنیٰ ہے، شریف النسب اور عالی نسب لوگ مستثنیٰ ہیں، یہاں تک کہ حاکم مستثنیٰ ہیں، کسی بڑے سے بڑے حاکم (جو تصور اسلام میں حاکم یا خلیفہ کا ہے) کسی بڑے سے بڑے شہنشاہِ وقت، کسی بڑے سے بڑے سربراہ مملکت اور کسی بڑے سے بڑے قانون ساز، کسی بڑے سے بڑے فاتح اعظم، کسی کے لئے بھی کوئی استثناء نہیں ہے کہ اس کو نماز پڑھنے کی فرصت نہیں اس کو نماز سے مستثنیٰ کیا جائے، فلاں کو حج سے مستثنیٰ کیا جائے، کسی کو ہرگز یہ اجازت نہیں کہ جس پر حج فرض ہے اور وہ اس کی استطاعت رکھتا ہے وہ حج چھوڑے۔

اسی طریقہ سے "عائلی قانون" کہ سب مسلمان اس کے پابند ہیں، ترکہ اور میراث کے قانون کے سب مسلمان پابند ہیں، یہ بات چونکا دینے والی ہے ایک تازیانہ ہے ہمارے لئے

اس وقت ساری چیزیں اس کے ماتحت آجاتی ہیں۔

مطالبہ صرف اتنا نہیں کہ اسلام قبول کرو اور اسلام میں داخل ہو جاؤ، بلکہ مطالبہ یہ ہے کہ اسلام میں سو فیصدی داخل ہو، تم بھی سو فیصدی ہو اور اسلام بھی سو فیصدی ہو، نہ اس میں ریزرویشن، نہ اس میں ریزرویشن......"یا ایُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً" اے ایمان والو! اسلام اور مسلمانی میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سو فیصدی مسلمان اور سو فیصدی اسلام ہونا چاہئے۔

اس کا امکان ہے کہ ایک آدمی اسلام کا دعوی بھی کرے اور اللہ سے بندگی کا اعتراف اور بندگی کا تعلق قائم کرے اور بعض چیزوں میں ریزرویشن اور تحفظ کے ساتھ اپنی مرضی کو داخل کرے، کہ اچھا صاحب! ہم عقائد کو مانتے ہیں، بیشک توحید برحق، معاد اور آخرت کا عقیدہ برحق، حساب وکتاب برحق، لیکن معاشرت میں، تہذیب میں، اپنی گھریلو زندگی میں، اپنے عزیزوں کے ساتھ تعلقات میں، لین دین میں، کاروبار میں، تجارتی معاملات میں ہم آزاد ہیں۔ تو اللہ اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ یہ آیت اسی لئے نازل ہوئی ہے اور یہ آیت گویا تازیانہ عبرت ہے۔ ایک بہت بڑے خطرہ کا اعلان ہے کہ خدا فرماتا ہے: "یا ایُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً" اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، اسلام میں داخل ہو جاؤ، مسلمانی میں شامل ہو جاؤ، "کافۃ" کا تعلق دونوں سے ہے۔ داخل ہونے والوں سے بھی ہے اور جس دائرہ میں داخل ہو رہے ہیں اس سے بھی ہے وہ بھی کافۃ یہ بھی کافۃ اس طرح نہیں کہ مسجد جائیں اور ایک قدم مسجد کے اندر رکھا بس ہم مسجد میں داخل ہو گئے، یا دونوں قدم اندر رکھ دے اور اندر نہ جائے یا اندر تو جائے لیکن نماز نہ پڑھے یہ نہیں، "ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً" پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اور عامل بن جاؤ۔ "داخل" بھی بنو اور "عامل" بھی بنو۔

شیطان کے نقشہائے قدم کی پیروی نہ کرو

"وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ" (اور شیطان کے نقشہائے قدم کی پیروی نہ کرو) اور خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ میں بھی بڑی بلاغت ہے کہ اگر تم نے یہ نہیں کیا تو پھر اتباع خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ہوگا۔ یہاں پر اس لئے اس کا بھی ذکر کیا اللہ صرف فرمادیتا "ادخلوا فی السلم کافۃ" لیکن اس کا جو متوازی ہے وہ "وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ" ہے، آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ خطوات الشیطان ہے، یہ گھروں کو لٹادینا، یہ جائدادوں کو قرق کردینا یہ سودی قرض لینا اور اس خوشی میں راتوں کو جاگنا، صحت کو خراب کرلینا، یہ سب اس لئے ہے کہ نام ہو جائے اور شان ہو کہ فلاں صاحب کے یہاں بارات آئی تھی، اس میں ۲۰۰ موٹریں تھیں اور اتنی بڑی بارات تھی اور اس سب کو (FIVE STAR) ہوٹل میں ٹھہرایا گیا، میرے نام دعوت نامے آتے ہیں، اس میں لکھا ہوتا ہے کہ آپ (FIVE STAR) ہوٹل میں ٹھہریں گے، یہ ساری چیزیں "عرف" میں داخل ہوگئی ہیں جو عربی کا بہت بلیغ لفظ ہے جس کا ترجمہ ہے رسم ورواج اور اصولِ زندگی۔

تو اللہ فرماتا ہے: "وَلَاتَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ" اور شیطان کے نقشہائے قدم کی پیروی نہ کرو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

دیکھئے یہاں "نقشِ قدم" (واحد) نہیں استعمال کیا گیا بلکہ "خطوات الشیطٰن" جمع کا صیغہ لایا گیا، معلوم ہوا کہ اس شیطان کے بہت سے نقش قدم ہیں۔ اس میں وسعت آگئی خواہ اعتقادی چیزیں ہوں، خواہ عملی چیزیں ہو، خواہ اخلاقی چیزیں ہوں یا تہذیبی، خواہ سیاسی چیزیں ہوں سب اس میں شامل ہیں۔

اس آیت کو اپنے دل پر نقش کرلیں "یا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّةً

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ" جو لوگ عربی کا ذوق رکھتے ہیں وہ محسوس کریں گے کہ ان الفاظ میں بھی کتنا زور اور بلاغت ہے، یہ کھلا اعجازِ قرآنی ہے، اگر یہ کہا جائے کہ جلالِ الٰہی بھی شامل ہے، میں عربی کے طالب علم کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ بالکل الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے اگر ایسا نہ کرو گے تو اللہ کے غضب سے ڈرو، اور اللہ کی طرف سے بے برکتی پر ڈرو اور برے نتائج سے ڈرو۔"یا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ"اس سے اور صاف بات کیا کہی جا سکتی ہے۔(۱)

---

(۱) ۱۔ کل مسلمان اور مکمل اسلام

۲۔ قرآن کا مطالبہ۔ مکمل اطاعت و کامل سپردگی۔ دو مختلف تقریروں سے مشترک طور پر اخذ و تلخیص کر کے مرتب کی گئی ہے۔

سیرت وکردار کی تبدیلی کی ضرورت

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ.

اور کہو کہ اے پروردگار مجھے اچھی طرح داخل کی جیو اور اچھی طرح نکالیو۔

(سورہ الاسراء: ۸۰)

کہ ہر بن مو سے صدا آئے

اصل چیز ہے سیرت وکردار اور وہ طرز زندگی جو ایک سلطنت ہی نہیں بلکہ سلطنت سے بڑی چیزیں یعنی معرفت الٰہی، اللہ کے یہاں کی مقبولیت نظر کی تاثیر اور خیر عام اور ہدایت ورحمت الٰہی کا دروازہ کھولنے کا کام کرتی ہے، سلطنت تو اس کا ایک ہلکا اور ایک پھیکا سا نشان ہے۔ ایمانی سیرت وہ چیز ہے جو آفاق وانفس کی فتوحات عطا کرتی ہے اور وہ جہاں گیری عطا کرتی ہے جس کے سامنے سلطنتیں ہیچ ہیں، وہ اصل چیز جو ہر خیر کا منبع وسر چشمہ ہے وہ ہے سیرت، میں نے کسی موقعہ پر کہا تھا کہ ”ارادے اداروں کو پیدا کرتے ہیں، ادارے ارادوں کو پیدا نہیں کرتے“ اصل چیز ہے صحیح ارادہ، جب صحیح ارادہ ہو جاتا ہے تو پھر سیکڑوں ادارے وجود میں آتے ہیں، ادارے جیتے ہیں، مرتے ہیں، پیدا ہوتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں لیکن ارادہ انسانی جب صحیح ہو جائے اور انسانی کی نیت صحیح ہو جائے انسان کی سیرت، شریعت کے

سانچہ میں ڈھل جائے، انسان کے اعمال وتصرفات منشائے الٰہی کے تابع ہوجائیں، منشائے الٰہی کے سانچہ میں ڈھل کرنکلیں، اور ذہن کا رخ صحیح ہوجائے کہ ہر بُنِ مُو سے صدا آئے۔

"وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِّی مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا" تو ان کے غلاموں کے قدموں کے نیچے کسریٰ وقیصر کے تاج آتے ہیں ؂

در شبستان حرا خلوت گزید — قوم و آئین و حکومت آفرید

ماند شبہا چشم او محروم نوم — تا بتخت خسروی خوابیدہ قوم

اقبال کہتے ہیں کہ آپ کی امت تخت خسروی پر آکر سوگئی، یعنی اس نے تخت خسروی کو ایک معمولی چارپائی اور ایک سریر سمجھا اس کو خاطر میں نہیں لائی، جہاں بیٹھنا چاہئے تھا جاہ وجلال کا اظہار کرنے کے لئے وہاں وہ سوگئی۔

تو اصل چیز کیا ہے؟ خدا کو جب منظور ہوگا اور خدا کی حکمت کا تقاضا ہوگا تو سلطنت وجود میں آئے گی، اور جب خدا کی حکمت کو کچھ اور تقاضہ ہوگا تو اس سے بھی بڑی چیزیں وجود میں آئیں گی۔ یہ درویشان بے نوا، یہ فقیران کج کلاہ، آپ کی سرزمین میں آرام فرماہیں۔ انھوں نے بادشاہوں پر حکمرانی کی ہے، حضرت خواجہ برہان الدین غریب کے واقعات پڑھئے، حضرت خواجہ زین الدین کے واقعات پڑھئے، ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ شیخ زین الدین کو بادشاہِ وقت نے طلب کیا جو اس وقت کا سب سے بڑا بادشاہ تھا، کسی بات پر اس کو ناگواری ہوئی، تو انھوں نے خواجہ برہان الدین غریب کی قبر پر آکر اپنی لاٹھی گاڑدی اور کہا اب جس میں دم اور ہمت ہو وہ یہاں سے اٹھا کر دیکھے، تو اس کے سامنے بادشاہ ہی جھکا وہ اس کے سامنے نہیں جھکے، ایسی نظیروں سے پوری تاریخ بھری ہوئی ہے۔

ہماری باگ شریعت کے قبضہ میں ہو

اصل چیز کیا ہے، وہ ہے سیرت کا پیدا کرنا، جس کا عنوان ہے "ادخلنی" میں داخل ہون تو تیرے حکم کے مطابق نکلوں تو تیری تعلیم اور منشاء کے مطابق جس کو "مدخل صدق" اور "مخرج صدق" کہا گیا۔ وَاجْعَلْ لِیْ مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَاناً نَّصِیْراً" (الاسراء: ۸۰، اور اپنے ہاں سے زور و قوت کو میرا مددگار بنائیو) کہا گیا۔ آپ کے سوا مدد کرنے والی کوئی ذات نہیں ہے، میرے لئے آپ اپنی طرف سے طاقت پیدا کر دیجئے۔ اصل مسلمانوں کی طاقت اس میں مضمر ہے، کس کی سلطنت رہی ہے؟ اگر کسی کی سلطنت رہتی تو خلافت راشدہ رہتی، اور اس کے بعد کوئی شہنشاہی رہتی تو سلطنت عباسیہ، جو پورے متمدن افریقہ اور ایشیا کے عظیم ترین ممالک پر حکومت کرتی تھی۔ یہ مغلوں کی سلطنت خود کتنی بڑی سلطنت تھی، یہ چیز یعنی نعمت اللہ تعالیٰ کسی کو دے تو فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ میں اس کی تحقیر نہیں کرتا لیکن یہ مسلمان کے لئے موت وزندگی کا سوال نہیں۔ یہ نہیں کہ سلطنت ختم ہو جائے تو یہ امت مر گئی، اور جب سلطنت آئے تو یہ امت زندہ ہو گئی، امت سلطنت سے بالاتر ہے، سلطنت امت سے بالاتر نہیں، سلطنت امت کے لئے ہے، امت سلطنت کے لئے نہیں۔ سیرت سلطنت بھی پیدا کرتی ہے اور سلطنت سے بھی عظیم تر چیز پیدا کرتی ہے اور وہ سیرت خود خدا کو پسند ہے جس کے انعام میں وہ ساری دنیا بھی عطا کر دے اور ہفت اقلیم کی سلطنت بھی عطا فرمادے، اور عطا بھی فرمائی ہے، کبھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو اور کبھی اپنے کسی اور محبوب بندے کو۔

"وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ" میرا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، مرنا جینا سب تیرے لئے ہو، اور الفاظ قرآنی میں وہ کہا جاسکے جس کی نبی کو تعلیم دی

گئی ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذَالِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ.

(الانعام: ۱۶۲)

(یہ بھی) کہدو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب خدائے رب العالمین ہی کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی بات کا حکم ملا ہے اور میں سب سے اول فرماں بردار ہوں۔

مسلمان کی زندگی شریعت کے سانچہ میں، قرآن وحدیث کے سانچہ میں، سیرت نبویؐ کے سانچہ میں ڈھل کر نکلے، نہ اپنی خواہش سے جانا، نہ اپنی خواہش سے آنا، نہ اپنی خواہش سے اٹھنا، نہ اپنی خواہش سے بیٹھنا، نہ اپنی خواہش سے حکم چلانا، نہ اپنی خواہش سے حکم ماننا اور نہ اپنی خواہش سے کسی کو زیر کرنا، نہ اپنی خواہش سے کسی کے سامنے زیر ہونا، یہ ہے "اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ."

ہر کام کے لئے شریعت کی دلیل چاہئے، خدا تعالیٰ کیا چاہتا ہے اس وقت کا فرمان کیا ہے، اس وقت کا حکم کیا ہے؟ اس وقت خدا کا حکم ہے کہ ہم جھک جائیں، اس وقت خدا کا حکم ہے کہ ہم رک جائیں، حالیؔ نے صحابہ کرام کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے ؎

بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ ان کی   شریعت کے قبضہ میں تھی باگ ان کی
جہاں کردیا نرم نرماگئے وہ   جہاں کردیا گرم گرماگئے وہ

مجھے ایک تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے پرانی یادیں ستائیں اور میرے دل میں چٹکی لیں، یہ الگ بات ہے لیکن قرآن ازلی وابدی کتاب ہے اور وہ خدا کا فیصلہ ناطق ہے، اصل چیز ہے اسلام کی سیرت بنانا، یعنی نفس کی خواہش اپنے ذاتی مفادات اور وقتی تقاضوں کو شریعت کے سامنے جھکا دینا اور اس کے تابع بنا دینا، یہ جھوٹی عزت، یہ ناموری، یہ شہرت، ہم چشموں

میں عزت کوئی چیز نہیں ہے۔ اصل چیز امر الٰہی ہے اور امر الٰہی کیا ہے؟ اس کو تلاش کرنا کہ اللہ تعالیٰ ہماری کیسی زندگی چاہتا ہے اس وقت اسلام کی مصلحت کا تقاضا کیا ہے؟ معیار اور کسوٹی یہ ہے کہ ہمیں کیا ملے گا؟ ساری جدوجہد سیاسی جدوجہد سے لے کر معاشی جدوجہد تک اسی مرکز کے گرد گھومے وہ کیا؟ کہ ہمیں اس سے کیا ملے گا؟

اسلامی سیرت کی کمی ہے

آج تمام دنیا میں مسلمان ہیں، کون سا ملک ہے جہاں آپ کے ملک کے لوگ موجود نہیں؟ لیکن کس کے لئے ہیں بس یہی مسئلہ ہے دعوت پھیلانے کے لئے نہیں ایسا نہیں ہے کہ انسانیت پر رحم کھا کر، انگلستان، کنیڈا، امریکہ خود عرب ملکوں کی موجودہ خطرناک حالت دیکھ کر وہ بے چین ہو کر اپنے گھروں سے نکلے ہوں، یہ "اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ" نہیں ہے، اور وہاں جو گئے تو یہ "اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ" نہیں ہے، معاشی مصلحت کے مفاد نے ان کو نکالا، معاشی مفاد نے ان کو وہاں داخل کیا، معاشی وذاتی وخاندانی مفاد نے ان کو وہاں رکھا، جب اس کا تقاضا ہوگا کہ مکہ کے بجائے نیویارک چلے جائیں تو وہ چلے جائیں گے۔ آپ جب چاہیں امتحان لے کر دیکھ لیجئے اور جب اس کا تقاضا ہوگا کہ مکہ چلے آئیں تو وہاں چلے آئیں گے، اس لئے نہیں کہ وہاں حرم ہے بلکہ اس لئے کہ معاشی مسئلہ کا تعلق وہاں سے ہے۔ یہ نہ "مدخل صدق" پر عمل کر رہے ہیں اور نہ "مُخْرَجَ صِدْقٍ" پر چل رہے ہیں، یہ اللہ کا حکم ہے، اپنے نبی کو تعلیم دی جارہی ہے اور آپؐ کے ذریعہ آپؐ کے طفیل میں امت کو تعلیم دی جارہی ہے، ہم دعا کریں "رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ" ہمارا جینا، مرنا ہمارا کسی سے خوش ہونا، کسی سے ناراض ہونا، ہمارا ٹوٹنا اور جڑنا، ہمارا بگڑنا اور بننا یہ سب خدا کے حکم اور امر الٰہی کے تابع ہو، پھر دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ کیا عطا کرتا ہے؟ شکوہ اس

سیرت کے بدل جانے کا ہے، اس ذہن کے بدل جانے کا ہے کہ شریعت ہماری امام نہ رہی، شریعت ہمارا فیصلہ کرنے والی نہ رہی جو ہمارے مسائل میں ایک حکم کی حیثیت رکھے، ہم نے شریعت کو حاکم نہیں بنایا، ہم نے اپنی خواہشات کو اپنے مفادات کو حکم بنایا، بس اس وقت اصل انقلاب جو مسلمانوں کے لئے ضروری ہے وہ ہے سیرت کا اختیار کرنا کہ ہماری زندگی اللہ اور اس کے رسول کے منشا کے مطابق بن جائے وہ ہم سے جو کرائے وہ ہم کریں وہ جو چھڑائے وہ ہم چھوڑیں۔

تو یہ "اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ" ہے، مسلمان کو پہلے یہ پوچھنا چاہئے کہ شریعت کا حکم کیا ہے، یہ ہمارے لئے جائز ہے کہ نہیں؟

اس وقت جس چیز کی کمی ہے اور جو چیز فیصلہ کن اور انقلاب انگیز ہے وہ ہے اسلامی سیرت کا اختیار کرنا اور اگر ایسا اجتماعی طور پر ہو تو کیا کہنے ہیں، اجتماعی طور پر بھی الحمد للہ کوششیں ہو رہی ہیں۔ انفرادی طور پر کوشش کر کے دیکھئے۔

ہر ایک شخص یہ طے کرے کہ شریعت کو مقدم رکھنا ہے، حکم الٰہی اور حکم شرعی پوچھنا ہے کوئی بھی کام ہو سیاسی انتخاب و الیکشن سے لے کر شادی بیاہ، ختنہ، عقیقہ، مکان کی تعمیر، جائیداد کی تقسیم اور کھانے پینے تک یہ دیکھنا ہے کہ شریعت کی اجازت ہے کہ نہیں اور شریعت کا حکم کیا ہے؟

بس ضرورت ہے کہ ہم اپنی سیرت بدلیں، اس کے بغیر کام نہیں چلتا، اور جب اللہ اپنے محبوب رسولؐ سے یہ کہے اور اس کو یہ تلقین کرے اور یہ وظیفہ بتائے کہ تم یہ دعا کرو کہ "رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ" تو ہم کس شمار قطار میں ہیں۔(۱)

---

(۱) تلخیص از "تحفۂ دکن" ص ۷۲ تا ص ۸۲۔

مسلمان کی اصل طاقت وقیمت

ایمان وسیرت ہے

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

(الانفال ۲۹)

مومنو اگر تم خدا سے ڈرو گے، تو وہ تمہارے لئے امر فارق پیدا کر دے گا، (یعنی تم کو ممتاز کر دے گا) اور تمہارے گناہ مٹا دے گا، اور تمہیں بخش دے گا، اور خدا بڑے فضل والا ہے۔

مسلمان کی دو حیثیتیں

مسلمان کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت عام انسان کی ہے، جس قانون اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے ضابطہ کے مطابق سب انسان دنیا میں آتے ہیں وہ بھی دنیا میں آیا ہے، وہی اعضائے انسانی، وہی جسم اور جسم کے تقاضے، جسم کی کمزوریاں، جسم کی بیماریاں لے کر آیا ہے، جو انسانوں میں مشترک ہیں قانون فطرت اس کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے، وہ بچہ سے جوان ہو گا، جوان سے بوڑھا ہو گا، پھر ایک وقت عمر طبعی کو

پہونچنے کے بعد (اگر اللہ کو منظور ہوا) اس کا اخیر وقت بھی آئیگا، اور وہ کیسا ہی عبادت گزار، خدا ترس، کیسا ہی زبردست عالم مصنف ہو، مفکر ہو، فلسفی ہو، دانشور ہو، شیخ طریقت ہو، صاحب کشف وکرامات ہو، اس کو دنیا سے جانا ہے، " إِنَّكَ مَيِّتٌ وَّإِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ" اللہ تعالےٰ نے یہ صاف فرمایا ہے، تو پھر مسلمان کا استثناء کیسے ہو سکتا ہے،

لیکن ایک دوسری حیثیت ہے، وہ حیثیت اگر اس کے ساتھ قائم ہو جائیگی تو پھر وہ انسان رہتے ہوئے بھی کچھ اور چیز بن جاتا ہے، پھر اس کا معاملہ براہ راست اللہ تعالےٰ کے ساتھ ہو جاتا ہے، پھر وہ اللہ تعالےٰ کی تقدیر بن جاتا ہے، اس کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے قانون کو جو ہزاروں لاکھوں برس سے چلا آرہا ہے، بعض اوقات معطل، بعض اوقات مؤخر کر دیتا ہے، اور اس کو غالب کرتا ہے، اس کو عزت دیتا ہے، اس کو فتح عطا فرماتا ہے، اس کو نیک نامی بخشتا ہے، اس کو فاتح اور منصور بناتا ہے، یہ حیثیت ارادی اور اضافی ہے، یعنی اس کے لئے فیصلہ اور اضافہ کی ضرورت ہے، کوئی اپنے ساتھ لے کر کے نہیں آتا اس کو، ماں کے پیٹ سے، جہاں سے جسمانی اعضاء لایا ہے، ایسے ہی ایمان اور شریعت کی پابندی بھی لایا ہے، اس کو کسی ارادہ کی، فیصلہ کی ضرورت نہیں، وہ تو اس کے ساتھ گویا جسم کا ایک حصہ ہے، اب اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، یہ بھی ایک موروثی اور پیدائشی چیز ہے، ایسا نہیں ہے۔

اسلام کا معاملہ، اور خدا کے دین کا معاملہ یہ نہیں ہے، ایمان اور تقویٰ ایک ارادی واضافی چیز ہے جو بالارادہ ہوتا ہے، اور اس کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

ٹارچ کی قیمت اس سیلز سے ہے

اس کی موٹی سی مثال میں آپ کو دیتا ہوں، یہ ٹارچ ہے، اس میں سیلز رکھے جاتے ہیں، اگر قسمت سے سیلز رکھ دیئے گئے اور مسالہ بھر دیا گیا تو اس ٹارچ میں اور اس ٹارچ میں جو خالی ہے، آسمان و زمین کا فرق ہو گا، یہ ٹارچ کہلائے گی، یہ اندھیرے میں اُجالا کر دے گی، روشنی کا ایک تیز دھارا اس میں سے نکلے گا، یہ ہاتھ میں ہو گی تو آدمی ٹھوکر کھانے سے بچے گا، دیوار سے ٹکرا جانے سے بچے گا، کسی سوتے ہوئے بچے پر پاؤں رکھ کر چلے جانے سے بچے گا، اور معلوم ہو گا کہ اس کے ساتھ ایک بڑی طاقت ہے۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا.
(الانعام۔ ۱۲۲)

بھلا جو (پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لئے روشنی کر دی، جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، کہیں اس شخص جیسا ہو سکتا ہے، جو اندھیرے میں پڑا ہوا ہو، اس سے نکل ہی نہ سکے؟

اللہ تعالیٰ نے (جیسے کوئی ہجے کر کے بتاتا ہے) ہجے کر کے بتایا ہے، اور دو اور دو چار اس طریقے سے سمجھایا ہے، بھلا وہ جو مردہ تھا "اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ" ہم نے اس کو زندہ کیا، اور اتنا ہی نہیں "وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ" ہم نے اس کو ایک روشنی عطا کی جس کے سہارے سے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے "كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا" کیا وہ اس کی طرح ہو سکتا کہ جو اندھیروں میں بھٹکتا پھرتا ہے، نکلنے کا اس کو کوئی راستہ ہی نہیں ملتا۔

معاملہ ٹارچ میں سیلز اور مسالہ رکھنے کا ہے، یہ مسالہ بارگاہ نبوت سے ملتا ہے، اس کے لئے ایک ہی جگہ، ایک ہی ٹھکانہ ہے، حضور ﷺ کی بعثت کے بعد اب وہ سیلز اور کہیں نہیں مل سکتے، نہ امریکہ میں، نہ روس میں، نہ دنیا کے کسی کارخانہ میں، وہ ایمانی سیلز رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم لے کر آئے ہیں، وہ اگر آپ ٹارچ میں رکھتے ہیں، فٹ کر دیتے ہیں، تو ذرا سا بٹن دبایئے، ذرا سا ہاتھ کا اشارہ کیجئے اور روشنی کی ایک تیز رو نکلے گی، جس سے آپ کو بھی راستہ نظر آئیگا، دوسروں کو بھی راستہ نظر آئیگا، اور اس کی یہی قیمت ہے کہ یہی اسلام کی شان ہے کہ جب وہ سیلز بھر دیئے جاتے ہیں، تو صرف اس مسافر ہی کو جس کے ہاتھ میں وہ ہے، جو اس کا مالک ہے، اسی کو راستہ نظر نہیں آئیگا، بلکہ بیسیوں جو بالکل اندھوں کی طرح راستہ چل رہے ہیں، ان کو بھی راستہ نظر آنے لگے گا، یہ ہے مسلمان کی شان۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوْا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَاناً.

اے ایمان والو اگر تم اللہ سے ڈرو گے اور اس سے شرم کرو گے اس کا لحاظ کرو گے اور اس کے احکام کا احترام کرو گے اس کی شریعت کو قبول کرو گے، اس پر چلنے کا فیصلہ کرو گے، اس پر عمل کرنا شروع کرو گے، تو وہ تمہارے لئے امر فارق پیدا کر دے گا (یعنی تم کو ممتاز کر دے گا)

مابہ الامتیاز صفت

فرمایا "**يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَاناً**" اللہ تم کو ایک مابہ الامتیاز چیز عطا کرے گا، تمہاری سطح ایک دم سے بلند ہو جائیگی، تم اس پستی سے، ماحول کی خرابی سے نکل جاؤ گے، جب انسان اپنے کو اللہ کی روشنی سے محروم کر لیتا ہے تو پھر اس کا کیا حال ہوتا ہے؟

وہ اس ٹارچ کے طرح ہو جاتا ہے، جس کے سیلز ختم ہو چکے، یا اس میں رکھے ہی نہیں گئے۔

مسلمانوں کی اصل طاقت

ہم مسلمان کو جو اصل خصوصیت، ہمارا مابہ الامتیاز، ہمارا سرمایہ، ہمارا فخر، ہماری طاقت ہے وہ سیلز تھے، جو رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اللہ کے یہاں سے لے کر آئے ہیں، اور انسانوں کے دماغ اور انسانوں کے دل کے اندر رکھے، دماغ میں بھی سیلز رکھے ہیں، اور دل میں بھی، ایمان کا کچھ تعلق انسان کے ضمیر اور قلب سے ہے، کچھ انسان کے دماغ اور فکر سے ہے، اس سے خاص طرح کے اخلاق پیدا ہوتے ہیں، خاص طرح کا طرز عمل، زندگی کا رویہ اور مسلک پیدا ہوتا ہے، خاص طرح کے برتاؤ کرنے کا طریقہ آتا ہے، خالق کی معرفت ہوتی ہے، مخلوق سے محبت ہوتی ہے، خدا کا خوف ہوتا ہے، بندوں کی شرم ہوتی ہے، اللہ کا ڈر اور اس کی محبت ہوتی ہے، اور انسانوں کے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے، غریبوں پر آدمی رحم کھاتا ہے، بے ایمانی سے بچتا ہے، چوری سے پناہ مانگتا ہے، اس کو جرائم سے، ظلم سے گھن آتی ہے، بالکل سیرت ہی بدل جاتی ہے، یہ کس کا کرشمہ ہے، یہ ان سیلز کا کرشمہ ہے۔

معنوی خودکشی

مسلمان اپنے کو ان سیلز سے محروم کردے تو یہ معنوی خودکشی ہے، جیسے کوئی زہر کھا کر مرجائے، یا کوئی گلے میں پھندا ڈال کر کے اپنا گلا گھونٹ لے، مسلمان ہے، لیکن اس کے اندر ایمان کے وہ سیلز نہیں ہیں، عقیدہ کے وہ سیلز نہیں ہیں، وہ

"فرقان" نہیں ہے جس کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

يَاۤأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنْ تَتَّقُوْا اللهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَاناً۔ مومنو اگر تم خدا سے ڈرو گے تو وہ تمہارے لئے امر فارق پیدا کر دے گا۔

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرنے لگو گے، اور احتیاط کی زندگی گذارو گے، آپ ؐ کی لائی ہوئی تعلیمات پر عمل کرو گے، اِدھر چلو، اُدھر مت چلو، اس راستہ چلو، اس راستہ نہ چلو، اس لکیر کو نہ چھوڑو، یہ سرحد پار نہ ہونے پائے، اس کا نام تقویٰ ہے، تقویٰ کے معنی بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو نماز پڑھتا چلا جائے رات کو پلک سے پلک نہ لگے، اس کو لوگ متقی کہتے ہیں، تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ جن چیزوں سے اللہ اور اس کے رسول ؐ نے منع کیا ہے، اس سے بچیں، اس کے تصور سے خیال بھی آجائے تو خدا کی پناہ مانگیں، اور جن چیزوں کا حکم دیا ہے، ان کی پابندی کریں، ہفت ا کی سلطنت مسلمانوں کو مل جائے، ان کے قدموں پر بادشاہوں کے تاج رکھ دیئے جائیں، اور قارون کا خزانہ ان کو مل جائے لیکن ان کے اندر وہ سیلز نہ ہوں، نبوت کی لائی ہوئی روشنی نہ ہو، وہ فرقان نہ ہو، جو اللہ تعالیٰ دین پر چلنے والوں کو عطا کرتا ہے، تو دو کوڑی کی قیمت نہیں، مسئلہ بہت صاف اور بہت ہی واضح ہے، میں کوئی پہیلی نہیں بجھا رہا ہوں، ہماری آپ کی ساری طاقت، سارا امتیاز، اللہ کے یہاں بھی جو مرتبہ اور مقام ہے، اور مخلوق کی نگاہ میں بھی جو وزن اور طاقت ہے، وہ سب ان سیلز کے صدقہ میں ہے، سیلز سلامت سب کچھ، یہ دل سلامت سب سلامت، یہ دماغ سلامت سب سلامت، عقیدہ سلامت، اخلاق سلامت، مسلمان مسلمان ہے، نہ پہاڑ اس کا راستہ روک سکتے ہیں اور نہ سمندر۔

ایمان وسیرت کی کرامت

بات یہ کہ یہ سب سیلز کی کرامت ہے، یہ مسالہ جو اس کے اندر بھرا ہوا ہے، ایمان کا مسالہ،عقیدہ کا مسالہ، اخلاق کا مسالہ، مقاصد کا مسالہ، ہمارا عقیدہ الگ، ہمارا ایمان الگ، ہمارے اخلاق الگ ہونے چاہئیں، پھر کیا ہوگا"یَجْعَلْ لَکُمْ فُرْقَانًا" اللہ تم کو ایسی مابہ الامتیاز چیز بخشے گا کہ دور سے پہچانے جاؤ گے، جہاں جاؤ گے تمہاری عزت ہوگی۔

تو اللہ فرماتا ہے، اے ایمان والو!"اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ" اگر تم تقوی کی زندگی اختیار کرو، تمہارا مزاج بن جائے، ایک تو ہے کسی کام کو ہمت کر کے کرنا، ارادہ کر کے کرنا، اور ایک ہے مزاج بنایا جانا، اگر تم ڈھل جاؤ گے، شریعت کے سانچے میں ڈھل کر نکلو گے، تقوی تمہارا شعار بن جائے گا، تمہارے اندر دین کا، اللہ کا ایک لحاظ پیدا ہو جائیگا، "یَجْعَلْ لَکُمْ فُرْقَانًا" تو اللہ تمہیں ایک شان امتیازی عطا فرمادے گا، کہ دور سے پہچانے جاؤ گے، جہاں جاؤ گے تمہاری عزت ہوگی۔

"نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ" روشنی ان کے آگے چلتی ہے، وہ پیچھے ہوتے ہیں روشنی ان کے آگے چل رہی ہوتی ہے، خوش خبری سنا رہی ہوتی ہے، کہ اللہ کا ایک مقبول بندہ آرہا ہے۔

تو یہ آیت بڑی اہم ہے،(آیتیں سب اہم ہیں) یہ اعلان بھی ہے، یہ بشارت بھی ہے، یہ ضمانت بھی ہے، یہ انعام بھی ہے!

اعلان تو یہ کہ اللہ تعالیٰ جو ساری دنیا کو پیدا کرنے والا ہے، وہ اعلان کر رہا ہے،

کہ اے ایمان والو! اگر تم تقویٰ کی زندگی اختیار کروگے، تو اللہ تعالیٰ تمہیں "فرقان" عطا فرمائیگا!

"فرقان" کے معنیٰ کیا ہیں؟

"الفارق بین الحق والباطل، الفارق بین النور والظلام، الفارق بین الخیر والشر" ...... "یَجْعَلْ لَکُمْ فُرْقَانًا"......ایک ایسی قوت عطا فرمادے گا، ایک ایسی شان امتیازی عطا فرمائے گا کہ تم بالکل نرالے ہوگے جیسے پتھروں میں ہیروں کو ڈالدیجئے تو صاف معلوم ہوگا ہر شخص ان کو چن لے گا، علامتیں بتانے کی ضرورت نہیں، یہ ہیرا ہے یہ پتھر ہے، ایسے ہی تم ہو جاؤ گے کہ جیسے پتھروں میں ہیرا کانٹوں میں پھول، جیسے اندھیرے میں روشنی، (خدانخواستہ) اندھیرا ہو جائے اور راڈ جل جائے ساری محفل روشن ہو جائے، تمہیں اللہ تعالیٰ یہ روشنی عطا فرمادے گا، "یَجْعَلْ لَکُمْ فُرْقَانًا"!

یہ "فرقان" ملا تھا مسلمانوں کو، اور یہ "فرقان" ملا تھا، ان کی تقوی کی زندگی کی بدولت! جیسا کہ حالی نے کہا ہے۔

بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ ان کی   شریعت کے قبضے میں تھی باگ ان کی
جہاں کردیا نرم، نرماگئے وہ   جہاں کرو یا گرم، گرماگئے وہ! (۱)

---

(۱) مشترک تلخیص از ۱۔ تعمیر حیات ۱۰ر جون ۱۹۸۴ء

۲۔ تحفۂ دین و دانش ص ۶۸ تا ص ۷۱

۳۔ خطرہ ارتداد اور اس کا حل (مطبوعہ تقریر)

وہ جسکی خود خدائے پاک کرتا ہے نگہبانی

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ.

یہ قرآن مجید کی بہت مختصر سی آیت ہے جو چند لفظوں پر مشتمل ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، بے شک ہم نے "الذکر" کو نازل کیا ہے، اور ہم ہی یقینی طور پر اس کی حفاظت کرنے والے ہیں!

عظیم الشان اعلان

یہ قرآن مجید کی ایک آیت ہے۔ لیکن ایک بہت بڑا مژدہ، ایک بہت بڑی بشارت، ایک بہت بڑی ضمانت ہے، ایک عظیم الشان اعلان ہے، جس پر ساری دنیا کے کان کھل جانے چاہئیں، اور سب کو اس کی طرف متوجہ ہو جانا چاہئے، اس اعلان میں ایک عمومیت ہے، ایک زور ہے، ایک تاکید ہے، اور ایک یقین ہے، خاص کر مسلمانوں کے لئے تو یہ آیت بہت توجہ طلب ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "بے شک ہم نے "الذکر" کو نازل کیا" اور جہاں تک میری معلومات ہیں اور تھوڑا بہت مطالعہ ہے تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے، کہ "الذکر" سے مراد قرآن مجید ہے "بے شک ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا" اللہ

تعالیٰ جس شاہانہ، شہنشاہانہ انداز میں، جیسے شاہی فرمان ہوتے ہیں، جمع کے صیغے کے ساتھ، فرماتا ہے: "ہم نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"!

جو حضرات عربی داں ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس مضمون کو ادا کرنے کے لئے "ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں، ہم اس کی حفاظت کریں گے، کتنے طریقے ہوسکتے ہیں اس کے ادا کرنے کے لئے، قرآن مجید میں جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ بالکل الگ ہے، اس میں کئی طریقوں سے اس بات کو کہا گیا ہے، بڑی تاکید اور بڑی شدمد کے ساتھ کہا گیا ہے، کہ "ہم ضرور اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"!...... میں عربی زبان کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں تاکید کی کئی چیزیں جمع کردی ہیں، "اِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" اسم فاعل کا صیغہ ہے، پھر "اِنَّا" کے ساتھ، "له" کو مقدم کرنا" إنا لحافظون" کے بجائے "إناله لحافظون" یہ سب طریقے علم بلاغت سے تعلق رکھتے ہیں، علم نحو سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہ آیت بڑی قابل غور ہے

یہ آیت جس کے الفاظ گنے چنے ہیں، صرف چند، نہ معلوم ہم نے کتنی مرتبہ اور قرآن مجید میں ہزاروں مرتبہ پڑھی ہوگی، اور علماء کی زبان سے سنی ہوگی...... لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں بھی دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کے پورے مطالب پر، اس کے جو آفاق ہیں، جہاں تک یہ آیت پہونچتی ہے، جن حدود کو اس آیت نے سمیٹ لیا ہے، جو وسعت اس آیت کے اندر پائی جاتی ہے، اس پر میری پوری نظر ہے، لیکن

یہ آیت بڑی قابل غور ہے۔

ایک بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، کہ "ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا، اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری ہماری ہے" اور توریت وانجیل کے متعلق آپ کو معلوم ہے، قرآن مجید کے الفاظ کیا ہیں:-

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ

..........توریت وانجیل کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے نہیں لی تھی، انہیں قوموں کے سپرد تھی جن کے لئے یہ کتابیں نازل ہوئی تھیں، پھر اس کا کیا نتیجہ ہوا، آپ تاریخ میں دیکھئے اور مصنفین نے (خاص طور پر اب جو) جدید معلومات و تحقیقات کی روشنی میں آئی ہیں انہوں نے) بالکل اس بات کو ثابت کر دیا ہے یہ کتابیں محفوظ نہیں رہیں! ....

......اور یہ سب نتیجہ اس کا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام انہی کے سپرد کیا تھا، "بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللهِ" لیکن اس آیت میں اس کے بالکل برخلاف کہا گیا ہے "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ". (ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)۔

مجھے قرآن مجید کے محفوظ ہونے کے متعلق کچھ نہیں کہنا ہے...... میرا ذہن اس طرف گیا کہ اس قرآن مجید کی حفاظت کے وعدے میں اور کتنے وعدے مضمر ہیں، اس پر غور فرمایئے، اور ہمارے لئے کتنی بڑی بشارت ہے، ہمارے مدارس کا اصل تعارف یہی ہے، اس کی اصل قدروقیمت یہی ہے۔

ان مدارس کی اصل، ان کا مقام کیا ہے، اور ان مدارس کی اصل قدر و قیمت کیا ہے، یہ بات صرف اس پر منحصر ہے کہ آپ یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کے ضمن میں، قرآن مجید کی حفاظت کے اعلان میں اور کتنی حفاظتوں کا اعلان فرمایا ہے اور اس دُنیا میں حقیقی تحفظ کا راستہ کیا ہے؟

حقیقی تحفظ کا راستہ

یہ اس آیت سے معلوم ہوگا کہ "ہم نے ہی "الذکر" کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"!

جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ہم اس کتاب کی حفاظت کرنے والے ہیں، تو کیا آپ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب کسی کتب خانہ کی زینت بنی رہے گی، یہ تو کوئی بچہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس زور و شور کے ساتھ، اس آن بان کے ساتھ اگر یہ صحیح ہیں بلکہ میں اس سے آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ اس دھوم دھام کے ساتھ، اس شان و شوکت کے ساتھ، ساری دنیا کو تھرا دینے والی آواز کے ساتھ، جلال سلطانی نہیں، جلال شہنشاہی بھی نہیں، جلال خسروی بھی نہیں، بلکہ جلال الٰہی کے ساتھ فرمایا ہے، "وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے، ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں، ہم نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، ہم نے اس کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا ہے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جو اعلان اس شان کے ساتھ ہوا۔ اس اعلان کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ کتاب کسی کتب خانہ میں محفوظ

رہے گی، کوئی اس کو پڑھنا چاہئے گا تو پڑھ سکے گا...... یا یہ کہ قرآن مجید سینوں میں محفوظ رہے گا، لوگ اس کو جیسا کہ نازل ہوا تھا، من وعن یاد کرلیں گے، اور تراویح میں سنادیا کریں گے؟ نہیں!

"اِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" کے اندر پچاس اعلانات ہیں، اس کے اندر اعلان ہے کہ ہم اس کتاب کو، اس کتاب کے اندر جو مطالب ہیں ان مطالب کو بھی ہم زندہ رکھیں گے، ہم اس پر عمل کرنے کے سلسلہ کو بھی باقی رکھیں گے، ہم اس کتاب کی حفاظت کرنے والوں کی بھی حفاظت کریں گے، اس کتاب کو یاد کرنے والوں کی بھی عزت کرائیں گے، اس کتاب کا علم حاصل کرنے والوں کے سلسلہ کو بھی ہم باقی رکھیں گے، ہم اس زبان کو بھی محفوظ رکھیں گے جس زبان میں یہ نازل ہوئی ہے، اس زبان کے ان علوم کو بھی باقی رکھیں گے جو اس زبان کے سیکھنے کے لئے ضروری ہیں، ان مقامات کی بھی حفاظت کریں گے، اس ملک کی بھی حفاظت کریں گے جہاں کی اور جس ملک کی یہ زبان ہے!..........

..........میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ "وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" کی تفسیر میں یہ بھی شامل ہے کہ یہ عربی زبان بھی قیامت تک جب تک اللہ کو منظور ہے اسلام کو رکھنا اور قرآن مجید کو، یہ عربی زبان اسی قرآنی صرف ونحو میں، اسی قرآنی قواعد میں، اسی قرآنی زبان میں باقی رہے گی، "وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" کے اندر یہ بھی آتا ہے، کہ قرآن بھی محفوظ، قرآنی زبان کی صرف ونحو بھی محفوظ، جن ملکوں میں یہ زبان بولی جاتی ہے، ان کے تحفظ کی سب سے بڑی ضمانت اس آیت میں ہے، یہ اقوام متحدہ کے

منشور میں بھی نہیں ہے، یہ یونائیٹڈ نیشن کے اعلانات میں نہیں ہے، یہ صدر کارٹر کے کسی بیان میں نہیں ہو سکتی، روس کے کسی صدر کے یہاں نہیں ہو سکتی، یہ صرف "وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" کے اندر مضمر ہے!

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں......

......میں ایک قدم اس سے آگے بڑھ کے یہ کہتا ہوں کہ مختلف ممالک کے مسلمان بھی اسی حالت میں محفوظ اور اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہمارے ساتھ ہیں، حفاظت کی ضمانت ہمارے ساتھ ہے، جب کہ ہم قرآنی علوم اور قرآنی تعلیمات کو سینے سے لگائے رکھیں، ان کی نشر واشاعت ، ان کی خدمت، ان کے درس و تدریس، ان کے تعلیم و تعلم کا اہتمام کریں گے، آج ہم ہندوستانی مسلمانوں کی حفاظت کی سب سے بڑی ضمانت یہ ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ "وإنا له لحافظون" ہم اس قرآن کے محافظ ہیں تو اس کے حاملین کے بھی محافظ ہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ اذان رہے مؤذن نہ رہے ؎

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل!

......اللہ تعالیٰ نے کہا کہ "ہم نے "الذکر" کو نازل کیا، اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں، اس کی حفاظت کر کے رہیں گے، ساری دنیا ایک طرف ہو تو کچھ نہیں، "إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئاً أَنْ يَقُوْلَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنَ"۔ اس کا تو بس "کن" کہہ دینا کافی ہے۔

ہمارے تحفظ کا راز

اس "وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" میں ساری حفاظتیں اور ضمانتیں ہیں، اس لئے مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنے کو اس سلسلہ میں داخل کریں، اس کشتی نوحؑ میں اپنے کو بٹھا دیں، میں کشتی نوحؑ کہتا ہوں، کہ "لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ" ایک ہی جگہ تھی طوفان نوحؑ میں بچنے کی، اِس وقت بھی اگر کوئی جگہ ہو سکتی ہے، جبکہ ایک سیلاب امڈا چلا آرہا ہے، ساری دنیا پر مادیت کا، نفس پرستی کا، خواہش پرستی، کا قوت پرستی کا، طاقت پرستی کا، یہ سب کو لے ڈوبے گا، اس وقت کوئی پناہ کی جگہ نہیں ہے، پناہ کی جگہ ہے تو اس وقت کشتی نوحؑ تھی اور اس وقت کشتی محمدؐ، کشتی اسلام ہے، کشتی قرآن ہے، جو اس میں جگہ حاصل کرلے گا، اپنی جگہ بنالے گا، وہی بچے گا، مسلمانوں کی حفاظت کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہم قرآن مجید کے سائے کے نیچے آجائیں، جس کی حفاظت کا اللہ نے وعدہ کیا ہے، اس کے سائے میں جو آجائے گا وہ محفوظ ہو جائے گا، ہمارے تحفظ کا راز، ہماری صیانت و حفاظت کا راز قرآن کی بقا میں ہے، قرآن مجید کی تعلیمات کی بقا میں ہے، اور اس پر عمل کرنے میں ہے، اپنی طرف سے اس کی حفاظت واشاعت میں ہے...... یہ ضمانت اللہ کی طرف سے ہے، "وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ" ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں!!(۱)

---

(۱) تعمیر حیات جلد ۱۷، شمارہ ۲۳-۲۴ تلخیص

سلف صالحین کے ساتھ حسن ظن اور ان کی خدمات کا اعتراف

وَالَّذِيْنَ جَاؤُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا إِنَّكَ رَؤُفٌ رَحِيْمٌ.
(سورة حشر. ۱۰)

اور (ان کے لئے بھی) جو ان (مہاجرین) کے بعد آئے (اور) دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں، گناہ معاف فرما اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ (وحسد) نہ پیدا ہونے دے، ہمارے پروردگار تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے"!

مندرجہ بالا آیت میں مسلمانوں کی آئندہ نسلوں سے اس بات کا مطالبہ کیا جارہا ہے کہ گزشتہ نسلوں کے بارے میں ان کا رویہ شرح صدر اور اعتراف حق کا ہو جائے، صدق واخلاص، اطاعت رب، خوف وانابت، دین کی خدمت اور اسلامی سرحدوں اور قلعوں کی پاسبانی وحفاظت کے میدان میں جو سبقت اور فضیلت ان کو حاصل ہے، اس کو دل سے تسلیم کرنا چاہئے، ان کی طرف سے نئی نسل کے دلوں میں کوئی کینہ اور نفرت نہ ہو، ان کی خدمات کے اعتراف میں اس کو انقباض اور تکلیف محسوس نہ ہو، اس کی زبان ان کے لئے دُعاگو اور ثناخواں رہے۔ ان کے عذر اور

مجبوریاں۔ اس کے لئے قابل قبول ہوں۔ اور وہ ان فروگذاشتوں سے جن سے کوئی فرد بشر محفوظ نہیں رہتا، درگذر سے کام لے۔

اس لئے کہ جو اجتہاد کرتا ہے اس کے ساتھ خطاب وثواب کا احتمال رہتا ہے۔ گرنے کا اندیشہ اسی سے ہوتا ہے جو چلنے اور دوڑنے کا ارادہ کرے۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ نبی معصوم ﷺ کی تعلیم وہدایت کے سوا دوسرے تمام لوگوں کے احکامات وتعلیمات میں ردو قبول دونوں چیزوں کی گنجائش ہے۔

دعوت وتبلیغ کی ایک اہم ضرورت، نیز رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی اور آپؐ کی سیرت وتاریخ کی عظمت کو ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم صحابہ کرام کے محاسن کا اعتراف کریں۔ ان کے کارنامے کی عظمت واہمیت، ان کی وفاداری، باہمی محبت وتعاون علی الحق کے نقوش کو اُجاگر کریں۔ اور اس تابناک تاریخ کا یہ روشن ورق دُنیا کے سامنے پیش کریں۔ ان کی بھول چوک، اور بشری کمزوریوں کی حیثیت تاریخ کے صاف شفاف صفحہ پر ایک سیاہ نقطہ سے زیادہ نہیں، صحیح منطق اور عقل سلیم بھی اس موقف کو قبول کرتی ہے۔ اور قرآن مجید اور مستند تاریخ سے بھی یہی موقف درست ثابت ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے بھی سابقین اوّلین، اور سلف صالحین کے متعلق اسی روش کو قابل تعریف قرار دیا ہے :

"وَالَّذِيْنَ جَاؤُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ ......اِلخ"

اس آیت کا ہم سے مطالبہ یہ ہے کہ ہم سلف صالحین اور ایمان واحسان کے شعبہ ٔامام وپیشرو بزرگوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے، انکے بارے میں کوئی رائے

قائم کرنے اور ان پر کسی قسم کا حکم لگانے میں احتیاط سے کام لیں، اور اس میں کسی عجلت اور جذبات کا مظاہرہ نہ کریں۔ اور جب تک پوری طرح کسی مسئلہ کا اطمینان نہ ہو جائے اس پر قطعی حکم لگانے سے باز رہیں۔

بعض مرتبہ کسی وجہ سے یہ ذہن بن جاتا ہے۔ اگر کسی نے اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی تو گویا اس نے کوئی کام نہیں کیا، چاہے وہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ ہوں، یا حضرت مجدد الف ثانیؒ یا حضرت شاہ ولی اللہؒ۔ یہ تاریخ کے سطحی مطالعہ کا نتیجہ ہے، اس میں سب کا حصہ ہے، محدثین فقہا، صلحاء امت، اولیاء اللہ سب کا اس میں حصہ ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ امام ابو حنیفہؒ کیا کرتے تھے؟ نماز روزے کے مسائل بتاتے تھے، انہیں تو اسلامی خلافت و سلطنت قائم کرنی چاہئے"۔ تو خلافت تو قائم ہو جاتی ہے لیکن آپ کو نماز پڑھنا کون سکھاتا؟ اور وہ خلافت کس کام کی جس میں نماز پڑھنا کسی کو نہ آتا ہو؟۔

یہ خیال آپ کے دل میں نہ آئے کہ سب ناقص تھے، کسی نے اسلام کو سمجھا نہیں، کسی نے پورے اسلام کو قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یاد رکھئے سب لوگ اپنے امکان و استطاعت کے مطابق دین کی خدمت اور اس کی حفاظت میں لگے ہوئے تھے، کوئی وعظ کہہ رہا تھا، کوئی تقریر کر رہا تھا، اور کوئی حدیث پڑھا رہا تھا، کوئی فتوے دے رہا تھا، اور کوئی کتابیں لکھ رہا تھا، اپنی جگہ اسلام کی خدمت اور مسلمانوں کی تربیت کا کام کر رہے تھے۔ اور ہر ایک نے ایک محاذ سنبھال رکھا تھا۔

یہ کبھی نہ سمجھئے گا کہ اسلام کو اب کچھ لوگ سمجھے ہیں۔ اس سے پہلے کوئی پورے اسلام کو سمجھا ہی نہیں، یہ اسلام پر بڑا الزام ہے، یہ اسلام کی صلاحیت پر بڑا دھبہ ہے، اس سے قرآن شریف کی زندگی اور اس کا واضح اور قابل فہم ہونا مشکوک بن جاتا ہے جس کو " کتاب عربی مبین""لسان عربی مبین" کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ جو کتاب ہزار بارہ سو برس نہ سمجھی گئی ہو، اب کیا اطمینان ہے کہ وہ صحیح سمجھی گئی ہو؟...... اسلام کے بنیادی اصول، قرآن کے حقائق۔ اور دین کے قطعیات، تسلسل کے ساتھ چلے آرہے ہیں، اگر کوئی سمجھتا ہے کہ وہ عرصہ تک نہیں سمجھے گئے تو یہ اس کی نظر کی کوتاہی ہے، ایک بات بھی کوئی ثابت کردے کہ یہ حقیقت بالکل عالم اسلام بھول گیا۔ شیخ اسلام ابن تیمیہؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ایک سنت بھی نہیں ہے۔ جو پورے طور پر عالم اسلام سے کلیتہً اٹھ گئی ہو۔ اگر اس کونے پر موجود نہیں تھی۔ تو اس کونے پر موجود تھی۔ گویا بقول اقبالؔ ؎

جہاں میں اہل ایمان صورت خورشید جیتے ہیں ادھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

تو آپ سلف کے ساتھ حسن ظن رکھئے، اس میں ایمان کی بڑی حفاظت ہے، اور ان کے لئے دعا کرتے رہئے کہ،

رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالإِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا إِنَّكَ رَؤُفٌ رَحِيْمٌ. (۱)

---

(۱) ا۔ تزکیہ و احسان یا سلوک و تصوف، ص ۹-۱۰

۲۔ دریائے کابل سے دیائے یرموک تک، ص ۱۰۹

۳۔ نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں، ص ۱۳۳ تا ۱۳۷ سے مشترک اخذ و تلخیص

زندگی سورہ العصر کی روشنی میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ.

"قسم ہے زمانہ کی کہ انسان بڑے خسارہ میں ہے، مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے"

جامع ترین سورت

یہ سورت قرآن شریف کی مختصر ترین لیکن جامع ترین سورتوں میں ہے، یہاں تک کہ اسلام کے جلیل القدر ائمہ اربعہ یعنی چار بڑے اماموں میں سے ایک بڑے امام حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا مقولہ ہے (بعض کتابوں میں دیکھا) کہ اگر قرآن مجید میں سے کوئی چیز سوائے والعصر کے نازل نہ ہوتی، تب بھی یہ کافی تھی یہ ایک دستور العمل ہے مسلمان کی زندگی نہیں بلکہ انسان کی زندگی کا صحیح دستور العمل ہے، جو آسمان سے نازل ہوا ہے، ایک روایت میں دیکھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم جب ملتے تھے اور دیر تک ساتھ رہتے تھے تو جدا ہونے سے پہلے والعصر سنا دیا کرتے تھے، اس

لئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسی ملاقات کو مفید سمجھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اس کا مواخذہ نہیں ہوگا کہ جس کا اختتام کسی پیغام اور کسی مفید کام پر ہو، دعوت پر ہو۔

زمانہ گواہ ہے

اس سورہ کا آغاز "والعصر" سے ہے، یعنی زمانہ گواہ ہے...... اس لئے کہ جو بات کہی جانے والی ہے اس کا تعلق زمانہ سے ہے، اس کے لئے بہترین گواہ زمانہ اور تاریخ ہو سکتی ہے، اس انسان کے متعلق کہا گیا ہے، جو پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے اور جب تک خدا کو منظور ہے وہ رہے گا، تو کوئی اس کا ساتھ نہیں دے سکتا، بڑی سے بڑی مقدس ہستی سے متعلق کہہ دیا گیا ہے کہ:- "كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" اور آنحضرت ﷺ جو محبوب رب العالمین ہیں اور آخری پیغمبر ہیں آپؐ کے متعلق کہہ دیا گیا "إِنَّكَ مَيِّتٌ وَّإِنَّهُمْ مَيِّتُوْنَ" اور "وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُوْلٌ قَدْخَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِمَّاتَ أَوْقُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى أَعْقَابِكُمْ" کسی کو بھی دنیا میں رہنا نہیں ہے، ایسا گواہ کہاں سے لایا جائے جو دیکھتا چلا آرہا ہے اور دیکھ رہا ہے اور دیکھتا رہے گا، تمام واقعات کا شاہد ہے، کامیابوں کا بھی اور ناکاموں کا بھی، اور کبھی بڑے سے بڑے فاتحین اور کشور کشاؤں، اور اپنے زمانے کے ان لوگوں سے لے کر جن لوگوں کی خوش نصیبی کی قسم کھائی جاتی تھی، ان کی اقبال مندی ضرب المثل تھی، ان سے لے کر دنیا کے ناکام ترین انسانوں تک، تمام طبقات انسانی کو، اور جماعت انسانی کو دیکھتا رہا، اس لئے آغاز اس سے ہوا (العصر) سے کہ زمانے کی گواہی ہے، زمانہ شاہد ہے۔

چونکا دینے والا جملہ

پھر اس کے بعد وہ جملہ کہا گیا جو ذی ہوش انسانوں کو سب سے زیادہ چونکا دینے والا ہو، "الارم" جس سے انسان کے کان کھڑے ہو جائیں، اور انسان سارے کام کو چھوڑ کر ادھر متوجہ ہو جائے، وہ بات کہی گئی ہے، انسان کی فطرت میں ہے، فائدے کی خواہش اور اس دنیا میں جو کچھ ترقی شروع ہوئی ہے، جو کچھ رونق ہے...... جو آپ بہار دیکھ رہے ہیں، یہ سب رہین منت ہے اس بات کا، نتیجہ ہے اس بات کا کہ انسان کی فطرت میں فائدے کی خواہش ودیعت ہے یہ دنیا کی بہت بڑی طاقت ہے، اسی نے تمدن کو ترقی دی، علم وصنعت کو ترقی دی، فلسفے کو ترقی دی، علم وصنعت کو ترقی دی، فلسفے کو ترقی دی، معرفت کو ترقی دی، انسان کے باطنی کمالات کو ابھارا، انسان کی اندرونی طاقتوں کو مہمیز کا کام دیا، انسان کے اندر سے اگر فائدے کی خواہش نکال دی جائے تو انسان بجھ کر رہ جائے اور انسان ہی بجھ کر نہ رہ جائے بلکہ یہ دنیا جو آپ کو اتنی روشن نظر آ رہی ہے یہ بجھ کر رہ جائے، دنیا کی جو آب وتاب ہے، جو فروغ ہے، سرگرمی ہے۔ سب اس بات کا نتیجہ ہے کہ انسان فائدہ چاہتا ہے، انسان کا دل اگر فائدے کی طرف سے سرد ہو جائے، اس کے اندر سے فائدے کی خواہش نکل جائے تو کچھ بھی نہ ہو، نہ وہ اپنی جگہ سے ہلے، نہ جائے نہ آئے، نہ تجارت کی سرگرمی رہے، نہ فتوحات کی جدوجہد باقی رہے۔

یہاں پر وہ جملہ کہا گیا ہے جو حقیقت میں ایسا ہے کہ اگر سوتے ہوئے انسانوں کے سامنے بھی کہا جائے تو ان کو جاگ جانا چاہئے، اور سارے کام کو چھوڑ کر

اس کی طرف متوجہ ہو جانا چاہئے، جیسے خطرے کی گھنٹی بجائی جاتی ہے، جیسے زور کی چٹکی لے لی جاتی ہے کہ سوتے ہوئے آدمی کے پہلو میں آپ چٹکی لے لیں تو وہ تلملا کر بے چین ہو کر اٹھ جاتا ہے،"إِنَّ الإِنسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ" سے بڑھ کر کوئی چیز، کوئی نوٹس، اپنی طرف متوجہ کرنے والا نہیں کہ بے شک انسان نقصان میں رہنے والا ہے، "الانسان" کہا کہ ہر زمانے کے، ہر حیثیت کے اور ہر طبقے کے لوگ نقصان میں رہنے والے ہیں کسی کا استثناء نہیں، یہ جملہ ایسا ہے کہ فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔

اگر دو صفتیں پائی جائیں

اس کے بعد فرمایا:-

"إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ"سوائے ان لوگوں کے جن کے اندر دو صفتیں پائی جائیں، ایک ایمان...... جس کا تعلق حقائق سے ہے اور ذہنی تحصیل سے ہے، اور ایک "عملوا الصالحات"...... جس کا تعلق قلب، ذات، اخلاق اور عمل سے ہے، ان دو کے علاوہ سب نقصان میں رہنے والے ہیں۔

یوں سمجھ لیجئے کہ کوئی یہ کہے (چونکہ زمانہ زیادہ مناسب حال نہیں ہے ورنہ بات زیادہ سمجھ میں آتی) کہ انسان برف کا تاجر ہے، برف کا سوداگر ہے برف کا STOCKIST ہے، برف گھل جانے والی ہے، تو کہا گیا کہ اگر یہ برف جلدی بیچ نہ لی گئی، یہ برف حیات جو ہے، یہ زندگی جسے ہم قائم ودائم سمجھتے ہیں، یہ بھی پگھلنے والی ہے اگر جلدی آپ نے بیچ کر دام نہیں جمع کر لیا تو یہ پانی ہے سب پانی ہو کر رہ جائے گا۔ آپ صبح سے برف کی دوکان کھول کر بیٹھیں یا برف کی مِل ہی صحیح، دوکان نہ صحیح سب

سے بڑا STOCKIST شہر میں جو ہو سکتا ہے برف کا، تو اگر وہ بیٹھا رہا، سوتا رہا، باتیں کرتا رہا، تفریح میں وقت گذار دیا تو برف انتظار نہیں کرے گی۔ یہ برف پگھل کر پانی ہو جائے گی، اور ساری محنت پر اور سارے سرمائے پر پانی پھر جائے گا، یہی پانی نہیں ہو گی بلکہ پانی پھیر دے گی، انسان کی زندگی کا حال بھی یہی ہے کہ جلدی سے اس نے دام وصول نہیں کیے، اگر جلدی زندگی سے فائدہ نہیں اٹھالیا، جلدی زندگی سے معاوضہ نہیں لے لیا، جلدی سے زندگی کو قیمتی نہیں بنالیا تو یہ برف ہے، گھل جائے گی، اس کو قائم رکھنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے۔

فرمایا کہ انسان نقصان میں رہنے والا ہے، بلکہ زیادہ تر وہ انسان ہیں جو سب کے سب برف کے سوداگر ہیں، اور زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو خیال نہیں کر رہے ہیں، کہ برف اپنا کام کر رہی ہے، برف اپنی فطرت پر چل رہی ہے، جیسے برف گھلتی ہے پگھلتی ہے، زندگی بھی رواں دواں ہے جو سانس باہر جاتی ہے وہ زندگی کے رقبے کو کم کرتی ہے، زندگی کی وسعت کو محدود کرتی ہے، آپ سوتے میں بھی برابر سانس لیتے ہیں اور جاگنے میں بھی، تو آپ برف کو پگھلا رہے ہیں، آپ نے اگر جلدی سے اس میں بقا کی صورت نہ پیدا کی، اس کی قیمت نہ وصول کی، تو ایسے تاجر سے بڑھ کر کوئی دیوالیہ اور ناکام تاجر نہ ہوگا۔

فرمایا کہ "إِنَّ الإِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ" کہ سب انسان برف کے تاجر ہیں اور برف کے مالک ہیں، ان کی زندگی برف، ان کی جوانی برف، ان کی طاقت برف، ان کے اعضاء برف، سب کے سب برف کی طرح جواب دے جانے والے، ٹھنڈے پڑ جانے والے ہیں، آپ کہتے ہیں خود یہ محاورہ استعمال کرتے ہیں کہ انسان ٹھنڈے

ہو گئے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے، فلاں آدمی سرد ہو گیا، یہ تو محاورے کے طور پر استعمال کرتے ہیں حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان پگھلنے والا، گھلنے والا اور بہنے والا ایک سیال مادہ ہے، ایک رقیق مادہ ہے کہ کہیں اس کا ٹھہراؤ نہیں اس لئے عقلمندی یہ ہے کہ جلدی اس کو وصول کر لیجئے، جلدی اس کو محفوظ کرا لیجئے، کہیں اس کا کوئی بینک ہو تو وہاں اس کو محفوظ کرا لیجئے، کہیں اس کے دام کھرے کر لیجئے، قیمت وصول کر لیجئے، ورنہ یہ زندگی فانی ہے۔

زندگی کی اصل طاقت و قیمت

جب انسان کا حال یہ ہے کہ وہ ایک فنا ہونے والی چیز ہے، زندگی ختم ہونے والی چیز ہے، تو اب اس کا دام کیا ہے، یہ کہ اس کی اندر یہ صفتیں پائی جائیں جو اس کے خالق نے جس نے اس کو برف بنایا ہے، جس نے اس کو سیال اور رواں دواں بنایا ہے، وہی بتائے کہ اس کے دام کیا ہیں، اسی سے اس کے دام حاصل کئے جائیں، اس لئے کہ کوئی چیز بھی ہو، جب تک کہ اس کی جو اصلی قیمت ہے، اس چیز کا جو اصلی جوہر ہے جب تک کہ اس کے دام نہ معلوم کئے جائیں اس کا کوئی فائدہ نہیں، مثلاً آپ ہیرے جواہرات کے تاجر ہیں لیکن ایسے عوام کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں کہ جو جانتے نہیں، اس کی قیمت پہچانتے نہیں تو عمر گذر جائے گی ایک آدمی بھی خریدار نہ ہوگا، اور آپ سے کچھ لے کر نہیں جائے گا، تو اسی پوچھنا چاہئے کہ اس کی اصل قدر و قیمت کیا ہے؟

تو بتایا جارہا ہے "إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ" ہم اس کو خریدتے

ہیں، اس زندگی کو میں نے تجارت کی مثال دی، اور بیچنے والے کی! یہ قرآن کی تعبیر ہے "إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ" اللہ تعالیٰ نے انسانوں کا سودا کر لیا ان کی جانوں کا اور مالوں کا جنت کی قیمت میں، جنت کے عوض میں، وہ مشتری (خریدار) ہے، ہم بائع (بیچنے والے) ہیں، ہم برف کے تاجر اور وہ خریدار، تو وہ بتائے کہ ہم اس پر خریدتے ہیں، یہ ہماری شرط ہے جب ہی تو سودا بک سکتا ہے، ورنہ سودا بک نہیں سکتا۔

تو وہ کہتا ہے کہ ایمان اور عمل صالح! تو ایمان اور عمل صالح ہے، جو زندگی کو قیمتی بناتا ہے، ورنہ یہ بالکل پانی ہے، پانی کی طرح بہہ کر بالکل ختم ہو جائیگی، کروڑوں نہیں اربوں انسانوں کی زندگی پانی کہ طرح بہہ کر چلی گئی، کچھ بھی وصول نہیں کیا انہوں نے اور ان میں بڑے بڑے بادشاہوں، بڑے بڑے قانون ساز، ذہین ترین انسان، چوٹی کے ادیب، شاعر اور موجد، صناع اور کشور کشا سب شامل ہیں کہ انہوں نے زندگی کی قیمت نہیں سمجھی اور نہ زندگی کے بنانے والے سے پوچھا کہ میں اس کو کس طرح سے قیمتی بناؤں۔

ایمان اور عمل صالح لے کر آؤ

"إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ" ایمان اور عمل صالح ہے جو اس زندگی میں قیمت پیدا کرتا ہے، ہم جو اس زندگی کے بنانے والے ہیں۔ "أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ" ہم بنانے والے ہیں، ہم تم سے کہتے ہیں، اور کوئی

کیا کہے گا، یہ اللہ کا کرم ہے کہ اسی کی زندگی تھی اور وہی اس کی قیمت بتارہا ہے کہ دیکھو ہمارے یہاں اس زندگی کا دام یہ ہے، ہمارے یہاں اس زندگی کی قدر و قیمت یہ ہے، کہ ہمارے یہاں ایمان اور عمل صالح لے کر آؤ، تم کہو کہ ہم نے یہ بنایا، یہ بنایا اتنی کوٹھیاں، اتنی موٹریں، اتنے نوکر اتنے بڑے بڑے عہدے، اس کی ہمارے یہاں کوئی قیمت نہیں، ہمارے یہاں قیمت ایمان اور عمل صالح کی ہے، اس کی بڑی عنایت ہے کہ زندگی اسی نے دی اور زندگی کی قیمت بھی اسی نے بتادی (FIX) کردی، مقرر کردی، متعین کردی......ورنہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ جو ضائع ہورہی ہیں، کیونکہ ان کی قیمت کا تعین نہیں ہوا، کسی نے جانا نہیں، سمجھا نہیں کہ اس کی کیا قیمت ہے، کتنی چیزیں ہیں کہ آدمی اس کو بناتا ہے لیکن اس کو حاصل نہیں کرسکتا ہے اس لئے کہ لوگوں نے مانا ہی نہیں، تسلیم ہی نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ" اگر یہ دو صفتیں پائی جائیں گی، تو تم خطرے سے بچ جاؤ گے "خسر" نقصان سے بچ جاؤ گے۔ لیکن فرد تو بچ جائے گا معاشرہ اب بھی خطرے میں ہے جو فرد اپنے اندر یہ دو صفتیں پیدا کرے گا ایمان اور عمل صالح کا وہ تو بچ جائے گا، ناجی ہوگا، وہ کامیاب ہوگا، لیکن معاشرہ اب بھی خطرے میں ہے، سماج اب بھی خطرے میں ہے، اس کے بچنے کی صورت کیا ہے؟

معاشرہ خطرے میں ہے

"وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" فرد یہ کام بھی کرے کہ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرے، اگر اس نے یہ نہ کیا تو وہ

معاشرہ بھی ڈوبے گا اور یہ فرد بھی ڈوبے گا، جس معاشرے میں تواصی حق اور تواصی صبر نہیں ہے یعنی ایک دوسرے کو حق کی تلقین نہیں کی جاتی، خود بہت اچھے مرد صالح اور نیک سیرت ہیں، عابد و پرہیزگار ہیں لیکن کسی سے بھی نہیں کہتے، اپنے گھر والوں سے نہیں کہتے، بچوں سے بھی نہیں کہتے کہ تم نماز پڑھو، تم بھی نہیں کہتے کہ تم بھی برائیوں سے بچو، تم بھی ظلم سے بچو، تم بھی کرپشن CORRUPTION سے بچو، تو وہ معاشرہ سڑ جائے گا اس میں فساد پھیلے گا، اور پھر وہ معاشرہ بھی جائے گا اور یہ فرد بھی جائے گا۔

یہ فرد اپنی حد تک خطرے سے نکلا تھا، لیکن چونکہ معاشرہ اب بھی خراب ہے، اس لئے وہ فرد بھی نہیں بچ سکے گا، تو فرمایا کہ یہ چیز متعدی ہونی چاہئے، یعنی کہ تمہارے اندر ایمان و عمل صالح کی صفت پیدا ہوئی ہے۔ اب تمہارے اندر سے یہ کرنٹ نکلنا چاہئے، یہ روشنی تم سے پھیلنی چاہئے، معاشرے تک جانی چاہئے، تاکہ معاشرے کے دوسرے افراد جو ہیں وہ بھی تمہارے اس راستے پر آئیں، اگر وہ نہ آئے تو تمہارا بھی اس پر قائم رہنا مشکل ہو جائے گا، تمہیں بھی اس پر استقامت مشکل ہو جائے گی، اس لئے کہ جو معاشرہ فاسد ہوتا ہے، جو ماحول فاسد ہوتا ہے اس میں بڑے سے بڑے صالح انسانوں کا بھی دم گھٹنے لگتا ہے اور ان کو بھی اپنے اس صحیح راستے پر رہنا مشکل ہو جاتا ہے، ایک وقت ایسا آتا ہے، وہ معاشرہ اتنا فاسد ہو جاتا ہے کہ وہ صالح کو برداشت نہیں کر سکتا جیسے کہ کسی کی سانس روک دی جائے، منھ پر ہاتھ رکھ دیا جائے تو اس میں گھبراہٹ پیدا ہو جاتی ہے اس کی جان پر بن آتی ہے، اور دم گھٹنے لگتا ہے۔

ایسے ہی معاشرہ خراب ہوتے ہوتے اس درجہ میں پہنچ جاتا ہے۔ اور وہ صالح انسان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اس کا ہاتھ نہیں پکڑتا، کچھ کہتا نہیں، لیکن وہ معاشرہ کہتا ہے "اَخْرِجُوْهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ" ایک معاشرہ ایسا بگڑا تھا اس میں ایک خاص طرح کی گراوٹ ایسی پیدا ہوگئی تھی، حضرت لوط علیہ السلام اور ان کے گھر والے راستہ نہیں روکتے تھے، کچھ کہتے نہیں تھے، ان میں اتنی طاقت ہی نہیں تھی، حالانکہ انھوں نے کہا بھی "آوِیْ إِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ" کوئی ہوتا کہ جس کی میں پناہ لیتا، وہ اتنا کمزور تھا لیکن معاشرہ اس کمزوری کے باوجود بھی برداشت نہیں کرسکا، کہتا ہے کہ نکالو ان کو، یہ بڑے پاکباز ہیں، تو جب معاشرہ ناپاک ہوتا ہے تو پاک باز کو دیکھنا اس کے برداشت سے باہر ہوجاتا ہے۔ ہم سے آکر بہت سے بھائی کہتے ہیں کہ میں رشوت نہیں لیتا، بعض تبلیغی احباب ہیں بعض اور بھی ہیں جو کہتے کہ ہم رشوت نہیں لیتے۔ یہی ہمارا جرم ہے، اور ہمارا ماحول جو ہے، ان دنوں جو آفس ہے دوسرے ڈیپارٹمنٹ ہیں وہ ڈپارٹمنٹ ہمیں برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں، ہم کھٹکتے ہیں جیسے آنکھ میں کوئی چیز پڑ جائے تو ان کو آرام نہیں ملتا، کھٹک پیدا ہوجاتی ہے، ایسے ہی معاشرے کی حس جو ہے وہ برداشت نہیں کرسکتی، بھائی ہم آپ کو کیا دے سکتے ہیں، ہم خود ہی نہیں لیتے، بلکہ آپ ہمارا حصہ بھی لے لیجئے گا، ہم اس میں حصہ لگانے کے لئے تیار نہیں، آپ کو فائدہ ہی فائدہ ہے، تو انہوں نے کہا کہ فائدہ و نقصان نہیں، ہم تمہیں دیکھ نہیں سکتے، وجہ کیا ہے کہ ان کو دیکھنے سے خدا نے جو انسان کے اندر ایک چیز ودیعت کی ہے، ملامت کرنے کی کارشپ جو ہے، وہ کارشب

کسی کسی وقت بیدار ہوتی، تو اس کا تو موقع ہی نہ آئے یعنی کوئی ایسا آدمی نہ آئے کہ اس کو دیکھ کر کے ہمارا دل ہم کو ملامت کرے، تو وہ چاہتے ہیں کہ یہ کھٹک بھی دور ہو جائے۔

دعوت بھی ضروری ہے

قرآن شریف نے...... متنبہ کر دیا کہ صرف ایمان اور عمل صالح کافی نہیں بلکہ دعوت بھی ضروری ہے، اس لئے کہ اگر یہ دعوت نہ ہوئی تو معاشرہ اتنا بگڑے گا کہ تم اپنے ایمان اور عمل صالح پر قائم نہ رہ سکو گے، اس لئے تم...... ایمان اور عمل صالح کے ساتھ ساتھ تَوَاصِیْ بِالْحَقِّ اور تَوَاصِیْ بِالصَّبْرِ کی ایک دوسرے کو تلقین کرو جہاں بیٹھو نیک بات کہو، خدا ترسی کی بات کہو، دین کی طرف دعوت دو، فرائض کی پابندی کی طرف دعوت دو، منہیات و محرمات سے بچنے کی دعوت دو، اور جب حق کی دعوت دو گے، یہ قرآن ہی کا اعجاز ہے کہ اس نے کہا کہ "وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" پھر جب حق کی دعوت دو گے تو مخالفت ضرور ہو گی، قربانی دینی پڑیگی، نقصانات سامنے آئیں گے، اب صبر کی ضرورت ہو گی، اس لئے تواصی بالحق بھی کافی نہیں کہ ایک دوسرے کو میٹھی میٹھی تلقین کر لو، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ صبر کی بھی تلقین کی ضرورت ہے کہ بھائی یہ ایسا آسان راستہ نہیں ہے جب تم صحیح راستے پر چلو گے تب مخالفین ہوں گے، نقصانات کا اندیشہ ہو گا۔ اس وقت صبر کی ضرورت ہے، یہ کیوں ہو رہا ہے؟ اس لئے کہ دستور العمل ہے زندگی کا، مکمل متواتر ہر جز دوسرے کو سہارا دیتا ہے، ہر جز دوسرے کو مضبوط کرتا ہے، ہر جز دوسرے کے لئے ضروری ہے، ایمان کے بغیر کوئی عمل معتبر نہیں۔

عبد و معبود کا صحیح تعلق

اصل چیز ہے عبد و معبود کا تعلق صحیح تعلق، اس تعلق کی تصحیح کہ وہ خدا ہے جو دنیا کو بنانے والا، چلانے والا "له الخلق والأمر" بنایا بھی اسی نے اور چلا بھی رہا ہے وہ، وہ ایسا نہیں کہ ریٹائرڈ ہو گیا ہو، جیسا کہ بہت سے مذاہب میں ہے کہ خالق کا یقین ہے، وہ الوہیت کو مانتے ہیں، لیکن وہ چلا بھی رہا ہے، اب بھی اس سے واسطہ ہے، اس کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا ہے، اس کو نہیں مانتے، خود مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ہے، جو کوئی عملی تعلق خدا سے نہیں رکھتا، اس کا ایک تاریخی تعلق ہے اس دنیا کے بارے میں کہ کبھی اللہ نے اس دنیا کو بنایا تھا، اس کائنات کی تکوین کی تھی، بس پھر آزاد ہے، بقیہ فلاں شعبہ فلاں کے پاس اور فلاں شعبہ فلاں کے پاس ہے، نفع و ضرر دوسروں کے پاس ہے، یہ ہے بات۔

پہلے تو عقیدے کی تصحیح، تمام نبوتیں اور تمام انبیاء کرام، تمام آسمانی صحیفے اور وہ دعوت جو صحیح منہاج پر ہوگی، جو دین کی صحیح روح کے ساتھ ہوگی، وہ پہلے عقیدے کی تصحیح پر اقرار کرے گی، اس میں مروت نہیں۔...... CHARCTER تو بہت اچھا (CONDUCT) تو بہت صحیح ہے، ہمارا طرز عمل تو بہت ٹھیک ہے، ہم کوئی برا کام نہیں کرتے، تو پھر کیوں جہنم میں جائیں گے، پھر ہم کیوں گمراہ ہیں؟

پہلی چیز، سب سے پہلا مطالبہ جس چیز کا ہے، وہ یہ کہ بندہ اپنے کو بندہ سمجھے، خدا کو اس کائنات کا خالق، مالک، اور حاکم سمجھے، پھر اس کے بعد "عملوا

الصالحات" اوراس کا معیار وہی ہے جو شریعت مقرر کرتی ہے، یہ عمل صالح ہے، یہ عمل صالح نہیں، اس کا فیصلہ ہم یا آپ، یا قانون ساز، یا ذہین لوگ، یا قانون داں نہیں کر سکتے، بلکہ جس کو دین کہے، نبوت کہے کہ یہ عمل صالح ہے، تو وہ عمل صالح ہے، جس کو وہ کہے کہ یہ عمل صالح نہیں ہے تو بس۔(۱)

(۱) ماخوذ از تعمیر حیات ۱۰ر مئی ۱۹۸۴ء (جلد ۲۱، شمارہ ۱۳)

نعمت اسلام کی قدر کرو

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعاً وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَاناً وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَاحُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ.

(سورہ آل عمران۔ ۱۰۳)

اور سب مل کر خدا کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہونا اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہوگئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے، تو خدا نے تم کو اس سے بچالیا اس طرح خدا تم کو اپنی آیتیں کھول کھول کر سناتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

آیت کریمہ میں عظیم نعمت کا ذکر

یہ آیت کریمہ ہر وقت ہماری نگاہوں کے سامنے اور ہمارے دلوں پہ نقش رہنی چاہئے، اس آیت میں اس عظیم نعمت کا ذکر ہے، جس سے اللہ تعالیٰ نے امت اسلامیہ کو سرفراز فرمایا ہے۔

ہم سب جاہلیت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے، نہ توحید و نبوت سے واقف تھے، نہ حشر و نشر کی خبر تھی، اخلاقی قدروں سے یکسر نا آشنا، اور صحیح مذہبی تعلیمات

سے قطعاً بے بہرہ تھے، اوہام و خرافات میں گرفتار تھے، مظالم و جابر حکومتوں کے جور و استبداد کا شکار تھے، انسانیت ہر طرف پامال ہو رہی تھی۔

ایک طرف مطلق العنان حکمراں، دوسری طرف علم و مذہب کے اجارہ دار علماء معبود بنے بیٹھے تھے، عوام ان کی پرستش، اور اندھی اطاعت پر مجبور تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

اتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ. (التوبہ۔۳۱) انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو (باعتبار طاعت کے) رب بنا رکھا ہے۔

اسلام آیا، اور اس کی ضیا پاشیوں نے روئے زمین کے گوشہ گوشہ کو منور کیا، اسلام کی نعمت ساری انسانیت کے لئے عام تھی، وہ اس بارش کی طرح تھی، جو سپید و سیاہ اور بندۂ و آقا کے درمیان امتیاز نہیں کرتی، وہ تو بادل تھا، جو پست و بلند، گلشن و صحراء سب کو سیراب کر گیا، اور حق تو یہ تھا، کہ اسے عربی شاعر کے اس قول سے مخاطب کیا جائے ؎

فاذهب كما ذهبت غوادى مذنة
أثنى عليها السهل والأوغار

ایک فارسی شاعر کا قول ہے، جو زیادہ بلیغ ہے ؎

پر تو مہر بویرانہ و آباد یکیست
حسن چون تیغ کشدہ بندہ و آزاد یکیست

اس نعمت سے عظیم تر کوئی نعمت نہیں، یہاں تک کہ زندگی بھی جو ہزار لذت و سرور کا سرچشمہ ہے، اگر اسلام توحید خالص، اور ایمان کی نعمت نہ ہوتی، تو یہ زندگی ایک عذاب مسلسل ہوتی، اور اس کی حیثیت جہنم تک پہونچنے کے لئے ایک پل سے زیادہ

نہ ہوتی۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نعمت سے ہمیں نوازا، اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے، اور اس نعمت کے حصول میں ہم پر نبی ﷺ کی ذات گرامی، اور آپ کی بعثت ورسالت اور دعوت وجہاد کا ناقابل فراموش احسان ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے

وَاذْكُرُوْ نِعْمَتَ اللهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَآءً ....

اللہ تعالیٰ کے احسان کو یاد کرو کہ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، "فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ" اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل ملا دیئے "فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا" تم اللہ تعالیٰ کے احسان وفضل سے بھائی بھائی بن گئے، بتاؤ کہاں اس طرح بڑا اور چھوٹا، امیر غریب صدر اور عام شہری کاندھے سے کاندھا ملا کر بیٹھتا ہے، ہے کوئی جگہ دنیا میں ایسی کہ جہاں محمود وایاز کی تفریق نہ ہو؟ جب مسجد میں گئے سب ایک ہوگئے، تو "فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا".

آج تاریخ میں ان جھگڑوں کا پورا ریکارڈ نہیں ہے، جو جھگڑے پہلے دنیا میں پائے جاتے تھے، نسل کے جھگڑے، رنگ کے جھگڑے، بڑے چھوٹے کے جھگڑے، طبقات کے جھگڑے، امیر وغریب کے جھگڑے، زمیندار اور کسان کے جھگڑے، زبانوں کے جھگڑے، تمدنوں کے جھگڑے، یہ سارے جھگڑے دنیا میں تھے، اور ایک دوسرے کا خون بہایا جارہا تھا "فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا."

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَكُنتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا" تم جہنم کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو صاف بچالیا، یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے، اگر یہ دین نہ آتا، اگر اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو مبعوث نہ فرماتا، اگر خدا کے آخری نبی ﷺ نہ آتے تو ہمارے جہنم کے گڑھے میں پھاند پڑنے، کود پڑنے، جست لگانے میں کوئی کسر باقی نہیں تھی۔

آج آپ دیکھئے دنیا میں کیسے بڑے بڑے فلاسفر، بڑے بڑے دانشور، کیسے بڑے بڑے اسکالرس، حکومتوں کے کیسے کیسے سربراہ، اسلام کی جیسی عام فہم (COMMON SENSE) سمجھ میں آنے والی چیز کے سمجھنے سے محروم ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم کو اور آپ کو اسلام کی دولت نصیب فرمائی، اس اسلام کے مقابلے میں کسی متوازی (PARALLEL) چیز کے فلسفہ، کسی تحریک، قومیت کے کسی نعرہ، کسی عصبیت کی دعوت کا اثر نہیں پڑنا چاہئے، بخاری شریف کی حدیث ہے "ثلاث من جمعهن فقد استكمل الإيمان" تین باتیں ہیں، اگر کسی شخص نے ان کو جمع کرلیا تو اس کا ایمان مکمل ہو گیا، "ان یکون الله ورسوله احب إليه مماسواهما" ایک یہ کہ اللہ اور رسول ﷺ اس کے نزدیک ماسوی اللہ سے زیادہ محبوب ہوں، اللہ ورسول کے علاوہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں، سب سے زیادہ اللہ رسول محبوب ہوں، اور ایک یہ کہ "وإن يكره أن يعوده إلى الكفر كما يكره أن يقذف في النار" اس خیال سے کہ وہ کفر کی طرف واپس جاسکتا ہے اس کو ایسی تکلیف محسوس ہو، ایسی وحشت محسوس ہو جیسے کسی کو آگ میں پھینک دیئے جانے سے محسوس ہوتی ہے، بالکل طبعی وجسمانی (PHYSICAL) طریقہ پر، وہ اگر خواب میں دیکھ لے کہ وہ کوئی کفر کا کام

کررہاہے،اسلام کو نقصان پہونچانے والا کوئی کام کررہاہے،وہ کسی سازش کا شکار ہوگیاہے،وہ اللہ ورسولؐ کے خلاف کسی اور جھنڈے کے نیچے جارہاہے تو اس کی چیخ نکل جائے ،سارے گھر کے لوگ جمع ہو جائیں اور کہیں خیریت ہے؟خیریت ہے؟آپ نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا؟ تو وہ کہے کہ ڈراؤنا خواب،ڈراؤنا خواب؟کیا چیز ہے؟میں نے ایسابراخواب دیکھا کہ اللہ پھر کبھی نہ دکھائے، میں نے دیکھا کہ میرے گھر میں کفر کی پرچھائیں آرہی ہیں،کفر کا سایہ آرہاہے۔

دنیا کی سب سے بڑی نعمت

ہم کو............اس کا احساس ہونا چاہئے کہ اللہ نے ہم کو کیا دولت عطا فرمائی ہے، کلمہ نصیب ہونا،اللہ اوراس کے رسولؐ پر صحیح طور پرایمان اور توحید کی دولت کا نصیب ہونا،یہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے، ہفت اقلیم کی سلطنت کلمۂ شہادت پر قربان کردینے کے قابل ہے، ایمان کی قیمت یہ ہے کہ اگر ساری دنیا کی سلطنت ایک طرف رکھی جائے،اور مسلمان سے کہا جائے کہ یہ سلطنت تم کو مل سکتی ہے، لیکن ایمان سے محروم ہونا پڑے گا، تواس کی چیخ نکل جائے،وہ یک لخت بے ہوش ہو جائے کہ مجھ سے کیا گناہ ہوا تھا، کہ یہ کہا جارہاہے کہ تم کو سلطنت دی جائے گی،ایمان لیا جائے گا۔

اس لئے کہ ہر طرف ناکہ بندی ہے،ساری راہیں مسدود،اور سارے دریچے بند ہیں صرف اسلام کا راستہ ہے،اور صرف ایک دریچہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے ذریعے کھول رکھاہے،ارشاد ہے:۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامِ. (آل عمران:۱۹)

بلاشبہ دین (حق اور مقبول) اللہ تعالٰی کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔

امت اسلامیہ کے اندر جب تک اس حقیقت کا عرفان رہے گا اور جب تک اس اصول کو وہ مضبوطی سے تھامے رہے گی بے راہ نہیں ہو سکتی، اور نہ مصائب و مشکلات کا شکار ہو سکتی ہے۔(۱)

---

(۱) مشترک اخذ و تلخیص از ۱۔ تحفہ مشرق، ص ۴۴ تا ۴۸

۲۔ دریائے کابل سے دریائے یرموک تک، ص ۱۱۷ تا ۱۲۲

اجتماعی ذہن اور قربانی وایثار کا جذبہ

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. (اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو)

(البقرہ:)

مسلمانوں کا ذہن اجتماعی ہونا چاہیے

اپنے ذہن کو اجتماعی بنائیے، صرف اپنے مفاد کو سوچنا کہ ہمیں فائدہ ہو جائے دین پر کچھ گزر جائے، ملت پر جو کچھ گزر جائے ہم سب کی فکر کیا کر سکتے ہیں، اس ذہن نے بڑا نقصان پہنچایا ہے، دیکھئے تو قرآن شریف میں آتا ہے "وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ." اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو۔ اس کو بہت سے لوگ ایسے پڑھ لیتے ہیں جیسے "وَلَا تَقْرَبُوْا الصَّلٰوةَ" نماز کے قریب نہ جاؤ۔ بعض بے حیا، ناخدا ترس لوگ اس طرح پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں صاحب! قرآن شریف میں تو ہے کہ نماز کے قریب نہ جانا۔ "لَا تَقْرَبُوْا الصَّلٰوةَ".

اس طرح بدنیتی کے ساتھ تو نہیں لیکن بعض ناواقفیت کی وجہ سے سمجھتے ہیں کہ ان کو ہر خطرہ کے کام سے بچایا گیا ہے۔ ان کو جہاں کہئے ذرا تبلیغ میں چلئے، کچھ خطرہ

مول لیجئے، اپنی تجارت کے لئے کہتے، ہیں وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ. قرآن شریف میں ہے اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو۔ کوئی ایسا کام نہ کرو۔ جان بوجھ کر جس میں تمھیں نقصان پہنچے۔ حالانکہ اس آیت سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ بلکہ اس آیت کا تقاضا بالکل اس کے بر خلاف ہے۔

چنانچہ سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک موقع پر ایسا ہی سنا تھا۔ فرمایا ٹھہرو ٹھہرو تم نہیں جانتے یہ آیت تو ہم انصاریوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی، اس کی تفسیر تو ہم سے پوچھو، تم کیا جانو، قصہ یہ ہے کہ جب اسلام مدینہ میں آیا کمزور تھا، کوئی اس کا ساتھ دینے والا نہ تھا تو ہم انصاریوں نے اس کا ساتھ دیا اور اپنی جان ومال کے ساتھ دیا اور اپنے تقاضوں سے آنکھیں بند کر لیں، بس ہر وقت اسلام کے لئے جان ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے، میدان جنگ میں کہا جائے تو وہاں تبلیغ کے میدان میں کہا جائے تو وہاں اور مال خرچ کرنے کو کہا جائے تو ہم حاضر، غرض کہ ہم نے پھر مڑ کر نہ دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے کھیتوں اور ہمارے باغوں کا کیا حال ہے۔ ہماری دوکانوں کا کیا حال ہے، کچھ عرصہ گزرنے کے بعد جب ہم نے دیکھا کہ اب اللہ کے فضل سے مسلمانوں کی تعداد خاصی ہو گئی ہے اور اب اسلام ایسا گھرا ہوا اور میدان میں نہتا اور بے یار و مددگار نہیں ہے اور دوسری طرف ہم نے دیکھا کہ ہمارے مالوں پر، ہماری جائیدادوں پر بہت اثر پڑ گیا ہے اور تجارتیں ماند پڑ گئی ہیں، کساد بازاری میں ہم مبتلا ہو گئے ہیں، دوکانوں کے دیوالیے نکلنے لگے ہیں، اور باغات خشک ہونے لگے ہیں، فرصت ہی نہیں ہم کو، تو ہم نے کہا اب ہم تھوڑے دن کی چھٹی لیں، مستقل آزادی یا مستقل چھٹی نہیں، بلکہ تھوڑے دن کی چھٹی لے لیں، سپاہی کو چھٹی ملتی

ہے، طالب علم کو چھٹی ملتی ہے، استاد کو چھٹی ملتی ہے، ہم بھی چھٹی لیں گے۔ بس یہ خیال آنا تھا کہ یہ آیت نازل ہوئی ابھی شاید کہنے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ آیت نازل ہوئی، ارے کیا کرتے ہو؟ اس وقت جب دین کو تمہاری مدد کی، تمہاری خدمت کی اور تمہاری جاں نثاریوں کی ضرورت ہے تم چھٹی کا نام لیتے ہو، یہ چھٹی سمِ قاتل ہے، یہ چھٹی خود کشی کے مرادف ہے فرمایا گیا۔ "وَاَنْفِقُوا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَاتُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ." یہ پوری آیت ہے۔ اب لوگوں نے فتووں تک میں لکھنا شروع کر دیا۔

ملت کے تقاضوں کو دیکھنا چاہئے

حج ایک زمانہ میں ہندوستان میں مشکل ہو گیا تھا، دریائی سفر، بادبانی کشتیاں اور بدوؤں کی لوٹ مار دیکھ کر بعض علماء نے فتویٰ دیدیا کہ حج ہندوستانی مسلمانوں کے ذمہ سے ساقط ہے۔ اور استدلال کیا اس آیت سے کہ "وَلَاتُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ" جان بوجھ کر ہلاکت میں نہیں پڑنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اور درجے بلند فرمائے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اور ان کے شاگردوں اور ان کے خلفاء کے کہ انھوں نے اس کے خلاف مہم شروع کی اور فتویٰ لکھا اور پھر ان کے بعض خلفاء نے، ان کے بھتیجے اور عزیزوں نے ایسی دھوم دھام سے حج کیا کہ پھر یہ خیال ہی لوگوں کے دلوں سے نکل گیا، ورنہ خدانخواستہ ہندوستان میں اس کی عادت پڑ جاتی کہ بھائی سمندر کا سفر خطرناک ہے اور حج ہمارے ذمے سے ساقط ہے تو آج حج اور کل زکوۃ اور پرسوں روزہ، صلوٰۃ پر برا اثر ڈالتا ہے۔ وَلَاتُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی

التَّهْلُكَةِ اور پھراس کے بعد نماز کہ اس سردی میں ٹھٹھر جائیں اور ٹھنڈے پانی سے وضو کریں یااس گرمی میں چھوٹی سی رات میں ہم نکلیں اور رات خراب کریں وَلَاتُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ تو سارادین ہی معطل ہو کے رہ جائے۔ تو مسلمانوں کاذہن انفرادی ہے اجتماعی ہوناچاہئے۔ یعنی ملت کے تقاضوں کو دیکھناچاہئے کہ اگر ہر شخص صرف اپنے اپنے تقاضوں کو دیکھنے لگے تو دین کی خدمت کہاں سے ہو گی۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ دین کا تقاضا ہے ہم یہ کہتے ہیں اپنے اپنے علاقہ کی خبر لیجئے، اپنی اپنی جگہ کی مسجدوں کی خبر لیجئے، مدرسوں کی خبر لیجئے، اپنی اپنی جگہ کی دینی تعلیم کی خبر لیجئے، اپنی اپنی جگہ کے مسلمانوں کی عادتوں اوران کے برے اخلاق کی خبر لیجئے، جن کی وجہ سے رحمت الٰہی رکی کھڑی ہے، گھنگھور گھٹا تلی کھڑی ہے۔ لیکن برستی نہیں کہ مسلمانوں میں تو یہ یہ عیب ہیں، مسلمانوں میں تو یہ جرائم ہیں، ان ان چیزوں کے مرتکب ہورہے ہیں، ان چیزوں کی خبر لیجئے...... یہ دین کا اجتماعی تقاضا اگر آپ پر طاری نہ ہوا تو ہندوستان جیسے ملک میں دین کا باقی رہنا مشکل ہے۔

خطرناک ذہنیت

اگر اجتماعی ذہن نہ ہو تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا، کسی کو کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے، سب اپنے اپنے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ ہماری اولاد پڑھ جائے اور جلدی سے کام سے لگ جائے اور جلدی سے بڑی آسامی اس کو مل جائے اس کے علاوہ کسی چیز سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ یہ بہت خطرناک ذہنیت ہے، اس ذہنیت نے قوموں کے

چراغ گل کردیئے ہیں، جہاں یہ ذہنیت طاری ہوئی وہاں کوئی سر پٹک کر رہ جائے، کوئی بڑے سے بڑا مصلح اپنی پوری زندگی صرف کردے کوئی اثر نہیں ہوتا، یہ ذہنیت ہمارے ملک میں پیدا ہو رہی ہے اور موجود ہے کسی کو کسی سے کوئی مطلب نہیں رہا، بس اپنا مفاد دیکھنا، اپنی خوشحالی کی، اپنے گھر کی، کاروبار کی، ترقی اور کامیابی کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہیں، ساری دقت اس وجہ سے پیش آرہی ہے کہ ذہن اجتماعی اور ملی نہیں ہے بلکہ ذہن انفرادی ہے، ذہن بالکل شخصی ہے......

ایک تو اس کی اصلاح ہونی چاہئے کہ ملت کے مسائل اور دین کے تقاضوں کا درد آپ اپنے دل میں پیدا کریں، اگر یہ نہیں ہے تو پھر بہت بڑا خطرہ ہے، نہ کوئی انجمن کچھ کر سکتی ہے، نہ کوئی ادارہ کچھ کر سکتا ہے اور نہ کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ مصنف اور واعظ اور مقرر کچھ کر سکتا ہے۔ خدا کرے آپ اتنی بات سے آگے کی بات سمجھ گئے ہوں۔

(ماخوذ از روداد چمن)

باب ۸

فرائض وذمہ داریاں

ہم، آپ، سب قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہیں اور قرآن مجید کو خدا کا معجزہ، رسول اللہ ﷺ کا معجزہ اور اللہ کا کلام سمجھتے ہیں۔ لیکن سب یہ حقیقت نہیں جانتے (اور اس حقیقت کے نہ جاننے سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا اس سے کہ علم کے درجے ہوتے ہیں) کہ قرآن مجید مجموعی اور کلی حیثیت سے بھی معجزہ ہے اور جزوی حیثیت سے بھی معجزہ ہے۔ یعنی اس کی ایک ایک آیت معجزہ ہے، ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید معجزہ ہے لیکن بہت کم لوگوں کی اس پر نظر ہے کہ قرآن مجید کی ہر آیت مستقل ایک معجزہ ہے اور اس کا اعجاز مختلف زمانوں میں اور مختلف حالات میں اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ آفتاب کی مثال دینا بھی بے ادبی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی خصوصیت ہے کہ ایک مرتبہ نہیں سو مرتبہ نہیں، ہزاروں مرتبہ پڑھا جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید آج ہی نازل ہوا ہے۔

اور یہ بات حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پیش آئی کہ آنحضور ﷺ کی وفات ہوئی تو لوگوں میں ایک مایوسی (دوڑ گئی اور لوگوں کے قدم اکھڑے نہیں لیکن ہل گئے کہ اب کیا ہوگا اور اچھے اچھے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس دین کا مستقبل کیا ہے، یہ دین باقی رہے گا یا نہیں۔ لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ نے یہ آیت صحابہ کرامؓ کے سامنے پڑھی کہ وہ کہتے تھے کہ کوئی یہ نہ کہے کہ حضور ﷺ کی وفات ہوگئی اور وہ یقین نہیں کرتے تھے کہ سارے دنیا کے مسلمان ہوئے بغیر کیسے رسول ﷺ دنیا سے تشریف لے جا سکتے ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جب یہ آیت پڑھی "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا. تو اچھے اور ممتاز صحابی کہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ آیت آج ہی نازل ہوئی ہے، یہ اسی موقعہ کیلئے تھی۔"

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی

امتِ مسلمہ کا فرضِ منصبی

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ.

(سورہ الانفال: ۷۳)

وزن واعتبار کے دو پیمانے

میں قرآن مجید کا ایک حقیر طالب علم ہوں اور آپ سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید روزانہ پڑھا جاتا ہے اور حسب توفیق بار بار اور زیادہ سے زیادہ پڑھا جاتا ہے، قاعدہ یہ ہے کہ جب آدمی کسی چیز کو حیرت سے دیکھتا ہے اور اس سے متعجب ہوتا ہے تو اس کا یہ تعجب ہمیشہ قائم نہیں رہتا، وہ زائل بھی ہو جاتا ہے لیکن میں اپنا حال آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں (اور اسی سے میں نے اپنی بات کہنے کا مضمون اخذ کیا ہے)

دنیا میں وزن واعتبار کے دو پیمانے ہیں، ایک قامت، دوسرے قیمت، لیکن اللہ تعالیٰ نے قامت پر قیمت کو ترجیح عطا فرمائی ہے۔ میں جب بھی سورہ انفال کی آخری یہ آیت:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ. اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ. (سورہ الانفال: ۷۳)

اور جو لوگ کافر ہیں وہ باہم ایک دوسرے کے وارث ہیں اگر یہ نہ کروگے تو زمین میں (بڑا) فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔

پڑھتا ہوں تو دریائے حیرت میں غرق ہو جاتا ہوں کہ یہ بات آخر کس سے کہی جا رہی ہے؟ اس مٹھی بھر انسانی گروہ سے، اس چھوٹی سی جماعت کی تشکیل کچھ انصار سے (جو اپنے وطن میں تھے) اور کچھ مہاجرین سے (جو مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے آئے ہوئے تھے) ہوئی تھی اور جن کی بڑی سے بڑی تعداد شمار کرنے کے بعد ڈیڑھ ہزار سے زیادہ نہیں نکلی۔

خدا تعالیٰ ان کو اخوت و بھائی چارہ کی دعوت دے رہا ہے، مہاجرین کا انصار سے اور انصار کا مہاجرین سے ربط پیدا فرما رہا ہے، اور سچی اخوت کی روح ان میں بیدار فرما کر یہ حکم دے رہا ہے کہ وہ ایک نئی اکائی بن جائیں، ایک ایسی اکائی جس کی بنیاد ایمان ویقین، کلمۂ لا الٰہ إلا اللہ کے اتحاد، انسانیت کے لئے ہمدردی ودل سوزی، اصول وعقائد پر پختگی پر قائم ہو۔

خدا تعالیٰ اس مختصر جماعت سے ارشاد فرما رہا ہے، کہ اگر تم نے اس کام میں کوتاہی کی، اس اخوت کے قیام میں تساہلی سے کام لیا، اور اس نئی اکائی کی تشکیل میں جس سے دنیا ناواقف ہے، اور تاریخ نے جس کو سیکڑوں سال سے بھلا دیا ہے، غفلت دکھائی، اگر تم نے اس اخوت میں کمزوری کا مظاہرہ کیا جو ایک عظیم وبلند پیغام سے مربوط ہے، اور اس اتحاد کو ناپائیدار بنایا جو سچی اور مخلصانہ اخوت پر قائم ہے، اگر تم نے ایسا کیا تو روئے زمین پر فتنہ بپا ہو جائے گا اور زبردست فساد مچے گا۔

ذرا سوچئے کہ اس مختصر سی تعداد کی جو یثرب میں رہتی تھی (جس کو بعد میں مدینۃ الرسول ﷺ کے نام سے یاد کیا گیا) کیا حقیقت تھی؟ اس کی افرادی قوت کتنی تھی؟ سیاسی میزان میں اس کا کیا وزن تھا؟ بین الاقوامی اسٹیج پر اس کی کیا حیثیت تھی؟ سماجی، اقتصادی حتیٰ کہ علمی دنیا میں وہ کتنا وزن رکھتی تھی، تین مرتبہ ان کی مردم شماری کی گئی (جیسا کہ بخاری شریف میں اس کا تذکرہ آتا ہے) آخری بار مردم شماری میں ان کی تعداد ایک ہزار پانچ سو نکلی۔(۱)

امت اسلامیہ بقامت کہتر بقیمت بہتر

ذرا غور فرمائیے کہ یہ بات کس سے کہی جارہی ہے؟ کیا ان رومیوں سے کہی جارہی ہے جو آدھی دنیا کے مالک تھے۔ اور سب سے بڑی حکومت اور اس کے سایہ میں پروان چڑھنے والی تہذیب اور تمدن اور سب سے بڑی جنگی، بین الاقوامی اور سیاسی قوت کے مالک تھے؟

کیا یہ ان ایرانیوں سے کہا جارہا تھا جنہوں نے رومن امپائر کے ساتھ آباد دُنیا کو مشترک طور پر تقسیم کر کے اس پر قبضہ جمار کھا تھا؟

یقیناً یہ رومی اور ایرانی ظاہری طور پر اس وقت انسانیت کی قسمت کے مالک بنے

---

(۱) صحیح بخاری، جلد ۱، صفحہ ۴۳۳ باب کتابۃ الامام الناس کتاب الجہاد، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ انفال غزوۂ بدر کے زمانے میں نازل ہوئی، اس وقت مسلمانوں کی تعداد اس سے بھی کم رہی ہوگی جو اس آخری مسلم شماری کے نتیجہ میں نکلی۔

بیٹھے تھے، زندگی کی کشتی وہی چلا رہے تھے، تہذیب و تمدن کی باگ ڈور انھیں کی ہاتھ میں تھی، وسائل، ذرائع اور اسباب معیشت اور دنیا کے حالات پر (اگر یہ کہنا غلط نہ ہو) انھیں مکمل تصرف حاصل تھا۔

کیا ان سے کہا جارہا ہے؟

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ. اگر یہ نہ کروگے تو زمین میں (بڑا) فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔

ذرا اندازہ لگایئے اس لفظ "فتنة في الارض" کی ہیبت کا، اس کے حجم کا، اس کے وزن اور وسعت کا، آیت میں صرف فساد نہیں کہا گیا، بلکہ "فساد کبیر" کہا گیا۔ یہ بات اس چھوٹی سی محدود جماعت سے کہی جارہی ہے جن پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی اور جن کے کاندھوں پر اسلام کے پیغام کا بوجھ رکھا گیا، اس چھوٹی سی افرادی قوت سے کہا جارہا ہے کہ اگر تم نے اسلامی و ایمانی اور انسانی اور عادلانہ اخوت قائم کرنے میں کوتاہی دکھائی اور اگر تم نے آپس میں اتحاد کے قیام میں غفلت کا مظاہرہ کیا اور اس اتحاد کو، ایمان، اخلاص، ایثار و قربانی اور فنائیت پر قائم نہیں کیا تو زمین میں فتنہ بپا ہو جائے گا اور زبردست فساد پھیل جائے گا۔

امت مسلمہ کا اس وقت کیا وزن تھا، جب وہ صرف سیکڑوں کی تعداد میں تھی، ہزاروں کی تعداد میں تھی، اس وقت ان سے یہ کہا جارہا ہے ان کو یہ وزن دیا جارہا ہے اور یہ قیمت اور دنیا کے نقشہ میں یہ حیثیت عطا کی جارہی ہے!

اس اعلان سے یہ صاف طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ امت مسلمہ کی حیثیت اور وزن "قدر و قیمت" ہے نہ کہ "قد و قامت" اس کی حیثیت اور اس کا مقام اپنے ایمان،

عقائد، مکارم اخلاق، بیدار ضمیر اور جسم میں سرایت کئے ہوئے شعور و وجدان اور عقل و تدبر پر اثر ڈالنے والی اس بیتاب و بے چین روح سے ہے جو اس کو عطا کی گئی۔

امت اسلامیہ کی قیمت و اہمیت ان خصوصیات و صفات کی بنیاد پر ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے اس کو نوازا ہے اس کے ہاں تعداد اور ساز و سامان کی کثرت کا اعتبار نہیں اور نہ اس کی مکانی مسافت کے طول و عرض کا جس پر اس کی حکومت کا سکہ چلتا ہے اور نہ اس زمانی مسافت کے طول و امتداد کا جس پر اس نے اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔

میں مسلمانوں کی اس جماعت کو خواہ وہ کتنی ہی کم تعداد میں ہو، اس پیمانہ سے ناپتا ہوں، میں اس کو اسلام کی اس خوردبین سے دیکھتا ہوں جو خدا کی عطا کردہ ہے۔

(کاروان زندگی حصہ سوم صفحہ ۹۹ تا ۱۰۳)

اہلِ فکر وقائدین کا مقام اور ذمہ داری

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوْا اللهَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ.
(سورہ آل عمران:۲۰۰)

اے ایمان والو صبر کرو، ایک دوسرے کو صبر کی ترغیب دو اور مورچوں پر جمے رہو اور ہر حال میں خدا سے ڈرتے رہو تاکہ (اپنے مقصد میں) کامیاب ہو۔

اس آیت میں "اصبروا" کے ساتھ "صابروا" کی ہدایت و تلقین کی حکمت اور اس کا راز بڑا غور طلب ہے، اقوام و ملل کی زندگی اور قوموں کے عروج و زوال کے مسئلہ میں صرف انفرادی صبر و استقامت کافی نہیں ہوتی، اجتماعی صبر و استقامت اور ہمت و استقلال کی ایک عام فضا اور ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہر فرد دوسرے فرد کے لئے باعث تقویت، اس کا پشت پناہ، اپنی جگہ پر صابر و مستقیم اور دوسروں کے لئے صبر و استقامت کا داعی و مبلغ ہو، اس کی زندگی، اس کا ایمان و یقین، اس کا صبر و توکل اس کا عزم و حوصلہ، اس کا بلند کردار، دوسروں میں اعتماد پیدا کرنے کا ذریعہ اور ان کے لئے مشعل راہ ہو اس کو دیکھ کر اکھڑتے ہوئے قدم جم جائیں، افسردہ طبیعتیں اور پست ہمتیں بلند و مستحکم ہو جائیں، اس فضا میں بے ہمتی اور بے صبری کی بات کہنا اور کرنا ایسا ہی مشکل ہو جائے اور معیوب سمجھا جائے جیسے

تردد و تذبذب کے ماحول اور خوف وہراس کے عالم میں صبر وہمت کی تلقین اور ثبات واستقامت کی ہدایت۔

حفاظت دین وملت کا مورچہ

پھر فرمایا "وَرَابِطُوْا" (اور مورچوں پر جمے رہو) اس موقع پر یاد رکھنا چاہئے کہ مورچے دو طرح کے ہوتے ہیں ایک فوجی اور زمینی مورچہ، دوسرے معنوی مورچہ، فوجی وزمینی مورچہ بھی بہت اہم ہے اور زندہ وغیور قومیں اس پر گھٹنے ٹیک دیتی ہیں اور اس کی حفاظت میں جان کی بازی لگادیتی ہیں، مگر یہ مورچہ زندگی میں فیصلہ کن حیثیت نہیں رکھتا، قوموں کی زندگی میں میدان جنگ کی شکست یا کسی مورچے سے پسپائی ان کی قسمت پر مہر نہیں لگادیتی، دنیا میں قومیں شکست بھی کھاتی رہی ہیں اور فتح بھی حاصل کرتی رہی ہیں، اپنے مورچوں سے ہٹتی بھی رہی ہیں اور ان کو واپس بھی لیتی رہی ہیں، عہد نبویؐ، دورِ صحابہؓ اور تاریخ اسلام کے ہر عہد میں یہ نشیب وفراز اور یہ سرد وگرم پیش آتے رہے ہیں اور جو قوم اس نشیب وفراز سے نہیں گزرتی اور شکست کی تلخی سے اس کے کام ودہن کبھی آشنا نہیں ہوتے، وہ صرف فتح کی لذت وحلاوت سے آشنا ہوتی ہے، اس قوم کی صلاحیت پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا، اس لئے قوموں کی تربیت کے لئے یہ دونوں تجربے ضروری ہیں اور خدا نے اپنے محبوب پیغمبر اور اس کے برگزیدہ اصحاب کو ان دونوں راستوں سے گزارا ہے۔

لیکن معنوی مورچوں کا معاملہ ان سے بالکل مختلف ہے۔ کسی معنوی مورچہ پر

شکست و پسپائی بعض اوقات صدیوں و ہزاروں برس کا فیصلہ کردیتی ہے اور بعض اوقات اس سے کسی قوم وملت کی قسمت پر مہر لگ جاتی ہے، آج ہندوستان کی ملت اسلامیہ کو یہی معنوی مورچہ درپیش ہے، ملت کی جداگانہ شخصیت کا مورچہ، اسلام کی مستقل تہذیب کا مورچہ، اسلام کے عائلی قانون (پرسنل لا) کا مسئلہ، زبان و کلچر کا مسئلہ، آئندہ نسلوں کی تعلیم کا مورچہ، ان مورچوں کی حفاظت "خواص" ہی کر سکتے ہیں، اس کے لئے جس علم، جس فہم، جس احساس، جس دور بینی، اور حقیقت شناسی اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے جن وسائل و ذرائع کی ضرورت ہے، وہ اسی طبقہ کے پاس ہیں، ان کی بروقت فرض شناسی اور مستعدی، ان کی بے چینی اور دردمندی مدتوں کے لیے اس خطرہ کو ٹال سکتی ہے، اور ملت کو اس خطرے سے محفوظ بنا سکتی ہے اور ان کی ذراسی غفلت و سستی ملت کے قافلہ کو سالوں اور صدیوں کے حساب سے منزل سے دور کر سکتی ہے، انھوں نے اگر اپنے ذاتی مقاصد و مفادات کو ملت کے مفاد پر اور اپنی ذات کو پیش آنے والے دور از کار خطرات کو ملت کے حقیقی خطرات پر ترجیح دی تو ان مورچوں پر شکست یقینی ہے۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

(۱) خواص۔ ملت میں ان کا مقام اور ذمہ داریاں، ص ۱۸ تا ۲۰

مسلمانوں کے دو فرائض

گردوپیش کے واقعات سے سبق لینا چاہئے

ہم مسلمانوں کو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جابجا یہ ہدایت فرمائی ہے کہ ہم واقعات وحالات سے فائدہ اٹھایا کریں، اور ان سے صحیح نتیجہ نکالیں، اسباب اور اسباب کے نتائج میں اللہ تعالیٰ نے ایک خاص تعلق پیدا کیا ہے، جیسے دواؤں میں خاصیت ہے، درخت کی پتیوں میں خاصیت ہے، یہاں تک کہ گھاس پھوس میں خاصیت ہے، اعمال، اخلاق، طرز عمل اور زندگی کے طور طریق میں اس سے بھی زیادہ طاقت و خاصیتیں ہیں، اس لئے کہ دوائیں، غذائیں، نباتات، حجریات تو انسان کی زندگی کی حفاظت اور انسان کو امراض کی تکلیف سے بچانے کے لئے پیدا کی گئی ہیں، زندگی تو اصل چیز ہے، جو واقعات ہمارے گردوپیش گزرتے ہیں ان سے ہمیں سبق لینا چاہئے۔ اور قرآن مجید میں اس کی نہ صرف ہدایت کی گئی ہے، بلکہ سبق نہ لینے پر ناراضگی کا اظہار اور اس بے حسی کی مذمت کی گئی ہے۔

سورہ یوسفؑ کے آخر میں آتا ہے:

وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ. (سورہ یوسف: ۱۰۵)

اور آسمان وزمین میں بہت سی نشانیاں ہیں جن پر یہ گذرتے ہیں اور ان سے آنکھیں بند کر کے چلے جاتے ہیں۔

یعنی کتنی نشانیاں ہیں اس زمین و آسمان میں کہ اس کے پاس سے یہ لوگ منہ پھیر کر گذر جاتے ہیں اور اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں، ان سے کوئی سبق نہیں لیتے، اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ میں سورہ یونسؑ میں کہا گیا:

وَمَا تُغْنِي الْآيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ. (سورہ یونسؑ: ۱۰۱)

جو ایمان نہیں رکھتے ان کے لئے نشانیاں اور ڈراوے کچھ کام نہیں آتے۔

ایک جگہ فرمایا گیا:

سَنُرِيْهِمْ آيٰتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِيْ أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ. أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْد. (سورہ حٰم السجدہ: ۵۲)

ہم عنقریب ان کو اطراف عالم میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھلائیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ حق ہے۔

پہلا فرض

مسلمانوں کا پہلا فرض تو یہ ہے کہ وہ جہاں بھی اور جس ملک میں بھی ہوں وہاں وہ اولاً اپنے ہم وطنوں کو اللہ کی اس نعمت (دین حق) میں شریک کرنے کی کوشش کریں جو اللہ نے ان کو عطا کی ہے اور ان کو اس کی فکر رہے، یہ فکر سب سے زیادہ پیغمبروں کو رہا کرتی تھی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بار بار رسول ﷺ کو تسکین دی:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ. اے پیغمبر، شاید تم اس رنج سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اپنے تئیں ہلاک کردو گے۔ (سورہ الشعراء: ۳)

اس کے بعد درجہ بدرجہ جن لوگوں کو ان سے زیادہ مناسبت ہوتی ہے ان کے اندر یہ فکر زیادہ ہوتی ہے، تو پہلا درجہ تو یہ ہے کہ مسلمان جس ملک میں بھی رہیں وہاں ہدایت کو عام کریں اور اللہ تعالیٰ نے ان پر جو احسان فرمایا ہے، ان کو جو ہدایت دی ہے، ان کو جو روشنی عطا فرمائی ہے، اس روشنی کو زیادہ سے زیادہ پھیلائیں، سارا قرآن شریف اس سے بھرا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

دوسرا فرض

دوسرا فرض جو از روئے دین، انسانیت اور عقل سلیم، ہم پر عائد ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اپنا تعارف کرائیں کہ ہم کس دین کے ماننے والے ہیں، کن اصولوں کو ہم تسلیم کرتے ہیں اور ہماری زندگی کن چیزوں کی پابند ہے، اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنے اخلاق سے لوگوں کو مانوس اور قریب کریں، لوگوں کو اس دین کے مطالعے پر آمادہ کریں، جس دین کے ہم پابند ہیں، اس دین کے بارے میں ان میں تجسس (CURIOSITY) پیدا ہو، یہ کس طرح کے لوگ ہیں، یہ کس دین کو مانتے ہیں، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتے، یہ ہر ایک کے خیر خواہ ہیں، دولت ہی کو سب کچھ نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک کچھ اور حقائق ہیں کچھ اور (VALUES) ہیں، کچھ اور (IDEAL) ہیں، یہ کس طرح کے لوگ ہیں، جن کو دولت کی بڑی سے بڑی مقدار خرید نہیں سکتی، ان کو اپنے اصول سے ہٹا نہیں سکتی، ان کو ظلم پر آمادہ نہیں

کر سکتی، کیا ان کے سامنے کوئی اور عالم ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے؟ ذہن پر چوٹ لگانے والی بعض چیزیں ہوتی ہیں جو بعض اوقات آدمی کی زندگی اور خیالات میں انقلاب پیدا کر دیتی ہیں۔(۱)

(۱) تلخیص از فسادات اور ہندوستانی مسلمان، ص ۳ تا ص ۷

ہے حقیقت جسکے دین کی احتسابِ کائنات

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْ بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ
فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ. (سور) ہود:)

”تو جو امتیں تم سے پہلے گزری ہیں ان میں سے ایسے سمجھدار لوگ نہ ہوئے کہ جو ملک میں فساد پھیلانے سے منع کرتے۔ بجز چند آدمیوں کے کہ جن کو ہم نے بچالیا ان میں سے۔“

یہ آیت ایک دور نہیں بلکہ گذشتہ دوروں کی صحیح عکاسی کرتی ہے اور تصویر کشی کرتی ہے۔ اس آیت میں جو تڑپ اور جو ایک خاص تاثیر ہے اور اس میں جو بجلیاں کوند رہی ہیں۔ افسوس ہے کہ کسی دوسری زبان میں اس کا ترجمہ پورے طور پر ممکن نہیں ہے۔

قرآن مجید اس امت کے داعیانہ و قائدانہ مقام، اصلاح کی ذمہ داری اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی مسئولیت کی یاد گذشتہ اقوام کا حوالہ دیتے ہوئے اس کے شعور و احساس کو بیدار کرتے ہوئے یاد دلاتا ہے:

ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس سے پہلے جو نسلیں اور جو دور گذرے ہیں ان میں وہ لوگ ہوتے جن کا ضمیر آخری طور پر مردہ نہیں ہوا تھا اور جن کے دلوں پر انسانیت کی کچھ

چوٹ تھی، انھوں نے کیوں نہیں ہاتھ پاؤں مارے؟ "يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ" وہ لوگ کیوں نہیں کھڑے ہوگئے۔ اس عالمگیر فساد کے مقابلہ میں جس کا لاوا پھوٹ رہا تھا، کیا اتنی بڑی انسانی آبادی میں ایسے چند انسان بھی نہیں تھے جن کے اندر کچھ رہا سہا انسانیت کا درد ہو۔ اور حالات سے صحیح نتیجہ نکالنے کی صلاحیت اور خطرات کو دیکھ کر پیشین گوئی کرنے اور انسانی تہذیب و ثقافت کے بچے کھچے سرمایہ کی حفاظت کا جذبہ باقی ہو، وہ کچھ ہاتھ پاؤں مارتے، کچھ ڈراتے، روتے اور خوشامد کرتے، کچھ لوگوں کا ہاتھ پکڑتے، کچھ میدان میں آجاتے...... یہ سب کچھ اس قرآنی آیت کی سلوٹوں میں کہہ دیا گیا ہے اور جو لوگ عربی زبان سے کچھ ذوق رکھتے ہیں وہ حقیقی لطف لے سکتے ہیں کہ کس انداز سے اس کو کہا گیا ہے۔

قرآن مجید نے "اولو بقية" کا جو لفظ استعمال کیا ہے (عربی زبان سے شدبد ہونے کے باوجود) اس لفظ کا پوری طرح ترجمہ کرنے سے قاصر ہوں، وہ لوگ جن کے اندر ابھی فکر اور احساس کی شمع پورے طور پر بجھی نہیں ہے اور جن کے ضمیر نے ابھی آخری ہچکی نہیں لی ہے۔ جن کے اندر ابھی کچھ حقیقت شناس موجود تھے اور پیغمبروں کی محنتوں کا اثر ابھی باقی تھا اور جنھوں نے قوموں کا انجام دیکھا تھا اور یہ بھی دیکھا تھا کہ اعمال کیا نتیجہ پیدا کرتے ہیں اور اخلاق کا بگاڑ کیا مصیبتیں لاتا ہے اور جب یہ سیلاب آتا ہے تو کس طرح ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور یہ تحقیق نہیں کرتا کہ غریب کا جھونپڑا ہے یا کسی امیر کا ایوان! کسی مجرم کا گھر ہے یا عشرت کدہ یا کسی یتیم و بیوہ کے سر چھپانے کا ٹھکانا ہے، جب سیلاب آتا ہے تو سب کو بہالے جاتا ہے۔ اسی

طرح آگ لگتی تو کوئی تمیز نہیں کرتی اور پھر اس کی لپٹ میں اچھے اچھے لوگ آجاتے ہیں۔ سوادِ اعظم (یعنی آبادی کا بڑا حصہ) جسے کہتے ہیں اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس موقعہ پر معدودے چند آدمی ہوتے ہیں جو اس سیلاب کے مقابلہ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

میں جب بھی یہ آیت پڑھتا ہوں "فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْ بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلاً مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ"...... تو دل پر چوٹ لگتی ہے......

قرآن مجید نے "يَنْهَوْنَ عَنِ التَّرْكِ" نہیں کہا اور نہ "يَنْهَوْنَ عَنِ الْعَصِيَّةِ" بلکہ "يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ چند آدمی ہوتے ہیں جو ہتھیلیوں پر سر رکھ کے آجاتے ہیں، اور زمانہ کی کلائی موڑ دیتے ہیں۔

دعوت و عزیمت کی تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ اخلاقی بگاڑ کو دور کرنے کیلئے ستر اور اسی فیصدی لوگ میدان میں آئے ہیں۔ آپ کسی دور کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ یہ معلوم ہو جائے گا کہ جب فساد پھیل گیا اس وقت اللہ کے کچھ بندے جن کی حیثیت آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہوتی۔ میدان میں آئے ہیں پھر ان کے ساتھ اور لوگ شامل ہو گئے اور کارواں بنتا گیا اور انھوں نے پھر ایک طاقت بنالی اور اپنا ایک مقام پیدا کر لیا۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت تو بہت وسیع و عمیق اور آخری چیز ہے۔ لیکن ان کے جانشین وہی "اولو بقية......" ہیں!

یہ لوگ ہر دور میں فساد کے مقابلہ کے لئے میدان میں آئے ہیں اور جس شکل

میں بھی یہ فساد آیا ہے یہ لوگ اس کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہوگئے ہیں اگر دولت پرستی کا بت ہوتا ہے تو وہ ان کو پاش پاش کرتے ہیں۔ اور اگر نفس پرستی کا بت ہوتا ہے تو اس کو توڑنے کے لئے میدان میں آجاتے ہیں۔(۱)

(۱) از تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ر جون ۱۹۸۰ء

مشترک از تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ر جولائی ۱۹۸۶ء

اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ. (سورہ الحج:۴۱)

"یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔"

یہ الفاظ بڑے جامع، وسیع، معنی خیز اور فکر انگیز ہیں اور تاریخ ان کی حرف بحرف تصدیق کرتی ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ" یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں قابو دیں گے، ان کے قدم کہیں جمائیں گے تو یہ نہیں ہوگا کہ یہ عیش و عشرت کریں گے، یہ تعمیرات میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے، یہ بڑے سے بڑے سرمائے جمع کریں، ان کا تمدن ایک حسین گلدستہ بن جائے گا، ان کے شہروں میں ہن برستا نظر آئے گا، ہر شخص کے سر پر ہما کا پرندہ بیٹھا نظر آئے گا، یہ اعلیٰ سے اعلیٰ سواریوں پر بیٹھے نظر آئیں گے، ان کے دستر خوانوں پر الوانِ نعمت چنے ہوئے

ہوں گے۔ نہیں، بلکہ فتوحات کی تاریخ، کشور کشائی، جنگ آزمائی کی تاریخ اور انسانی حوصلہ اور عزم کے اظہار کی تاریخ کے تجربوں کے برخلاف ان کا یہ حال ہوگا کہ:

"اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوْا الصَّلٰوةَ" اگر ہم ان کو زمین میں "تمکین" واقتدار عطا کریں گے تو نماز کو برپا کریں گے، میں اس کا ترجمہ یہ نہیں کرتا کہ نماز پڑھیں گے، لفظ "صلوٰۃ" نہیں ہے بلکہ "اقاموا الصلوٰۃ" ہے، یعنی نماز کو زندگی کا جزء اور اس کا لازمہ بنادیں گے۔ اس کا انتظام واہتمام کریں، اس کے لئے جس فضا کے تیار کرنے کی ضرورت ہے، جتنے علم کی ضرورت ہے، جن جگہوں کی ضرورت ہے (جن کو مساجد کہتے ہیں) ان سب کا اہتمام کریں گے، "اقاموا الصلوٰۃ" کے لفظ میں یہ سب چیزیں آجاتی ہیں۔

"وَآتوا الزکوٰة" زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے، زکوٰۃ کو عام کریں گے، "وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْ عَنِ الْمُنْكَرِ" اور نیکی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے۔

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ "معروف ومنکر" کے لئے قرآن مجید میں اور حدیث میں "امر و نہی" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ استدعا اور درخواست کے الفاظ استعمال نہیں کئے گئے ہیں۔ عربی زبان ایسی تنگ دامن نہیں ہے کہ اس کے اندر صرف "امر ونھی" کے الفاظ ہوں اور دوسرے الفاظ نہ ہوں، جن میں تواضع ہے، خوشامد ہے، جن میں استدعا ہے، جن میں مطالبہ ہے بلکہ اس کے لئے جہاں کہیں بھی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ "امر ونھی" کے ہیں۔

اس آیت میں بھی بعض دوسری آیتوں کی طرح "امروا" اور "نھوا" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو نصیحت ودعوت، ترغیب وفہمائش کے الفاظ سے مختلف ہیں۔ "امرونھی" (حکم وممانعت) کا منصب ادا کرنے والے کیلئے اس کی کسی قدر طاقت وبالاتری حاصل ہو اور وہ عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو اور اس کی بات نہ ماننے کی صورت میں عقوبت ونقصان کا خوف ہو، اس لئے بھی ایسی جماعت یا امت کو جو اس فرض کو انجام دینے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ سیاسی اقتدار اور قوت کی ضرورت ہے۔

اس لئے کہ "امر ونہی" طاقت چاہتے ہیں۔ "امر ونہی" وہ مقام چاہتے ہیں جہاں سے ہم اعتماد کے ساتھ کہہ سکیں کہ یہ صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ "امر ونہی" میں ایک استعلاء ہے۔ "امر ونہی" میں درخواست کے معنی نہیں "امر ونہی" حکم دینا اور روکنا، اس کے لئے آدمی کے اندر قدرت چاہئے۔ ایسا مقام اور ایسی بلندی چاہئے۔ ایسا اعتماد چاہئے اور اس کی ایسی وقعت ہو دلوں میں کہ وہ "امر" کر سکے اور "نھی" کر سکے۔

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے کہ وہ ہمیشہ یہی نہ کہے کہ "اگر ایسا کر لیا جاتا تو اچھا تھا......" ہماری درخواست ہے اور ہم آپ کو ترغیب دیتے ہیں" "ہم تبلیغ کرتے ہیں" اپنی جگہ پر یہ سلسلہ جاری رہے گا لیکن قرآن کا جو معیار ومیزان ہے اس میں الفاظ "امرونھی" کے ہیں، جن میں مسلمانوں کو وہ قوت وطاقت حاصل کرنی چاہئے کہ جس مقام پر فائز ہو کر وہ حکم دے سکیں اور روک سکیں۔ اس لئے کہ فطرت انسانی تعریف تو کر دیتی ہے اور وہ خوش بھی ہو جاتی ہے،

لیکن انسانی نسل کی پوری اصلاح اس کے بغیر نہیں ہو سکتی، جس کے نتیجہ میں "اَقَامُوْا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکوٰۃَ" اور "اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ" اور "نَهَوْ عَنِ الْمُنْكَرِ" کے الفاظ آئے ہیں۔

پس ضروری بات یہ ہے کہ ایسے لوگ برسرِ اقتدار آئیں جن کے دل میں خدا کا خوف ہو اور تقویٰ ہو، ان کی سب سے بڑی فکر آخرت کی فکر ہو۔ اور ان کی صفت یہ ہو:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوْا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ.

وہ (بندے جن کی تربیت ایسی ہو چکی ہو کہ) اگر ہم ان کو زمین میں تمکین اور غلبہ دیں (یعنی وہی اس دنیا کے والی اور حاکم بنا دیئے جائیں) تو وہ نمازیں قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیکیوں کے احکام جاری کریں اور برائیوں سے لوگوں کو روک دیں۔

یعنی یہ "اقامت صلوٰۃ ایتاء زکوٰۃ" اور "امر بالمعروف، نهى عن المنكر" جو ہے، یہ مقصود ہے، ذریعہ نہیں ہے۔ اس کے راستے سے حکومتِ الٰہی تک نہیں پہنچا ہے، بلکہ حکومتِ الٰہی کے ذریعہ سے اس کی طرف بڑھا ہے، اس لئے زیادہ سے زیادہ ماحول سازگار کرنا ہے، پھر ان کو رائج کرنا ہے۔(۱)

(۱) ۱۔ نبی خاتم و دین کامل، ص ۹ — ۲۔ حدیث پاکستان، ص ۴۵
۳۔ تحفۂ پاکستان، ص ۴۶-۴۷ — ۴۔ تحفۂ کشمیر ص ۴۹
۵۔ الفرقان اشاعت اشاعتین ۲ ۱۳۷ھ سے مشترک ماخوذ ہے۔

غیر اسلامی شعائر و رسوم کی نقل و تقلید سے احتراز کی ضرورت

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ (البقرة:)

آیت کا سیدھا ترجمہ یہ ہے کہ "اے ایمان والو "رَاعِنَا" نہ کہو "اُنْظُرْنَا" کہو اور (دھیان کے ساتھ) سنو، اور کافروں کے لئے دکھ دینے والا عذاب ہے"۔

ہمیں معلوم ہونا چاہئے، اور جس کو معلوم ہو اس کو حافظہ میں تازہ کر لینا چاہئے کہ یہ آیت کس موقعہ پر نازل ہوئی اور ہم سے کیا مطالبہ کرتی ہے، اس میں ہمارے لئے کیا پیغام ہے؟

"راعنا" کا مفہوم

"راعنا" عربی کا صحیح اور فصیح لفظ ہے جس کے معنی ہیں،، ذرا ہمارا خیال کیجئے،، ذرا اسی (سننے والوں کی) رعایت کیجئے، اور "انظرنا" بھی عربی کا صحیح اور فصیح لفظ ہے، جس کا

مفہوم ہے کہ ذرا سا ہمارا انتظار کیجئے، ذرا دیکھ لیجئے کہ ہم نے سنایا نہیں۔ دونوں عربی کے لفظ ہیں، دونوں فصیح ہیں، لیکن قصہ کیا ہے کہ ایک سے اللہ تعالیٰ منع فرماتا ہے، اور اس کتاب میں جو قیامت تک پڑھی جانے والی ہے، اس ممانعت کو جگہ دی جاتی ہے، وہ دور بھی ختم ہوا، قرآن شریف بہت سے ایسے ملکوں میں پڑھا پڑھایا جاتا ہے، جہاں عربی زبان نہ بولی جاتی ہے، نہ سمجھی جاتی ہے، پھر اسکو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے اور اس کو قیامت تک اور ہر ملک میں پڑھی جانے والی، اور ہر زبان میں ترجمہ کی جانے والی کتاب میں کیوں شامل کیا گیا ؟ یہ سوچنے کی بات ہے، اس لفظ کا قصور کیا ہے کہ اس سے منع کیا جاتا ہے، اور اسی کے ہم معنی لفظ کی تعلیم دی جاتی ہے کہ بجائے اس لفظ کے یہ لفظ کہو۔

قصہ کیا ہے

قصہ یہ ہے کہ جن جماعتوں کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ ہمارے ساتھ ظلم اور ناانصافی کی جاتی ہے، اور وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوتی ہیں، وہ اپنے دل کا بخار باتوں باتوں میں، چٹکی لینے میں، طنزیہ اور ذو معنی الفاظ بولنے میں نکال لیتی اور اپنا دل خوش کر لیتی ہیں، (ہماری اردو میں بھی ایسے الفاظ ہیں جو معصوم اور دیکھنے میں باوقار ہیں، مگر مذموم معنی میں استعمال ہوتے ہیں، مثلاً "آپ بڑے استاد ہیں" فلاں ذات شریف ہیں" میں چونکہ لکھنؤ میں رہتا ہوں، وہاں اس سے سابقہ پڑتا رہتا ہے) یہودیوں کا طریقہ تھا کہ جب دربار نبویؐ میں آتے تھے، اور گفتگو کا سلسلہ جاری ہوتا، تو کہتے تھے "رَاعِنَا" (ذرا ہماری رعایت کیجئے) وہ اس لفظ کو ذرا دبا کر کہتے تو "رَاعِیْنَا"

بن جاتا جس کے معنی ہوتے ہیں، ہمارا چرواہا، جو صاف ذہن ودل کے لوگ ہیں، ان کا ذہن بھی ادھر منتقل نہیں ہوتا کہ اس میں چٹکی لی گئی، یہودیوں کی نظر میں اسرائیل (حضرت یعقوبؑ) کی اولاد کے علاوہ سب دوسرے درجہ کے انسان اور جمادات و حیوانات کی سطح کے لوگ ہیں، غیر یہودی کے لئے ان کے یہاں (Gentile) کا لفظ ابھی تک موجود ہے، جس کے معنی ہیں، "غیر یہودیا صابی" وہ سمجھتے تھے کہ امیّین کے ساتھ جس طرح کا معاملہ کیا جائے، جائز ہے، جھوٹ بولا جائے تو جھوٹ نہیں، ان کی کوئی چیز دبالی جائے تو چوری نہیں، ان کو دکھ دیا جائے تو گناہ نہیں "لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ" (ہم سے امیین کے بارے میں کوئی مواخذہ نہیں ہوگا) صحابہ کرامؓ کا ذہن تو اس طرف نہیں گیا، مگر اللہ تبارک وتعالیٰ علیم وخبیر ہے، وہ لحن القول کو بھی سمجھتا ہے، یعنی جو باتیں چبا کر اور ذرا اخفاء واشباع کے ساتھ کہی جاتی ہیں، ان کو بھی جانتا ہے، اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کو ہدایت کی کہ عربی زبان بہت وسیع ہے، بجائے "راعنا" کے "اُنْظُرْنَا" کہا کرو، کہ اس میں کوئی اشتباہ نہیں۔

اللہ تعالیٰ احتیاط کی تعلیم دیتا ہے

خیال فرمایئے کہ جب ایک لفظ کے بارے میں اللہ تعالیٰ احتیاط کی تعلیم دیتا ہے، جو ہزاروں برس سے بولا جارہا تھا، اور ابھی تک عربی زبان ولغت میں موجود ہے تو غیر مسلموں اور جاہلی اقوام کے شعائر ورسوم کے اختیار کرنے، اور ان کی نقالی اور ریس کرنے میں اللہ تعالیٰ کی غیرت کیوں جوش میں نہ آئے گی، ہندوستان کے غیر مسلم باشندوں نے (جب مذہب کی گرفت ڈھیلی ہوگئی یا چھوٹ گئی، اپنے معاشرہ (سماج) کا

اپنے مذہب سے (جس کو وہ دھرم کہتے ہیں) رابطہ قائم رکھنے کے لئے) اس طرح کے جشن، رونق کی چیزیں، اور اجتماع کے مواقع ایجاد کیے، اس لئے کہ اس کے بغیر ان کے دھرم سے ان کے سماج کا ربط قائم نہیں رہ سکتا تھا، وہاں مسئلہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اظہار عبودیت یا بندگی کا نہیں تھا، اب کیسے معلوم ہو کہ یہ ہندو ہیں، اور ان کا بھی ایک دھرم ہے، اس کے لئے انھوں نے تہوار، جلوس، جلسے نکالے، رام لیلا، دسہرا، ہولی، دیوالی، بنگال میں درگا پوجا کا تہوار، دکن میں گن پتی کا جلوس...... سب اسی قبیل کی چیزیں ہیں۔

اسلامی تہواروں کی خصوصیت

اس کے مقابلہ میں اسلام کی روح، اس کا طریق فکر، اور اس کا شعار کیا ہے؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے کہ ایک دن ایک یہودی عالم حضرت عمرؓ کے پاس آتا ہے، اور کہتا ہے "یا امیرالمومنین اٰیة تقرؤنها فی کتابکم لو علینا معشر الیهود نزلت لا تخذنا ذلك الیوم عیدًا"(۱) امیرالمومنین ایک آیت ہے، جو آپ اپنی کتاب میں (بے تکلف) پڑھتے ہیں، کہیں اگر ہم یہودی جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس کا ایک جشن اور تہوار مناتے، حضرت عمرؓ نے فرمایا: کون سی آیت؟ یہودی عالم نے کہا "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ......! الخ" یہودی عالم کو معلوم تھا کہ یہودی شریعت اور مذہب کی تاریخ میں اس قسم کا کوئی اعلان نہیں، کہ نبوت فلاں اسرائیلی نبی پر ختم ہوگئی، یہ واقعہ ہے کہ اسلام

(۱) صحیح بخاری، کتاب التفسیر

کے علاوہ کسی آسمانی دین میں یہ اعلان موجود نہیں کہ اب دین مکمل ہو گیا، اس خلا کو وہ مذاہب اور ملتیں خود محسوس کرتی تھیں، اس لئے کہ روز کوئی نہ کوئی نبوت کا دعویدار کھڑا ہو جاتا تھا، اور کہتا تھا کہ میں نبی ہوں، یہودی اور عیسائی مورخین و فضلاء اپنے مضامین میں سر پکڑ کر روتے اور فریاد کرتے نظر آتے ہیں کہ یہ کیا مصیبت ہے کہ روز ایک مدعی نبوت کھڑا ہوتا ہے، اور یہودی اور عیسائی معاشرہ میں ایک انتشار اور افتراق پیدا ہو جاتا، اور ایک مسئلہ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے، اس نے کہا کہ اتنی بڑی نعمت اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کی ہے، جس سے انتشار اور روز روز کا جھگڑا ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، لیکن تعجب ہے کہ جس آیت کے ذریعہ آپ کو یہ انعام ملا، اور اس کا اعلان ہوا، آپ اس کا جشن نہیں مناتے؟

حضرت عمرؓ نے اس کا سیدھا سا جواب دیا، جو دین کا رمز شناس، اور درسگاہ نبوت کا اعلیٰ تربیت یافتہ ہی دے سکتا ہے، فرمایا کہ "ہمیں معلوم ہے کہ یہ آیت کب اور کہاں نازل ہوئی، یہ عرفات میں نویں ذی الحجہ کو نازل ہوئی" حضرت عمرؓ نے اتنا ہی کہا، اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ وہ پہلے سے ایک تاریخی اور یادگار دن ہے، جس میں مسلمان جمع ہوتے اور عبادت کرتے ہیں، دوسرے یہ بھی مفہوم نکلتا ہے کہ وہ کس دن نازل ہوئی، لیکن ہم اس دن کو اس کا تہوار نہیں بنائیں گے، اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے دو ہی عیدیں مانی ہیں، اور امت کو عطا کی ہیں، ایک عیدالفطر ایک عیدالاضحیٰ، آپ نے فرمایا کہ اللہ نے ہمیں غیر مسلموں کے تہواروں کے مقابلہ میں دو تہوار دیئے ہیں، ایک عیدالفطر کا، ایک عیدالاضحیٰ کا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ

اسلام میں ان دونوں کے علاوہ کوئی مستند اور مشروع تہوار نہیں، یہ بھی خیال رہے کہ غیر مسلموں کے تہوار کھل کھیلنے، دھوم مچانے، اور رنگ رلیاں منانے کے لئے ہیں، جن میں آدمی خدا کو بھی بھول جاتا ہے اور اپنے کو بھی، اور بعض اوقات تہذیب و اخلاق کو بھی، اس کے خلاف اسلامی تہواروں (عیدین) کی شان یہ ہے کہ چاشت کی نماز، فرض و واجب تو کیا، سنت مؤکدہ بھی نہیں تھی، لیکن ان دونوں میں اسی چاشت کے وقت میں ایک نئی نماز (دوگانۂ عید) کا اضافہ کیا گیا، اور اس کو سنت مؤکدہ قرار دیا گیا، ہر نماز میں دو تکبیریں، ایک تکبیر تحریمہ اور ایک تکبیر رکوع ہوتی ہے، دوگانۂ عید میں ان دو تکبیروں کے علاوہ تین تکبیریں اور بڑھادی گئیں، یہ اچھا تہوار ہوا، نماز بھی بڑھادی، اور نماز میں تکبیروں کی تعداد بھی بڑھادی، اور ایک خطبہ کا بھی اضافہ ہوا، یہ ہے اسلامی تہواروں کی خصوصیت۔

علماء کا فرض اور مدارس دینیہ کی ذمہ داری

علماء کا فرض ہے کہ اس بات کی چوکسی کریں کہ مسلمان "راعنا" تو نہیں کر رہے ہیں، راعنا کہنے سے "راعنا" کرنا اور بھی بُرا ہے، مسلمانوں کی یہ ذہنیت تو نہیں ہو گئی کہ صاحب فلاں قوم، فلاں فرقہ، فلاں چیز کا جلوس نکالتا ہے، ہم اس کے مقابلہ میں فلاں چیز کا جلوس نکالیں، یہ طرز عمل "راعنا" کہنے سے بھی بدتر ہے، اس لئے کہ "راعنا" تو ایک لفظ تھا، جو ہوا میں اڑ کر رہ جاتا تھا، لیکن جو چیز غیر مسلموں کی نقل میں کی جائے گی وہ عملی "راعنا" ہے، اور اس کا اثر عقائد و اعمال، اور تمدن و معاشرت پر پڑے گا۔

علماء کا فرض ہے کہ جس وقت بھی کوئی ایسی بدعت، کوئی منکر، اور غیر مسلموں کی تقلید کی دعوت سامنے آئے تو صاف کہہ دیں کہ اسلام کا اس سے کوئی واسطہ نہیں، یہ اسلام کی روح اور تعلیمات کے منافی ہے، آج درگاہوں اور مزاروں پر جو کچھ ہو رہا ہے، وہ زیادہ تر غیر مسلموں کی نقل ہے، ان اعمال و رسوم و بدعات کی تاریخ موجود ہے، جن سے پتہ چل سکتا ہے کہ وہ کب اور کہاں سے شروع ہوئیں، اور ان کے محرکات کیا تھے؟ دین کی روح عبادت ہے، دین کی روح انابت الی اللہ ہے، دین کی روح توحید ہے، دین کی روح سادگی ہے، دین کی روح وہ ہے جس سے کرنے والے کو بھی فائدہ پہونچے، دوسروں کو بھی، عید الاضحیٰ میں نماز تو نماز قربانی بھی رکھ دی کہ محلّہ اور گاؤں میں بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو گوشت کو بھی ترستے ہیں، مہینوں گذر جاتے ہیں، ان کو گوشت کھانا نصیب نہیں ہوتا، آج پیٹ بھر کر گوشت کھالیں گے، اور حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سنت بھی ادا ہو جائے گی۔

خاص طور پر علماء کا فرض ہے کہ اس پر کڑی نظر رکھیں کہ اسلامی معاشرہ میں کوئی "راعنا" دبے پاؤں تو نہیں چلا آرہا ہے؟ جہاں آئے وہیں اس کو روک دیں، آپ نے امت کو وصیت کرتے ہوئے صاف طور پر فرمایا "عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمُهْدِيِّيْنَ تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ" (میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کرو جو ہدایت یافتہ تھے، اس کو مضبوط ہاتھوں سے تھامو اور دانتوں سے دباؤ) ہمارے مدارس کا فائدہ اور اصلی غرض و غایت یہی ہے کہ

وہ دین کے چوکیدار، راتوں کو پہرہ دینے والے پیدا کریں، اگر وہ بھی "ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد" کا مصداق بن جائیں، اور ہر شرعی اور غیر شرعی کام میں عوام کا ساتھ دینے لگیں، بلکہ قیادت کرنے لگیں تو پھر بقول شاعر۔ ع

چو کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی

علماء میں بھی ایسا دینی جلال، اور توحید و سنت کے بارے میں غیرت اور حمیت ہونی چاہئے، اور ہمارے مدارس عربیہ و دینیہ یہی عنصر اور جنس پیدا کرنے کے لئے قائم ہوئے تھے، اور ان کو اپنی یہ خصوصیت ہمیشہ برقرار رکھنی چاہئے۔!(۱)

---

(۱) تحفۂ دکن، ص ۵۰ تا ۵۲ تلخیص

علمائے دین کا منصب استقامت اور حقیقت پسندی کا جامع

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ. (المائدہ. ۸)

اے ایمان والو! کھڑے ہو جایا کرو، اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی۔

خدائی فوجدار

پوری امت مسلمہ کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ" (یعنی تم اللہ کے لئے حق کے علم بردار بن جاؤ)۔

ہماری زبان اور محاورہ میں "خدائی فوجدار" ایک طنز کا لفظ ہے کہ آپ خدائی فوجدار ہیں؟ لیکن "قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ" کا مفہوم تقریباً "خدائی فوجدار" ہی کا ہے، مبالغہ کے اس صیغہ (قَوّٰمِيْنَ) سے خدائی فوجدار ہی کی شان ظاہر ہوتی ہے، اگر قائمین للہ ہوتا تو شاید یہ بات نہ پیدا ہوتی، کوئی پوچھے نہ پوچھے، کوئی بلائے نہ بلائے، کوئی کہے نہ کہے، آپ اپنا فرض ادا کر رہے ہیں، آپ ہر جگہ پہونچ رہے ہیں۔

اس آیت میں خطاب اگرچہ پوری امت کو ہے، لیکن علماء کی اس بارے میں

امتیازی شان ہونی چاہئے، ان کو "شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ" حق و صداقت کا گواہ و علم بردار ہونا چاہئے، اگر امت اسلامیہ کا فرض اقوام عالم کا احتساب ہے تو علمائے اسلام کا فرض مسلم معاشرہ کا احتساب کرتے رہنا ہے، کہ کہاں سے یہ معاشرہ صراط مستقیم سے ہٹ رہا ہے، کہاں سے اس نے خط مستقیم کو چھوڑا ہے، اس بارے میں ان کا کام بالکل بیر و میٹر کا سا ہے، وہ ہر جگہ، ہر موسم میں ہوا کا دباؤ بتاتا ہے، وہ صحیح شہادت ادا کرتا ہے۔

علمائے دین کو قبلہ نما ہونا چاہئے

لوگوں نے چھوٹے چھوٹے واقعات، اور روزمرہ کے مشاہدات سے بڑے بڑے نتائج نکالے ہیں، اس میں شیخ سعدیؒ خاص طور پر بڑے ممتاز ہیں، اسی طریقہ سے مولانا رومؒ مثالوں کے بادشاہ ہیں، دونوں روزمرہ کے واقعات سے بڑی حکیمانہ باتیں اور بڑے عمیق نتائج نکالتے ہیں، میں اپنا بھی اسی قسم کا ایک تاثر اور عبرت کا سبق پیش کرتا ہوں، آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک طویل سفر کر کے آرہا ہوں، دہلی سے چلا اور حیدر آباد پہونچا، خدا جانے گاڑی نے کیا کیا رخ بدلے، کن علاقوں سے گذری، لیکن قبلہ نمانے ہمیشہ صحیح قبلہ بتایا، اس نے نہ گاڑی کے پھرنے کی پرواہ کی، نہ سمت کے تبدیل ہونے کی، مجھے بار بار رشک آیا کہ ایک ادنیٰ سی جماداتی چیز، جو انسان کی صنعت ہے، وہ اتنی امین، ایسی ثابت قدم، ایسی خوددار، اور ایسی پابند اصول ہے، کہ اس نے نہ یہ دیکھا کہ گاڑی کس طرح رخ بدل رہی ہے، نہ یہ کہ انسان (جو اشرف المخلوقات ہے) برابر اپنا رخ بدلتا رہا ہے، ہر جگہ اس نے صحیح طور پر قبلہ بتایا، اور ہم نے اس پر اعتماد کیا اور نماز پڑھی، اس سے مجھے غیرت بھی آئی، اور عبرت بھی ہوئی کہ قبلہ نما تو کسی کی پروانہ کرے، اور ہمیشہ سمت قبلہ بتائے، اس نے اپنا مقصد وجود

تبدیل نہیں کیا، اور نہ اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں فرق آنے دیا، اس سے مجھے خیال ہوا کہ علمائے دین کو حقیقت میں "قبلہ نما" ہونا چاہئے، ان کے اندر قبلہ نما کی سی استقامت ہونی چاہئے، کسی طرف کی ہوا چلے اور کہنے والے کتنا ہی کہیں کہ۔ ع

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

اور سمجھانے والے کتنا ہی سمجھائیں۔ ع

زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ بہ ساز

لیکن ان کا عقیدہ اقبالؔ کی (جو خود اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ اور مفکر و فلسفی اور پھر شاعر تھے) کی اس تعلیم پر ہو۔

حدیث کم نظراں ہے تو بازمانہ بساز
زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ ستیز

بلکہ وہ یہاں تک کہتے ہیں۔

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

علماء کی شان یہی ہونی چاہئے، امت مسلمہ امتوں میں، اور جماعت علماء حاملین علم میں الگ شان رکھتے ہیں، امت مسلمہ کو ایک قبلہ دیا گیا ہے، وہ جہاں کہیں ہوں اسی قبلہ کی طرف اپنا رخ کریں، جس امت کو ایک معیّن قبلہ دیا گیا ہے، اس کو یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ تمھارے دلوں کا قبلہ، تمھارا قبلۂ حاجات، تمھاری فکر اور سعی و جہد کا محور ایک ہی ہونا چاہئے، نمازوں میں خانۂ کعبہ، اور اعمال و مساعی و مقاصد میں اللہ تعالیٰ کی (جو معبود و مقصود حقیقی ہے) رضا۔

عقائد اور حدود شرعیہ کا مسئلہ

ایک تو عقائد اور حدود شرعیہ کا مسئلہ ہے، اس میں جماعت علماء کو بالکل قطب نما کی طرح ہونا چاہئے، کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی اس کو سامنے رکھے گا تو وہ اس کی رعایت نہیں کرے گا، وہ صحیح سمت بتائے گا، جہاں تک عقائد اور حدود شرعیہ کا تعلق ہے، دین میں کسی قسم کی رعایت کی گنجائش نہیں، حکمت اور چیز ہے، مداہنت اور چیز، حکمت اور مداہنت میں بڑا فرق ہے، ہاں آدمی سچی اور صاف بات حکمت کے ساتھ کہہ سکتا ہے، اس کا اسلوب حکیمانہ ہو "اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ" لیکن مداہنت نہ ہو، قرآن شریف میں آتا ہے: "وَدُّوْا لَوْتُدْهِنُ فَیُدْهِنُوْنَ" (وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تو ڈھیلا ہو تو وہ بھی ڈھیلے ہوں۔ القلم: ۹) اللہ کے رسول کو صاف حکم ہے "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ" یہ "اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ" کا تکملہ، "صَدَعْ بِالْأَمْرِ" کا محل متعین کر دیتا ہے، جہاں پر توحید اور شرک کی سرحدیں آتی ہوں، وہاں "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" پر عمل کا حکم ہے، نرمی اور وسعت کسی اور چیز میں ہو تو ہو، لیکن توحید و سنت کے بارے میں، منصوصات شرعیہ، اور قطعیات دینیہ کے بارے میں "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" کا حکم ہے، اگر "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" مطلق آتا تو اس میں بھی کچھ گنجائش تھی، لیکن "وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ" نے بالکل تفسیر کر دی کہ اس کا موقعہ و محل کیا ہے، علمائے حقانی کا فرض ہے کہ توحید کے بارے میں بالکل بے لوچ اور صاف بات کہیں، لیکن حکمت کے ساتھ کہیں، بقول غالبؔ ایسا نہ ہو۔ ع

کہتے ہیں وہ بھلے کی و لیکن بُری طرح

بھلی بات بھلے طریقہ پر کہی جائے، کوئی فتنہ شروع ہو تو علماء شروع میں اچھی سے اچھی، نرم سے نرم زبان استعمال کریں، تدریج و حکمت سے کام لیں، لیکن اس طرح کہ تاویل اور غلط فہمی کی گنجائش نہ ہو، اسی طرز عمل کا نتیجہ ہے کہ آج تک یہ دین قائم ہے، اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہے، جس کو ہلاکت کا شوق ہے، وہ شوق سے ہلاکت میں پڑے، لیکن وہ شریعت، اور شریعت کے حاملین کو الزام نہیں دے سکتا۔

امت مسلمہ کسی عالمگیر ضلالت میں گرفتار نہیں ہوئی

تاریخ کا اگر عمیق و وسیع نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس امت کی تاریخ میں ایک سال بھی ایسا نہیں گزرا کہ یہ امت عمومی طور پر کسی ضلالت کا شکار ہوگئی ہو، مقامی طور پر تو ضلالتیں رہی ہیں، لیکن پوری امت مسلمہ کسی سازش، یا کسی عالمگیر ضلالت میں گرفتار نہیں ہوئی، اور خود حدیث میں آیا ہے "لا تجتمع أمتي على ضلالة" اس کے برعکس یہودیت بالکل شروع میں تحریف کا شکار ہوگئی، اور عیسائیت بالکل عہد طفلی اور آغاز کار میں ایک بالکل نئی پٹری پر پڑ گئی، جس پر وہ صدیوں سے چلتی چلی آرہی ہے، اسی لئے قرآن مجید نصاریٰ کو "ضَالِّيْن" کے لفظ سے یاد کرتا ہے، کہ وہ جیسے ہی چلے دوسرے راستہ پر پڑ گئے۔

لیکن الحمدللہ اسلام اس سے بالکل محفوظ ہے، اس وقت تک توحید و شرک کا فرق، سنت و بدعت کا فرق، اسلام اور جاہلیت کا فرق، غیر مسلمین کی معاشرت و تمدن اور اسلامی معاشرت و تمدن کا فرق بالکل واضح ہے، کوئی ملک کسی وجہ سے کسی خاص

زمانہ میں کسی خارجی یا داخلی سبب کی بناء پر کسی سازش کا شکار ہو جائے، یا کسی فتنہ میں مبتلا ہو جائے یہ الگ بات ہے، علمائے حق اس صورت حال سے بھی نبرد آزما اور اس کے مقابلہ میں صف آرا رہتے ہیں، اور اصلاح حال کی کوشش جاری رہتی ہے (۱)۔

---

(۱) تحفۂ دکن صفحہ ۳۹ تا صفحہ ۴۸۔

حالات کا نیا رخ اور علمائے دین کی ذمہ داری

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا. فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ. وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ. وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ. ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ.

(سورۂ فاطر۔ ۳۲)

پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث ٹھہرایا جن کو اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا تو کچھ ان میں سے اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں اور کچھ میانہ رو ہیں اور کچھ خدا کے حکم سے نیکیوں میں آگے نکل جانے والے ہیں، یہی بڑا فضل ہے۔

کوئی چیز خلاء میں نہیں رہ سکتی

دین ہو، آسمانی تعلیمات ہوں، صحیح دعوت یا اعلیٰ سے اعلیٰ اصول ہوں، ان میں سے کوئی چیز خلاء میں نہیں رہ سکتی، اگر اس تعلیم و دعوت کے ساتھ انسانی زندگیاں، ان کے حاملین اور زندہ اور عملی پیکر نہ ہوں تو ان کا تسلسل قائم نہیں رہتا، ادیان سماوی کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے، اور اخلاقی تعلیمات کی تاریخ بھی اسی کی شہادت دیتی ہے، اگر ایسا ممکن ہوتا اور سنت الٰہی اور فطرت انسانی اس کی اجازت دیتی تو پھر اتنا کافی تھا کہ آسمان سے صحیفے آجاتے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر کسی محفوظ جگہ پر رکھ دیئے جاتے اور اعلان کر دیا جاتا کہ اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے صحیفے اور آسمانی کتابیں آگئی ہیں، وہ فلاں جگہ محفوظ ہیں، جس کا دل چاہے جائے لے آئے، اور عمل کرے، لیکن پہلے اللہ

تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو پیدا کرتا ہے، پھر ان کی بعثت ہوتی ہے، ان پر وحی کا نزول ہوتا ہے، اور اس کا پہلا نمونہ وہ خود ہوتے ہیں، جیسا کہ حضرت عائشہؓ سے آنحضرت ﷺ کی سیرت وحیات طیبہ اور اخلاق وشمائل کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا "کان خُلقه القران" (رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو دیکھنا ہو تو قرآن مجید پڑھ لو اور دیکھ لو) اور آنحضرتؐ کے ساتھ تو اللہ کا خصوصی معاملہ اور مزید انعام یہ تھا کہ (حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے الفاظ میں) آپ کی بعثت "بعثت مقرونہ" (دوہری بعثت) تھی، یعنی آپ انسانوں کی طرف مبعوث کئے گئے تھے، اور آپ کی تعلیمات کو دنیا میں پھیلانے اور ان کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے ایک پوری امت کی بعثت عمل میں آئی تھی، اسی لئے آپ دیکھتے ہیں کہ تنہا امت مسلمہ کے لئے بعثت یا اس کے ہم معنی اور مرادف الفاظ استعمال ہوئے ہیں، فرمایا گیا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا.
(البقرہ۔ ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر (آخرالزماں) تم پر گواہ ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ. (آل عمران۔ ۱۱۰)

مومنو! جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر یقین رکھتے ہو۔

اس سے زیادہ صاف الفاظ حدیث میں آئے ہیں مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا "انما بعثتم میسّرین ولم تبعثوا معسّرین" (تم آسانی پیدا کرنے کے لئے پیدا اور مقرر کئے گئے ہو، مشکلات پیدا کرنے کے لئے نہیں۔)

صحابہ کرامؓ نے بھی اس سے ملتے جلتے الفاظ استعمال کئے ہیں، آپ کو یاد ہوگا کہ جب رستم سپہ سالار افواج ایران نے حضرت ربعی ابن عامر سے جو مسلمانوں کے نمائندہ و سفیر بن کر آئے تھے پوچھا کہ "تم کیسے آئے؟" (ماالذی جاء بکم؟) تو اس کے جواب میں انھوں نے زبانِ نبوت ہی کے الفاظ استعمال کئے، انھوں نے کہا "اللہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد الیٰ عبادۃ اللہ وحدہ" (اللہ نے ہم کو بھیجا ہے، تاکہ حکم الٰہی سے اللہ کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر خدائے واحد کی بندگی میں داخل کریں) اس سے آپ سمجھ لیجئے کہ کوئی دین خلا میں نہیں رہ سکتا، دین سے پہلے نبی کی شرط ہے، پھر نبی کے ساتھ امت کی شرط ہے، اس کے اصحاب و تربیت یافتہ نفوس کی شرط ہے، جس کا بہترین نمونہ آپ کو سیرت نبوی میں ملتا ہے، اس کے بعد یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہنا چاہئے۔

توریث کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا

میں نے آپ کے سامنے جو آیت پڑھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "توریث" یعنی نائبین انبیاء اور حاملین کتاب کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، اس طرح وارثین انبیاء، اس امانت کے حاملوں اور دین کے نمائندوں کی بڑی ذمہ داری ہے، اس دین کے بارے میں بھی، اپنے ماحول و معاشرے اور اپنے ملک کے بارے میں بھی اور پوری انسانیت کے بارے میں بھی، جس کی قسمت دین صحیح اور آسمانی تعلیمات سے وابستہ ہے، اسی حقیقت کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:-

يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتاويل الجاهلين. (۱)	اس علم کے ہر نسل میں ایسے عادل و متقی حامل ووارث ہوں گے، جو اس دین سے غلو پسند لوگوں کی تحریف اہل باطل کے غلط انتساب ودعوے اور جاہلوں کی دور از کار تاویلات کو دور کرتے رہیں گے۔

وراثین کتاب، نائبین انبیاء اور عام فہم الفاظ میں "علمائے دین" کی یہ اتنی بڑی ذمہ داری اور اتنا نازک معاملہ ہے کہ اگر اس کا صحیح طور پر ادراک ہو تو جن لوگوں کو اللہ نے یہ شرف عطا فرمایا ہے، اور ان کے کاندھوں پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے، ان کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، راتوں کی نیند اڑ جائے اور کھانے پینے کی لذت ختم ہو جائے اور ان کا سکون ہمیشہ کے لئے جاتا رہے۔

دراصل حاملین و شارحین دین ہی کی سیرت و اخلاق پر عوام کی دین سے وابستگی، اس سے عقیدت، اس پر اعتماد اور صحیح عقائد و مسلک کے بقاء کا انحصار ہے، ان کی ذرا سی غلطی کیا اثر پیدا کر سکتی ہے، اس رابطہ کو کتنا کمزور کر سکتی ہے، جو امت اور دین کے درمیان قائم ہے، ان کی اخلاقی کمزوری، جماعت کا اخلاقی تنزل، کردار کی پستی، دنیا طلبی، دولت پرستی، قوت و اقتدار کی تقدیس، خواہشات نفس اور ذاتی مفادات کے سامنے سپر اندازی، تفرقہ اندازی اور انتشار پسندی پورے معاشرے پر کیا اثر ڈالتی ہے، اور اس عہد و ملک کی پوری نسل کو کس طرح متزلزل و متاثر کر دیتی ہے، اگر اس کا صحیح ادراک ہو تو ہمارے مدارس کے بام و در ہی نہیں مساجد کے محراب و منبر بھی کانپنے لگیں، مشہور حدیث صحیح سے بڑھ کر کوئی اس حقیقت کی عکاسی و مصوری نہیں کر سکتا، فرمایا گیا:-

---

(۱) مشکوۃ، ص ۳۸ فصل ثانی، روایت از بیہقی

ألا ان فی الجسد مضغة اذاصلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسدالجسد کله ألا وهی القلب.

یاد رکھو جسم انسانی میں ایک مضغۂ گوشت ایسا ہے کہ اگر وہ درست ہو جائے تو پورے جسم کا نظام درست رہے گا اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورے جسم کا نظام بگڑ جائے، خبر دار رہو وہ مضغۂ گوشت دل ہے۔

علماء و خواص کی حیثیت ملت و معاشرے میں بالکل وہی ہے جو قلب کی جسمِ انسانی میں ہے، اور اُن کے فساد و اختلال اور ان کے صلاح و اعتدال کا وہی اثر پوری ملت و معاشرے پر پڑتا ہے، جو قلب کے صلاح و فساد کا پورے جسم انسانی پر پڑتا ہے۔

پوری صاحبِ علم جماعت کی ذمہ داری ہے

یہ ذمہ داری کسی ایک جماعت یا کسی مخصوص ادارے کی نہیں ہے، یہ پوری صاحب علم جماعت کی ذمہ داری ہے، وارثین کتاب کے اخلاق پر جب انحطاط آئے گا، جب ان کے اندر دنیا پرستی آجائے گی، جب ان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ کمزور پڑ جائے گا، جب وہ ان حدود سے بھی تجاوز کرنے لگیں جن حدود سے عوام کو بھی آگے نہیں بڑھنا چاہئے، تو پھر پورے معاشرے اور پورے ماحول میں فساد ہی نہیں بلکہ تعفن اور سڑاہند پیدا ہو جائے گی، دین کا مستقبل وابستہ ہے اہل دین و اہل علم سے اور کسی ملک اور اس ملک کی آبادی کا اخلاقی، انسانی اور دینی مستقبل وابستہ ہے دین کے شارحین اور دین کے نمائندوں سے، اب دین کے نمائندوں میں کوئی کمزوری پیدا ہو جائے تو دنیا کی کوئی طاقت عوام کے دین کے ساتھ تعلق کو کمزور ہونے سے بچا نہیں سکتی، نہ کوئی حکمت، نہ کوئی ذہانت، نہ کوئی خطابت، نہ کوئی سیاست، یہاں تک کہ اگر کوئی اسلامی حکومت بھی یہ بات طے کرلے کہ اس معاشرے اور اس ماحول میں فساد

پیدا نہ ہونے پائے اور اس کا رشتہ دین سے کمزور نہ ہونے پائے تو وہ بھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

یہ بات بالکل ایسی ہے کہ جہاز کی رفتار کو کنٹرول کرنے والی اور جہاز کا رخ متعین کرنے والی ایک چھوٹی سی مشین یا ایک معمولی سا پرزہ ہوتا ہے، اگر بال برابر بھی اس کی سوئی اپنی جگہ سے کھسک جائے تو جہاز سیکڑوں میل کے حساب سے اپنی منزل مقصود سے دور ہو جاتا ہے، علماء کی جماعت در حقیقت ملت و انسانیت کے لئے "قطب نما" ہے، جس سے قبلہ کی سمت متعین ہوتی ہے، اس لئے اس کا صحیح اور سچا رہنا اور اپنا کام کرتے رہنا ضروری ہے، اگر علماء کا تعلق اللہ کے ساتھ درست ہے، اگر ان کے اندر اخلاص و اخلاق پایا جاتا ہے، وہ اپنے فرائض کے ادا کرنے میں مستعد اور سرگرم ہیں، اور ان اعلیٰ صفات سے متصف ہیں، جو کسی درجہ میں نائبین انبیاء اور وارثین کتاب میں پائی جانی چاہئیں، تو کم سے کم اس ملک میں دین کا مستقبل محفوظ ہے، لیکن اگر یہ نہیں ہے تو پھر دنیا کی کوئی تدبیر اس ملک میں دین کو بچا نہیں سکتی(۱)۔

---

(۱) حالات کا نیا رخ اور علمائے دین کی ذمہ داری، ص ۴ تا ۱۰

ہندوستان میں مسلمانوں کی ذمہ داری

وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِهَا. اور زمین میں اصلاح کے بعد خرابی نہ کرو۔

(سورۃ الاعراف۔۸۵)

اصلاح کے بعد خرابی نہ پھیلاؤ

خدا کے پیغمبر شعیبؑ نے اپنی قوم سے کہا (اور حقیقت میں انھوں نے سارے پیغمبروں اور پیغام ربانی کی ترجمانی کی) دیکھو میری قوم کے لوگو! اللہ کی زمین میں اصلاح کے بعد خرابی اور فساد نہ پھیلاؤ، ان کے یہ الفاظ کتنے سادہ لیکن کتنے معنی خیز کتنے عمیق، اور درد میں ڈوبے ہوئے ہیں؟ عام طور پر کہا جاتا ہے، بھائیو! فساد نہ مچاؤ، انتشار انگیزی نہ کرو، بد نظمی نہ پھیلاؤ، لیکن حضرت شعیبؑ نے فرمایا: ''وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِهَا''۔

جب خدا کی زمین، اس کے کسی ملک میں معاشرہ اور تمدن، اور حیات انسانی کی چول بٹھانے، اس کو اپنی جگہ پر لانے، انسانوں کا رشتہ اپنے مالک سے استوار کرنے، بنی نوع انسان کے درمیان تعلقات کو درست کرنے، دوسروں کے حقوق اور اپنے فرائض کو تسلیم اور قبول کرنے، انسانی جان و مال کے احترام اور خوش معاملگی کا درس

دیا گیا ہو، اور اللہ کے بندوں نے بڑی تعداد میں، اور بعض اوقات پورے پورے ملک اور پوری پوری قوم نے کسی خطۂ ارضی میں اس کو قبول کر لیا ہو، تو خدارا اس کے بعد ان کوششوں پر پانی نہ پھیرو، اس نخل اصلاح کو خون پسینہ سے سینچا گیا، اس کی خاطر اپنے خاندانوں، اور عزت و ناموس کی بازی لگا دی گئی، دنیا کے تمام مفادات سے آنکھیں بند کر لی گئیں، ایک ہی حقیقت کو یاد کیا گیا کہ زمین پر آدمیوں کو آدمیوں کی طرح اور خدا کے بندوں کی طرح رہنا سکھایا جائے، جس طرح کہ تسبیح کے دانوں کو تسبیح میں، یا ہار کے موتیوں کو ہار میں گوندھ دیا جاتا ہے، اسی طرح نسل انسانی کے افراد کو اخوت انسانی کے دھاگے میں گوندھ دیا گیا ہے "کُلُّکم من ادم، وادم من تراب" (۱) (اے انسانو! تم سب آدمؑ کی اولاد ہو، اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے) خدا کے لئے اس دھاگہ کو نہ توڑو، ورنہ یہ دانے بکھر جائیں گے۔

حضرت شعیبؑ کے اس مقولہ میں بڑا درد، اور دل کی تڑپ نظر آتی ہے، خدا کے پیغمبروں نے صدیوں کے عمل میں انسان کو انسانیت کا سبق پڑھایا، اور انسان بن کر رہنا سکھایا، انھوں نے کہا کہ تمھاری یہ تعریف نہیں کہ مچھلیوں کی طرح پانی میں پیرو، چڑیوں کی طرح ہوا میں اڑو، شیر کی طرح ڈکارو، اور بھیڑیئے کی طرح پھاڑو، تمھاری تعریف یہ ہے کہ خدا کے بندوں کی طرح خدا کی زمین پر چلو، زمین خدا کی، تم خدا کے، پھر سرکشی کہاں سے آئی؟ انھوں نے یہ نہیں فرمایا کہ "وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ صَلَاحِهَا" (زمین کے درست ہو جانے کے بعد اس میں بگاڑ نہ پیدا کرو) "اصلاح" لفظ متعدی ہے، اصلاح کے لئے ایک مصلح چاہئے، دعوت چاہئے،

جدو جہد چاہئے، توفیقِ الٰہی چاہئے، اس لفظ میں یہ سب چیزیں آگئیں، نبوت کی تاریخ آگئی، جب خدا کے پیغمبروں، اور انسانیت کے چارہ سازوں نے اپنی مبارک کوششوں سے اس خطۂ ارضی کو جنت کا نمونہ بنادیا، یہاں انسان، انسان پر جان دینے کے لئے تیار ہوگئے، رہزن پاسبان، اور درندے چوپان بن گئے، ایثار و قربانی کے ایسے نمونے دنیا کے سامنے آئے کہ اگر تاریخ کی معتبر شہادت، اور شہرت و تواتر نہ ہو تو ان کا یقین کرنا ممکن نہیں تھا(۱)۔

خدا کی نگاہ میں بڑا جرم

خدا کی نگاہ میں بڑا جرم، اور خدا کے پیغمبروں اور مصلحین کی نگاہ میں بڑا ظلم ہے کہ کسی معاشرہ کو جس کے ہر فرد کی قسمت دوسرے فرد سے وابستہ ہے، اپنے ذاتی مفاد اور کوتاہ نظری کی بناء پر زیروزبر کردیا جائے، اگر کوئی خرابی کسی معاشرہ (سوسائٹی) یا ملک میں پیدا ہو، اور آدمی سمجھے کہ ہماری بلا سے، ہمارا کیا بگڑتا ہے، فلاں محلّہ میں، فلاں برادری میں، شہر کے فلاں حصہ میں، ملک کی ایک ریاست میں اگر آدمی آدمی کو ماررہا ہے، لوگوں کے گھر جلائے جارہے ہیں، یکاّ دُکاّ مسافر کو چھرا گھونپا جارہا ہے، تو کیا حرج ہے، ہمارے محدود حلقہ میں تو کوئی بات نہیں، اس صورت حال اور اس طرز فکر کا جو نتیجہ ہوگا، اس کی مثال مجھے اصلاحی ادب ہی میں نہیں، ادبیات انسانی میں اس سے

(۱) مثلاً عہد خلافت راشدہ میں ایک جنگ کے موقعہ پر ایک زخمی مسلمان کا جو جاں کنی میں مبتلا تھا، اور اس کا بھائی اس کو پانی کی چھاگل پیش کررہا تھا، دوسرے زخمی مسلمان کی طرف اشارہ کرنا کہ پہلے اس کو پانی پلاؤ، اور ہاتھ منہ دھوؤ، اس کا تیسرے کی طرف اشارہ کرنا، اور اس سلسلہ کا اسی طرح جاری رہنا، یہاں تک کہ باری باری سب نے جان دے دی، اور پانی اسی طرح رکھا رہا۔ (کتاب تاریخ و مغازی)

بہتر نہیں ملی، جو ایک صحیح حدیث نبویؐ میں دی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ ایک کشتی پر مسافر سوار ہیں، اس میں دو طبقے ہیں، ایک بالائی، ایک زیریں، (یہ بھی اعجاز نبوی ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے، اس وقت کشتی رانی کے فن نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ اس میں فرسٹ کلاس، اور ڈک کلاس ہوں، اور اگر یہ ترقی ہو چکی ہوتی، تو کم سے کم جزیرۃ العرب جس میں دریا نہ ہونے کے برابر ہیں، اور حجاز کا خطہ اس سے اور بھی ناآشنا تھا) کچھ مسافر اوپر کے طبقہ میں ہیں، جن کو ہم (بالا نشین) کہہ سکتے ہیں، کچھ حصے زیریں کے لوگ ہیں، جو عام طور پر غریب غرباء ہوتے ہیں، میٹھے پانی کا انتظام اوپر کیا گیا ہے، اَپر کلاس والوں کی رعایت بھی ذرا زیادہ کی جاتی ہے، نیچے والے مجبور ہیں کہ پانی لینے کے لئے اوپر جائیں، وہاں سے پانی لیکر آتے ہیں، پانی کی فطرت ہے کہ اچھلتا ہے، پھر کشتی خود ایک متحرک چیز ہے، ڈانواں ڈول ہوتی ہے، لوگوں کی ہزار احتیاطوں کے باوجود پانی چھلکتا ہے، پانی پہچانتا نہیں کہ یہ فلاں امیر صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، یہ فلاں نواب صاحب کے کپڑے پھیلے ہوئے ہیں، ایک مرتبہ ہوا، دو مرتبہ ہو، چار مرتبہ ہو، آخر میں اَپر کلاس کے ان مسافروں سے برداشت نہیں ہو سکا، اور انھوں نے کہا صاحب! یہ تماشہ ہم نہیں دیکھ سکتے، پانی یہ لے جائیں اور پریشان ہم ہوں؟ ہم پانی نہیں لے جانے دیں گے، اپنا انتظام کرو، نیچے والوں نے کہا کہ پانی کے بغیر تو گذارا نہیں، اب اگر ہم اوپر سے نہیں لا سکتے تو ہم نیچے ہی سوراخ کر لیتے ہیں، بیٹھے ہی بیٹھے اپنے برتنوں میں پانی بھر لیا کریں گے، اب ہمیں منّت کشِ غیر نہیں ہونا پڑے گا، اور کسی کی ناز برداری نہیں کرنی پڑے گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر ان بالا نشینوں کی عقل پر پتھر نہیں پڑے ہیں، اور ان کی شامت نہیں آئی ہے تو وہ

خوشامد کریں گے، ہاتھ پکڑیں گے اور کہیں گے کہ نہیں بھائی، تم اوپر ہی سے پانی لے جاؤ، لیکن خدا کے لئے یہ غضب نہ کرو کہ نیچے ہی نیچے سوراخ کرلو، اس لئے کہ کشتی ڈوبے گی تو پھر سب کو لے کر ڈوبے گی، نہ اَپر کلاس والے بچیں گے نہ لُور کلاس والے۔

ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں

ہم کو آپ کو سب کو بظاہر اسی ملک میں زندگی گذارنی ہے، لیکن یہ تمدن انسانی یا معاشرۂ انسانی کی کشتی ہے، اور ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، اگر ہم نے خود غرضی سے کام لیا، اور اپنے اپنے گھر میں میٹھے پانی کا انتظام سوچ لیا، تو پھر خیریت نہیں، وہ میٹھا پانی کیا ہے؟ یہ کہ ہماری غرض پوری ہو جائے، ہمارا کام نکل جائے، پھر ہمیں دوسرے سے مطلب نہیں، یہ کشتی میں سوراخ کرنے ہی کے مرادف ہے، آج ہمارے ملک کی کشتی میں کتنے سوراخ کئے جارہے ہیں، ہر شخص اپنی محدود غرض کو دیکھتا ہے، اس نے دوسروں سے اپنی آنکھیں بند کررکھی ہیں، اوراس حقیقت کو بھلادیا ہے، کہ اس کا اجتماعیت پر کیا اثر پڑتا ہے، آج ہندوستان ہی کا نہیں، ساری دنیا کا روگ یہی ہے۔

اس وقت مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کھڑے ہوں، پورے ملک کو تباہ ہونے سے بچائیں، یہ تنہا حکومت کی ذمہ داری نہیں ہے، اس کے ساتھ بیسیوں الجھنیں، اور سیاسی مصلحتیں لگی ہوئی ہیں، قرآن کی روشنی میں یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ دین کے سچے داعیوں، انسانیت کے بہی خواہوں، اور ملک و معاشرہ کے مخلص

معماروں کی محنتوں پر پانی نہ پھیرنے دیجئے "وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا" کا پیغام دیتے رہئے، خدا کے یہاں آپ سے سوال ہوگا کہ تمھارے ہوتے ہوئے یہ ملک کیسے تباہ ہوا، تمھیں ایسا کردار اور نمونہ پیش کرنا چاہئے تھا کہ لوگ سمجھتے کہ پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا، عہدہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا، عزت ہی سب کچھ نہیں ہوتی، خدا کا خوف اصل چیز ہے، پھر محبت اور ہمدردئ خلائق۔

میں یقین رکھتا ہوں کہ آپ یہ نمونہ دکھا کر محبوبیت کا مقام حاصل کرلیں گے، اور آپ کو اس ملک کی قیادت کا مقام تفویض ہوگا(۱)۔

(۱) تحفۂ دکن، ص ۲۴ تا ص ۳۲

نزولِ قرآن کا مقصد
اور
حاملین قرآن کی ذمہ داریاں

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْأُمِّیِّیْنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْ عَلَیْهِمْ آیَاتِهِ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ، وَإِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلَالٍ مُّبِیْنٍ.﴾

(سورہ جمعہ: ۲)

اللہ تعالیٰ کے کلام سے تعلق رکھنے والی ہر چیز خواہ وہ حفظ ہو یا تجوید، تفسیر ہو، یا قرآن مجید کی تلاوت، بڑی معزز اور مکرم چیز ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ساتھ ہی آپ کے منصب نبوت کے فرائض، اور اس کی ذمہ داری کے سلسلے میں فرمایا:۔

”وہ پاک ذات ہے جس نے ان پڑھوں میں ایسا پیغمبر مبعوث فرمایا جو ان کو قرآن مجید کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کی تربیت فرماتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ وہ اس سے پہلے بڑی کھلی ہوئی گمراہی میں تھے“۔

منصب نبوت اور اس کا کام

رسول ﷺ کے منصب نبوت کے چار شعبے ہیں، جو گویا فرائض چہار گانہ ہیں۔

تلاوت آیات

تلاوت آیات پہلا فریضہ اور پہلا شعبہ ہے، یہ بھی اتنی اہم چیز اور ایسا بلند فریضہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے منصب نبوت کے شعبوں میں سب سے پہلے اسی کو ذکر فرمایا ہے۔

تزکیہ نفس

دوسرا شعبہ یزکیھم، نفوس کی تربیت کرنا، مہذب بنانا، اخلاق رذیلہ نکالنا اور اخلاق فاضلہ پیدا کرنا اور وہ وصف پیدا کرنا جس کا قرآن مجید میں دوسری جگہ ذکر ہے۔

"اور لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا اور کفر اور فسق اور عصیان سے تم کو نفرت دے دی، ایسے لوگ راہ راست پر ہیں"۔ (سورہ الحجرات: ۷)

نزول قرآن کا اہم ترین مقصد

قرآن مجید کے نزول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ الفاظ اور حروف کی شکل میں،

کتابوں میں اور اس کے بعد سینوں میں محفوظ ہو جائے کہ لوگ اس کو پڑھ سکیں اور اس کو سنا سکیں، اس کو یاد کریں اور پڑھتے رہیں، بلکہ نزول قرآن کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ عقائد کی اصلاح ہو، قلب اور نفوس کی اصلاح ہو، رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں فریضوں کی تکمیل فرمائی۔ صحابہ کرامؓ آپ کی اس محنت کا زندہ ثبوت تھے، ان کے نفوس کیسے مصفی تھے، ان کی کیسی تربیت ہو چکی تھی کہ کفر و شرک کی نفرت ان کے دلوں میں بیٹھ چکی تھی، اور ایمان کی محبت اور ایثار کا مادہ ان کے اندر پیوست ہو چکا تھا عبادت کا ذوق ان پر غالب آ چکا تھا، خدمت خلق کا جذبہ ان کے اندر نمایاں تھا، ان کے اندر نفسیات کا کانٹا نکل چکا تھا، جب دنیا ان کے اندر سے بالکل ناپید ہو چکی تھی، جب جاہ کا خاتمہ ہو چکا تھا، صحابہ کرامؓ میں سے ایک ایک رسول اللہ ﷺ کے منصب تزکیہ کا زندہ ثبوت ہے۔

حضرت ضرار بن عمرو رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں کہتے ہیں کہ میں شرک کی حالت میں اس نیت سے نکلا کہ وہ کام کروں جو قریش نہیں کر سکتے، یعنی معاذ اللہ رسول اللہ ﷺ کے وجود گرامی پر دست درازی کروں، موقعہ اچھا تھا آپ تنہا طواف کر رہے تھے، میں نے بھی طواف کرنا شروع کر دیا اور اس فکر میں رہا کہ ذرا کچھ موقع ہو کہ آپ کا اور میرا سامنا ہو جائے تو میں اپنا کام کروں، آپؐ نے مجھ کو دیکھ کر بلایا، میں حاضر ہوا آپؐ ہنسے اور آپؐ نے میرے سینہ پر ہاتھ رکھا، خدا کی قسم آپؐ نے ہاتھ نہیں اٹھایا تھا کہ گویا سینہ کے اندر کی ساری آلائش نکل گئی، اس کے بعد وہاں سے گھر چلا آیا، ایک عورت جس کے یہاں جلسہ ہوا کرتا تھا اور محفل گرم ہوا کرتی تھی اور اس میں داستان آرائی و قصہ گوئی ہوتی تھی، میں رند مشرب تھا، اس عورت نے مجھے

دیکھا تو آواز دی، میں نے کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا، اب میں مسلمان ہو گیا ہوں" ایسی فوری تبدیلی کے واقعات بھی بہت ہیں۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ پر تین دور گذرے ہیں، ایک دور مجھ پر ایسا گذرا ہے کہ روئے زمین پر کوئی ہستی آپؐ سے بڑھ کر مبغوض نہ تھی معاذ اللہ اگر اس وقت مجھے موقع مل جاتا تو میں اپنی عاقبت خراب کر لیتا، اللہ نے فضل فرمایا، موقعہ ہی نہیں ملا، اس کے بعد دوسرا دور مجھ پر ایسا گزرا کہ روئے زمین پر کوئی ہستی آپ سے بڑھ کر محبوب نہیں تھی، خدا کی قسم میں آپ کو آنکھ بھر کر دیکھ بھی نہیں سکتا تھا، اگر مجھ سے کوئی حضور اکرم ﷺ کا حلیہ پوچھے تو میں بیان نہیں کر سکتا اس لئے کہ میری نظر آپ کے چہرہ مبارک پر جمتی ہی نہیں تھی اور مجھ میں آپؐ کو دیکھنے کی تاب ہی نہیں تھی، جب میں نے آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور بیعت کی تو میں اپنا ہاتھ نکالتا ہی نہیں تھا، آپؐ نے فرمایا میرا ہاتھ کیوں نہیں چھوڑتے؟ میں نے کہا یا رسول اللہ! فرمایئے کہ میرے گزشتہ گناہوں کا کیا ہو گا؟ میں تو بہت سیاہ کار انسان ہوں، آپؐ نے فرمایا کہ تم کو معلوم نہیں کہ اسلام اپنے ماقبل کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔

ایسے بہت سے واقعات ہیں، وحشیؓ جنہوں نے حضرت حمزہؓ بن عبد المطلب، اللہ کے شیر کو خود شہید کیا تھا اور ان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ آپ کو معلوم ہے، حضور ﷺ کے سامنے جب وہ آئے اور انہوں نے بیعت کا ارادہ کیا تو آپ نے ان کی بیعت قبول کی، انہوں نے کلمہ پڑھا اور ایمان لائے، آپؐ نے فرمایا وحشی! اگر تم میرے سامنے بار بار نہ آؤ تو اچھا ہو گا، اس لئے کہ مجھے اپنے چچا یاد آجاتے ہیں۔ یہ قدرتی بات

بھی ہے اور بہت لطیف جذبہ، احساس اور اعلیٰ درجہ کی انسانیت، لیکن انہوں نے جو کلمہ پڑھااور آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے، اس نے ان کے اندر ایسا انقلاب پیدا کر دیا، ایسی روحانیت پیدا کر دی جس پر آج بڑے بڑے اولیاء اللہ رشک کر رہے ہیں، یہی وحشی ہیں جنہوں نے مسیلمہ کذاب کو قتل کیا، میں جب اس واقعہ کو پڑھتا ہوں کہ حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کی بھی نگاہ انتخاب کو داد دینی چاہیئے کہ انہوں نے ایک ایسی ہستی سے اسلام اور مسلمانوں کو محروم کیا تھا جو اسلام کے لئے تقویت کا باعث تھی اور رسول اللہ ﷺ کو بہت محبوب تھی تو اس کی تلافی اور کفارہ کے لئے انہوں نے ایسی ہستی کا انتخاب کیا جو سب سے بڑھ کر حضور ﷺ کے نزدیک مبغوض تھی، ایک وہ شخص تھا جو نبوت کا بہت بڑا حامی اور مددگار تھا، پھر ایک شخص تھا جو اس نبوت کے مقابلے میں سینہ تان کر آیا تھا اور منصب نبوت کا گویا حریف اور رقیب تھا۔ انھوں نے کفارہ کے لئے جو بہترین انتخاب ہو سکتا تھا انتخاب کیا، یقیناً حضور ﷺ کی روح مبارک ان سے خوش ہوئی ہو گی، یہ سب ان کی ایمانی قوت کا نتیجہ ہے، یہ تو فوری انقلاب کی چند مثالیں ہیں، باقی صحابہ کرامؓ کے اندر جو تبدیلی تربیت اور صحبت سے پیدا ہوئی، اس سے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ گئے، اخلاقی پستی سے، اعمال کی پستی سے، عقائد کی تاریکی سے اور جاہلیت سے، روحانیت اور ایمان و اخلاق اور تربیت و علم کے بلند مقام تک پہنچ گئے۔

تعلیم کتاب

تیسرا شعبہ۔ کتاب و حکمت، یعنی کتاب کی تعلیم دینا، پہلے قاری تلاوت

کرتا ہے، پھر اس تزکیہ کا عمل کرتا ہے، اس میں قران مجید کی تفسیر اس کے حقائق کا بیان اس کے علوم کا اظہار اور مقاصد قرآن کی تشریح و تفصیل سب شامل ہے، یہ ہے **يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ** ''ان کو سکھاتے ہیں کتاب اور حکمت''۔

پھر اس کی بھی ضرورت ہے کہ قرآن مجید کے طالب علموں، اس کے حاملین اور سامعین میں تفقہ پیدا کیا جائے، یہ وہ چیز ہے جس کی طرف اشارہ ہے۔

مَنْ يرِدِ اللهُ بِهِ خَيْراً يفقهُ فِي الدِّين.

''اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے''۔

یہ درحقیقت حامل قرآن کے فرائض چہارگانہ اور حامل قرآن کی ذمہ داریاں اور اس کے کمالات اور اس کی سیرت ہے، اس کے بعد صحابہ کرام میں جو علماء تھے اور جن کے علم کی خود رسول اللہ ﷺ نے تعریف کی اور جن حضرات کی طرف رجوع ہونے کا مشورہ دیا۔ مثلاً حضرت ابی بن کعبؓ آپؐ نے ان کی بہت تعریف کی ہے اور ان کی خصوصیت بیان کی ہے کہ قرآن مجید سے ان کو خاص مناسبت تھی، حضرت زیدؓ بن ثابت کاتب وحی تھے، قرآن مجید کا بہت بڑا علم رکھتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے قرآن مجید پڑھنے کی تعریف آپؐ نے خود فرمائی تھی، حضرت علیؓ بن ابی طالب اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق آپ نے دعا فرمائی:

''اللهم علمه الكتاب وفقهه فی الدين''

''اے اللہ ان کو کتاب کا علم عطا فرما اور دین کی سمجھ دے''۔

یہ حضرات ان چاروں صفات کے جامع یعنی قرآن مجید کے قاری بھی تھے اور معلم الکتاب بھی تھے اور معلم حکمت بھی اور مزکی بھی تھے۔

پھر تابعین کا دور آیا اس دور میں بھی کثرت سے ایسے لوگ تھے جو ان چاروں چیزوں کے جامع تھے، مثال کے طور پر حضرت حسن بصریؒ کا نام لے سکتا ہوں کہ وہ ان چاروں شعبوں کے جامع تھے، اسی طرح سعید بن جبیر اور محمد بن سیرین اور حضرت سعید بن مسیّب، یہ وہ فضلائے تابعین تھے جو ان چاروں کمالات کے مظہر اور ان چاروں شعبوں کے جامع تھے، تبع تابعین میں بھی اسی طرح کی بے شمار ہستیاں پیدا ہوئیں جو ان چاروں چیزوں کی جامع تھیں۔ جیسے ائمہ اربعہ، محدثین، فقہاء اور صوفیاء، تابعین جیسے حضرت فضیل بن عیاضؒ، حضرت معروف کرخیؒ اور امام بن حنبلؒ اسی طرح سے جنید بغدادیؒ، یہ سب حضرات ان چاروں چیزوں کے جامع تھے۔

پھر انحطاط کا دوسرا دور شروع ہوا، شعبوں کی تقسیم ہونے لگی، نتیجہ یہ نکلا کہ امت میں مختلف گروہ بن گئے اور ایک ایک شعبہ سنبھال لیا، بعض نے تلاوت آیات کو اپنا شعار بنالیا، انھوں نے قرآن مجید کو حفظ کیا اور اس کی تجوید اور مخارج کی تصحیح کی، اور اتقان کے ساتھ پڑھنا انہوں نے اپنا فرض سمجھا، اللہ تعالیٰ امت کی طرف سے ان کو جزائے خیر دے کہ بہت بڑا فرض کفایہ ادا کیا اور قرآن مجید کے لطف اور طریقۂ ادا کو محفوظ کردیا جس طرح اس کے حروف کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے حضور ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جمع کیا تھا اور حضرت عثمان غنیؓ نے اس کی نقلیں کرا کے عالم اسلام میں بھیجی تھیں۔

بعض حضرات نے تعلیم کتاب و حکمت کو اپنا شعار بنایا۔ وہ علماء ظاہر کی جماعت ہے جنہوں نے قرآن وحدیث کے رموز کو بیان کیا، ان کے مضامین کی اشاعت کی اور ان کے مشکلات کی تشریح کی۔

تربیت وتزکیہ

بعض حضرات نے تزکیہ اپنے ذمہ لیا وہ حضرات صوفیائے کرام ہیں جنہوں نے اپنے مریدین کی اور جو لوگ ان کی طرف رجوع کرتے تھے، ان کے نفوس کی اصلاح و تربیت کا کام اپنے ذمہ لیا اور اس کو تہذیب واخلاق اور اصلاح باطن کا ایک فن بنادیا! ان حضرات کی تعداد خدا کے فضل سے اتنی بڑی ہے کہ ان کا ذکر کرنا مشکل ہے، مثال کے طور پر سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ بہاء الدین نقشبندی اور خواجہ معین الدین چشتی اور حضرت شہاب الدین سہروردی رحہم اللہ۔

تجدید سلوک

پھر ان کے بعد جنہوں نے فن سلوک کا کام کیا، اپنے زمانے کی پھیلی ہوئی بدعتوں کو اور تحریفات کو انہوں نے دور کیا اور اپنے زمانہ کی طبیعتوں کا لحاظ کر کے انہوں نے طب نبوی کی تجدید کی، ان میں سے خاص طور پر حضرت شیخ امام ربانی مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی، ان کے بعد شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ وہ حضرات ہیں جنہوں نے فن سلوک کی تجدید کا کام انجام دیا اور اپنے زمانے کے مطابق ان کو بنایا اور ان کے فائدہ کو عام کیا۔

حامل قرآن کی ذمہ داریاں

اصل میں حامل قرآن کا کام صرف تلاوت، اس کو پڑھ کر سنادینا، صحیح طور پر یاد

کر لینااور اس کو صحت کے ساتھ ادا کر دینااور کسی مجلس میں، کسی جلسہ میں قرآن مجید پڑھ دینا نہیں ہے، بلکہ حامل قرآن کی بہت بڑی ذمہ داری ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:-

''اس شخص کو عذاب دیا جائے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کا علم دیا وہ رات کو سویا رہا یہاں تک کہ صبح کی نماز قضا ہو گئی''۔

قرآن مجید کی بڑی ذمہ داری ہے، اس کو یاد کرنے کی اور اس کو یاد رکھنے کی، اس پر عمل کرنے کی، یہی وجہ تھی کہ جب جنگ یمامہ پیش آئی، جو اسلام کی شدید ترین جنگوں میں ایک جنگ ہے، جس میں زور کا رن پڑا اور گھمسان کی لڑائی ہوئی اور کشتوں کے پشتے لگ گئے، بس ایک موت کا بازار گرم تھا اور کسی طرح فیصلہ نہیں ہوتا تھا کہ میدان جنگ میں ایک صحابی نے للکارا اور کہا اے حاملین قرآن اور وہ لوگ جن کے سینوں میں قرآن ہے آج قرآن پر عمل کر کے دکھاؤ اور قرآن پر قربان ہو جاؤ، اس لئے کہ اگر یہ ارتداد کا فتنہ نہ ختم ہوا تو قرآن مجید کا باقی رہنا مشکل ہے، چنانچہ جو حفاظ تھے وہ آگے بڑھے اور فیصلہ کر لیا، بے جگری کے ساتھ لڑے اور پروانوں کی طرح نثار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ. (سورہ عبس)

معلوم ہوا کہ حاملین قرآن کی یہ تصویر ''کرام بررۃ'' ہونا چاہئے، حاملین قرآن کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فرشتوں کی صف ہے بلکہ معلوم ہوا کہ جو قرآن مجید کو اٹھانے اور سینے میں رکھنے کا حوصلہ کرے، اس کو ایسا بننا چاہئے۔

''لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ'' اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ اس قرآن مجید کو مطہر ہی

چھوئیں۔ صحابہ کرامؓ سے جو لوگ قرآن مجید کے حافظ ہوتے تھے اور جن میں قرآن مجید کا علم ہوتا تھا، وہ ممتاز اور اپنے اخلاق و تقویٰ اور عبادت میں دوسرے سے بڑھے ہوئے ہوتے تھے، اس لئے حضور ﷺ جب میدان احد میں شہداء کی لاشوں کو دفن کرنے لگے تو قرآن مجید جس کو زیادہ یاد ہوتا اس کو پہلی صف میں رکھتے جاتے اور فرمایا کرتے:

یؤمکم من أقرأکم. "امامت وہ کرے جو زیادہ پڑھا ہوا ہو"

تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خالی حافظ ہو، جس کو قرآن مجید کا علم زیادہ ہو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حفاظ کی بڑی ذمہ داری ہے۔

قرآن کی دولت سب سے بڑی دولت ہے

میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ یہ سوچ لیں کہ آپ کے سینہ میں اللہ کا کلام ہے، سر الٰہی ہے، علم الٰہی ہے، علم اعظم ہے، لوگ اسم اعظم کے پیچھے پڑتے ہیں، آپ کے سینہ میں علم اعظم ہے، اسی علم اعظم میں اسم اعظم بھی ہے، آپ تو حامل علم اعظم حامل اسم اعظم ہیں، رسول ﷺ نے قرآن کریم کی فضیلت میں فرمایا، ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ملیں گی، اور میں نہیں کہتا کہ "الم" ایک حرف بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے، میم ایک حرف ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: -خیرکم من تعلم القرآن وعلمه۔

دیکھ لیجئے قرآن مجید کے کیسے کیسے فضائل ہیں اگر حافظ تیس پارے پڑھے اور رمضان المبارک جیسے مقدس مہینہ میں پڑھے اور مسجد میں رمضان کی راتوں میں

پڑھے اور اس کے بعد سو دو سو پانچ سو روپیہ معاوضہ لے۔ حیرت کی بات ہے کیسے ایک انسان اس پر تیار ہو سکتا ہے۔ ایک بزرگ کا واقعہ ہے ایک روز بہت جوش میں آکر کہنے لگے خدا کی قسم اگر کوئی پورا ایک ملک پیش کرے اور کہے کہ پوری سلطنت لے لو اور ایک مرتبہ اللہ کہنے کا ثواب مجھے دے دو، واللہ میں راضی نہ ہوں گا اور ایک ایک حرف اللہ کا کلام ہے، اور اس عالم میں سب سے بڑی قیمتی چیز جس کا براہ راست اللہ سے تعلق ہے وہ قرآن مجید ہے اور جو سب سے بڑی دولت اس آسمان کے نیچے ہے وہ قرآن مجید ہے، اس لئے کہ یہ اللہ کی نسبت ہے، اللہ کا کلام ہے، اس کو کلام قدیم کہتے ہیں یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ متکلم ہے اور یہ اس کا کلام ہے، اس سے بڑھ کر تو کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی، اس لئے اپنی قدر خود کرنا چاہئے اور سمجھنا چاہئے کہ آپ کے پاس کیا دولت ہے اگر آپ کو پتہ چل جائے کہ آپ کے پاس کیا دولت ہے تو آپ کے قدم زمین پر نہ پڑیں، کسی امیر کی کسی دولت کی وقعت آپ کے دل میں نہیں ہو سکتی، اگر ہوتی تو ہزار بار استغفار کرتے ارے میرے دل میں، میرے سینے میں اللہ کا پورا کلام ہے اور میں اس تاجر کو اس وزیر کو معزز سمجھتا ہوں۔

حضرت حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے تھے کہ میرا دشمن میرا کیا بگاڑیں گے، میری جنت تو میرے سینہ میں ہے، وہ مجھ سے کیا چھین لیں گے میں تو اپنی جنت لئے پھر رہا ہوں اللہ کا کلام، اللہ کا علم میرے سینہ میں ہے، میرا باغ تو میرے ساتھ ہے، وہ مجھے کیا قید کریں گے، میں تو بالکل آزاد ہوں، جہاں بھی رہوں گا آزاد رہوں گا۔

روحانیت پیدا کرنے کے لئے عظمت اور اکتساب ضروری ہے

کیوں ایک شخص کے اندر اتنی روحانیت پیدا ہو جاتی ہے وہ اتنی ترقی کرتا ہے اور ایک شخص وہ ترقی نہیں کرتا، فرق صرف عظمت اور اکتساب کا ہے، کلام اپنی جگہ عظیم ہے، لیکن اس کی عظمت کا استحضار بھی ضروری ہے، شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی مثالوں کے بادشاہ تھے، عجیب عجیب مثالیں دیتے تھے اور اس کی مثال دینے لگے کہنے لگے کسی چیز کا ہونا اور چیز ہے اور اس کا علم حضوری اور چیز ہے، نواب محبوب علی خاں جو شاہ دکن تھے موجودہ نظام کے والد ان کی یہ عادت تھی کہ کبھی کبھی وہ بھیس بدل کر شہر میں گشت کیا کرتے تھے، تو ایک دن یونہی بھیس بدل کر شہر میں گشت کر رہے تھے، ایک تانگہ میں بیٹھ گئے، ان کے ساتھ دوسرے صاحب بھی تانگے میں بیٹھے چلے جا رہے تھے، دونوں بات کرنے لگے کہو بھائی! آج کل کیا خبر ہے؟ دوسرے صاحب یہ جان نہ سکے کہ یہ کون صاحب ہیں، انہوں نے کہا کہ آج کل گلی کوچہ محبوب علی خاں (جو ہمارے نواب صاحب ہیں) کے منھ پر ہر شخص تھوک رہا ہے اور انکو برا بھلا کہہ رہا ہے اور ایک قصہ جو اس زمانہ میں مشہور تھا وہ ذکر کر کے اس نے کہا آج کل یہ مشہور ہو رہا ہے کہ وہ یہ کہہ رہے ہیں اور جو منھ میں آیا کہنا شروع کیا، محبوب علی خاں وہیں بیٹھے رہے، اس کے بعد انہوں نے بیڑی نکالی اور کہا دیا سلائی ہے؟ اس نے کہا جی ہاں ہے، رات کا اندھیرا تھا اس نے جو ماچس جلائی تو پہچان لیا کہ

یہی محبوب علی خاں ہیں، بس اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور رعشہ پیدا ہو گیا انہوں نے کہا گھبراؤ نہیں۔

بزرگان دین چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے نتائج نکالتے ہیں انہوں نے کہا محبوب علی خاں تو وہی تھے جو آکر بیٹھے، اس وقت محبوب علی خاں صاحب تھے جب پوچھا تب بھی محبوب علی خاں تھے جب اس نے کہا تب بھی محبوب علی خاں تھے اور اس وقت جب ماچس جلائی اور منھ دیکھا تو محبوب علی خاں بدل گئے تو اس پر ہیبت کیوں طاری ہوئی، وجود پہلے سے تھا علم اب حاصل ہوا، حالت ہی بدل گئی تو وجود قرآن تو وہی ہے جو آج سے تیرہ سو سال پہلے تھا، جو آپ نے بچپن میں پڑھا، آپ نے جوانی میں پڑھا، جو آپ بڑھاپے میں پڑھ رہے ہیں یا پڑھیں گے، جو آپ تہجد میں پڑھتے ہیں جو آپ تلاوت کرتے ہیں، وہی قرآن مجید ہے، اس میں ایک نقطہ کا اضافہ نہیں، لیکن جو آپ کے اندر یہ بات پیدا ہو گئی کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور کس اللہ کا کلام جس کی صفت یہ ہے اور کون سا کلام جس کی یہ شان ہے اب آپ کی کیفیت اور یہ کیفیت ہو گئی۔

"اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ اس کو دیکھتے کہ اللہ کے خوف سے دب جاتا پھٹ جاتا"۔ (الحشر)

اللہ نے بہترین کلام نازل کیا ہے، ایک کتاب باہم ملتی جلتی ہوئی اور بار بار دہرائی ہوئی اس سے ان لوگوں کی جلد جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں کانپ اٹھتی ہے۔ پھر ان کی جلد اور ان کے قلب اللہ کے ذکر کے لئے نرم ہو جاتے ہیں۔

تو معلوم ہوا کہ دو چیزیں پیدا کرنا ہیں، ایک کلام اور صاحب کلام کی عظمت

دوسرے ثواب کی نیت اور ثواب کا یقین مل رہا ہے، بس یہ دو چیزیں ہیں جن کی وجہ سے ایک شخص اعلیٰ مقام ولایت تک پہونچ جاتا ہے۔

قرب الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ قرآن کریم ہے

بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ سلوک کا آخری درجہ قرآن ہے، اور نوافل میں قرآن مجید پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے، جب سالک تمام مقامات طے کرلیتا ہے، جو ذکر سے طے ہوتے ہیں، اس کے بعد جو آخری درجہ قربِ الٰہی کا وہ کلامِ الٰہی کی کثرتِ تلاوت سے حاصل ہوتا ہے، حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی فرماتے ہیں کہ جو قرب قرأت قرآن کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اس قرب کو کوئی نہیں پہونچ سکتا، اور یہ قرب استحضار سے، عظمت سے اور ثواب کے یقین سے حاصل ہوتا ہے، پڑھتے جایئے اور یقین کرتے جایئے کہ ثواب مل رہا ہے، ہر حرف ہر سطر پر دس دس نیکیاں مل رہی ہیں، اس کا شوق آپ کے دل میں زیادہ ہونا چاہیئے، جتنا زیادہ پڑھیں گے اتنی زیادہ نیکیاں ملیں گی، بس بھائیوں اگر اپنے اندر یہ صفت پیدا کرلیں تو قرآن مجید کی تلاوت میں روح پیدا ہو جائے۔

قرآن کو بطور پیشہ پڑھنا گناہ ہے

اور اگر اس کو پیشہ بنائیں تو اس سے بہت اچھا ہے کہ دنیا کو آدمی کا ذریعہ بنائے کسب معاش کا، قیامت کے دن وہ لوگ جو حلال روزی حاصل کرتے ہیں اور جائز طریقوں سے کاروبار کرتے تھے، ان دیندار قاریوں، حافظوں اور عالموں سے بدرجہا

آگے ہوں گے، جنہوں نے دین کو ذریعہ بنالیا تھا اپنا پیٹ بھرنے کا اور دنیا کمانے کا، تاجروں میں بکثرت اولیاء اللہ نکلیں گے، جو سمجھتے تھے ہم دنیادار ہیں صرف بچوں کے لئے پالنے اور اپنے پیٹ کے لئے ایک دھندہ کیا ہے اور اس میں ذکر کرتے تھے، نماز پڑھتے تھے، ڈرتے رہتے تھے، استغفار کرتے رہتے تھے، وہ کئی عالموں اور حافظوں سے بڑھ کر نکلیں گے جنہوں نے قرآن مجید کو اور علم حدیث کو صرف دُنیا کمانے کا ذریعہ بنایا۔

قرآن سے فائدہ حاصل کرنے کیلئے صحبت اور محنت ضروری ہے

اللہ تعالیٰ نے جہاں آپ کو یہ دولت عطا فرمائی ہے، تو اس میں روح بھی، خشیت بھی اور تقویٰ بھی پیدا کرنے کی کوشش کریں اور یہ بات بغیر صحبت کے اور بغیر محنت کے حاصل نہیں ہوتی، قرآن مجید کے یاد کرنے میں، جان ڈالنے میں اور موزونیت پیدا کرنے کے لئے بھی آپ کو محنت کرنی چاہئے، اگر آپ نے قرآن مجید کو یاد کرنے میں دو برس لگائے تو سچی بات یہ کہ اس میں چار برس لگائیے، اس لئے کہ وہ تو الفاظ ہیں جس کو کافر و مومن سب پڑھ سکتے ہیں اور بے شک کافر کو یاد ہونا مشکل ہے، لیکن یاد ہوتا ہے، اب بھی مصر و شام میں کتنے غیر مسلم ایسے ہیں جن کو قرآن مجید یاد ہے، المنجد، کا مصنف جو عیسائی تھا وہ حافظ تھا، تو معانی قرآن، علوم قرآن اور قرآن مجید کو دل میں راسخ کرنے کے لئے، اپنے اخلاق کو صحیح کرنے کے لئے آپ کو وقت لگانے اور محنت کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک مرتبہ میں حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھا ہوا جا رہا تھا، میں نے عرض کیا کہ حضرت اس سفر میں قرآن مجید میں جو بات حاصل ہوتی ہے اور سمجھ میں آتی ہے وہ گھر پر نہیں آتی تو حضرت بہت خوش ہوئے اور دوسروں کو مخاطب کیا کہ دیکھو مولانا کیا کہہ رہے ہیں، یہی سچی بات ہے۔

میدان جہاد میں جن لوگوں نے قرآن مجید کو سمجھا تھا اور خدمت کے میدانوں میں جنہوں نے قرآن مجید کو سمجھا تھا اور محنت کے میدانوں میں جنہوں نے قرآن مجید کو سمجھا تھا ان کی سمجھ تو ہمارے یہاں قرآن مجید پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

قرآن مجید سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو قرآن مجید کی تعظیم کرنے کی، اس پر عمل کرنے کی اور اس کا لطف لینے کی اور اس سے قرب حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے...... آمین۔(۱)

---

(۱) (بانگ درا لکھنؤ مارچ ۱۹۹۹ء)

باب ۹

نبیٔ رحمت اور مقدس مقامات

"نظام عالم نہ حکومتوں سے مربوط ہے نہ تنظیمات سے، نہ فوجی طاقت سے...... نہ اخلاقی فلسفوں اور تہذیبوں اور علمی مرکزوں سے مربوط ہے۔ نظام عالم (جہاں تک ہماری نگاہیں نہیں پہونچ سکتیں) بیت اللہ شریف سے اور اس دعوت سے مربوط ہے جس کے لئے بیت اللہ قائم ہوا...... جس کے داعی اول سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور جس کے مجدد وخاتم اور مکمل ومحافظ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور جن کی نمائندگی بیت اللہ شریف اور مسجد نبوی کرتی ہے۔"

(حضرت مولانا علی میاں ندوی مدظلہ العالی)

سب سے زیادہ پیارا لفظ

"وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ." -الانبیاء-۱۰۷

اس آسمان کے شامیانے کے نیچے، زمین کے فرش پر، آفتاب کو قندیل بنا کر، چاند کو شمع بنا کر ایک سوال کیا جائے کہ بتاؤ سب سے زیادہ پیارا لفظ کون سا ہے تو میں سمجھتا ہوں اور دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سب کی طرف سے جواب ہوگا کہ "رحم"۔

ایک چیز جس کا دنیا میں کوئی شاکی نہیں، کوئی اس کا فریادی نہیں، کوئی اس پر تنقید کرنے والا نہیں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کا مارا ہوا ہوں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کا زخمی ہوں۔

وہ ہے صرف رحم دل، وہ ہے صرف رحم۔

رحم کا ہر ایک محتاج ہے

کون ہے دُنیا میں جو آج بتادے، مخالفوں میں بتادے، ہمنواؤں میں بتادے، فاتحوں اور مفتوحوں میں بتادے، جاہلوں اور عالموں میں بتادے، غنی اور ذہین انسانوں میں بتادے، پسماندہ اور ترقی یافتہ قوموں میں بتادے؟ کہ اس کو رحم کی ضرورت نہیں، اس کو رحم سے انکار ہے، اس کو رحمت نہیں چاہئے؟ ایسا وقت آتا ہے کہ آدمی کو طاقت کی ضرورت نہیں ہوتی، علم کی

ضرورت نہیں رہتی، لیکن کوئی ایسا وقت نہیں کہ جس میں آدمی کو رحم کی ضرورت نہ ہو، رحمت کی ضرورت نہ ہو، رحم کا ہر ایک محتاج، ہر ایک قدر دان۔

کس چیز کی کمی ہے مولیٰ تیری گلی میں......

اللہ تعالیٰ کے خزانے میں کسی چیز کی کمی نہیں، کیا اللہ تعالیٰ نہیں کہہ سکتا تھا کہ "آپ کو ہم نے دنیا کا فاتح بنا کر بھیجا۔" ایسا فاتح جس کے غلاموں نے دنیا کا سب سے بڑا امپائر قائم کیا، انھوں نے مشرق و مغرب، جنوب و شمال میں اپنی کامیابی کے پرچم لہرا دیئے، ان کی حکومت کا جھنڈا چاہے نہ لہراتا ہو، سکّہ چاہے نہ چلتا ہو لیکن غلامانِ محمدؐ کے محبت کے قلمرو میں ساری دنیا شامل تھی۔"

"جو دلوں کو فتح کرلے، وہی فاتحِ زمانہ"

جو تہذیب انھوں نے پھیلائی، جو علوم انھوں نے پیدا کیے، علم کے جو دریا بہائے، محبت کے جو چشمے رواں کیے، اس کے بعد آپؐ کو انسانیت کا سب سے بڑا فاتح، سب سے بڑا معلمِ اخلاق، سب سے بڑا معلم کہنا بالکل صحیح ہے، اگر خدا یہ کہتا ہے کہ اے محمد ﷺ ہم نے آپ کو دنیا کا مصلح اور معلم بنا کر بھیجا تو دنیا کے گوشے سے یہ آواز نہیں اٹھتی کہ "ہمیں اس میں شک ہے" ساری دنیا کے علماء فضلاء، فلاسفہ، مفکرین، مؤرخین، ناقدین سر جھکا کر کہتے کہ آمنا و صدقنا، بے شک آپ دنیا کے سب سے بڑے معلم اور سب سے بڑے مصلح ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرما سکتا تھا "وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا مُعَلِّماً لِّلْعٰلَمِيْنَ" ہم نے آپ کو سارے جہانوں کا معلم اور مصلح بنا کر بھیجا، اس طریقہ سے اور بہت سی صفات ہو سکتی تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی صفات اور اس سے جو کام لینا ہے اس کی حقیقت جس لفظ میں سمیٹ کر آ سکتی ہے وہ استعمال فرماتا ہے۔ "وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ."

صفت رحمت، اللہ تعالیٰ کی محبوب صفت ہے، سورہ فاتحہ کا آغاز بھی اس نے اپنی اسی

صفت سے کیا ہے، بسم اللہ میں بھی یہی صفت غالب ہے، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، اَلْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ..........................

...... قرآن مجید میں ہے "رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ" (میری رحمت سب پر حاوی ہے) دنیا کے رسول ﷺ کے دامن سے جو کچھ ملا، جو انعام ملا، جو تحفہ ملا، جو زندگی ملی، اس کے لئے اس سے بہتر کوئی لفظ نہیں ہو سکتا تھا، "وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ."

سب سے اہم، سب سے بنیادی، سب سے عزیز، سب سے محبوب، سب سے زیادہ فراوانی کے ساتھ جو چیز ہر برادری، ہر طبقہ، ہر ملک، ہر قوم کو پوری فیاضی سے رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ملی وہ ہے "رحمت" آپ کے ذریعہ اللہ کی رحمت کے دروازے کھل گئے، ساری نسل انسانی ہری ہو گئی ۔

رہے اس سے محروم، آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

مردوں پر آپؐ نے احسان کیا، عورتوں پر آپ نے احسان کیا، غلاموں پر آپ نے احسان کیا، غریبوں پر آپ نے احسان کیا، جانوروں پر تک آپ نے احسان کیا، اگر ان احسانات کا ذکر کروں تو پوری رات گذر جائے، قرآن مجید اور سیرت کی کتابوں کا آپ مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ آپؐ کی شفقت واحسان سے ہر طبقہ زیر بار ہے۔

اس سے بڑھکر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب

جس نے ظلم کرنے سے روکا، مزدور کو پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری دینے کا حکم دیا، جس نے سچے تاجر کو پیغمروں کے قرب کی شہادت دی، جس نے یتیم کی پرورش کرنے والے کی فضیلت بیان کی، جس نے عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کی ہدایت فرمائی، جس نے غلاموں کو آقا کا ہمسر بنایا، جس نے رنگ و نسل کے امتیاز کو ختم کیا، جس نے قیدیوں کے

ساتھ رحم کا معاملہ فرمایا، وہی ہے رحمتِ عالمؐ، اس کا پرتو زندگی کے ہر شعبہ میں آپ کو نظر آئے گا، فوجیوں کو ہدایت کی کہ زخمیوں کا کام تمام نہ کرنا، عابدوں زاہدوں پر ہاتھ نہ اٹھانا، عورتوں اور بچوں کو ایذا نہ پہونچانا، پھلدار درختوں اور ہرے بھرے کھیتوں کو نہ اجاڑنا، کسی بھی قوم کی عبادت گاہ کو نقصان نہ پہونچانا۔

وہ تو سراپا رحمت ہے، اس وقت کی دنیا اور موجودہ نسل انسانی آپ کو خدا کا پیغمبر مانے یا نہ مانے، لیکن سب کے سب آپ کے احسان کے سائے تلے ہیں، سب آپ کے احسانات کے مقروض ہیں، چھٹی صدی مسیحی میں پوری نسلِ انسانی اپنی افادیت کھو چکی تھی، انسانوں سے آباد ملک، جانوروں کے جنگل بن گئے تھے، بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل رہی تھی، طاقتور کمزور کو کھا رہا تھا، عام انسان غلامی کے لئے اور شہنشاہ اور امراء عیش و عشرت کے لئے زندہ تھے، آپ ''تاریخ زوالِ روما'' پڑھیے، آپ ''تاریخ اخلاق یورپ'' پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ ظلم و سفاکی اور عیش و عشرت کے کیا نقشے تھے، امیروں کی دعوت میں رات کے وقت غریبوں کے جسموں سے چراغاں ہوتا تھا، انسانوں کے جسم کی مشعلیں جلتی تھیں، چند امیر لذتِ کام و دہن میں مصروف رہتے تو چند غریب انسان جل جل کر، تڑپ تڑپ کر وہیں دم توڑتے، ہماری اس دنیا میں ظلم کی کیسی کیسی داستانیں، کیسے کیسے واقعات ہوئے، کوئی سکندؔر اور سیزر بن کر دنیا کو تہہ تیغ کر رہا تھا، کوئی نیرؔو کے روپ میں روم کو آگ لگا رہا تھا، ہوس ملک گیری میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کبڈّی کھیلی جا رہی تھی، دنیا نے خدا کے دربار میں نالش کر دی تھی کہ ہمیں ختم کر دیا جائے، وہ زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ ہماری اب ضرورت نہیں، ہم وحشی بن گئے ہیں، خدا کو سب بھلائے ہوئے تھے، انسان انسان کا معبود بن گیا تھا، ساری دنیا میں فساد عام تھا، بڑی بات یہ تھی کہ برائیوں کو ہنر سمجھا جا رہا تھا، جیسا کہ ہمارے عزیز مولوی اسحاق جلیسؔ صاحب نے کہا، برائیاں تو ہر زمانے میں رہی ہیں، لیکن یہ دور ایسا تھا کہ برائیوں

سے لڑنے والا، ان سے پنجہ آزمائی کرنے والا کوئی نہیں تھا، بے شک شاعری تھی، ذہانت تھی، ایران میں بڑے بڑے پہلوان تھے، لیکن برائی کی کلائی موڑنے والا کوئی نہیں تھا، ہر شخص پر مایوسی طاری تھی، یہ دنیا کسی کی بات ماننے والی نہیں تھی، یہ آسانی سے برائی چھوڑنے کو تیار نہیں تھی، بادشاہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے، فلسفی کسی کو وقعت نہ دیتے، شاعر کسی کا نام نہ لیتے، سب سہمے ہوئے تھے، ڈرے ہوئے تھے، ایسے ٹھٹھرے ہوئے تھے گویا برف اور سخت سردی پڑ رہی ہو کہ رحمتِ الٰہی کو جوش آیا ؎

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا

دعائے خلیلؑ اور نوید مسیحاؑ

وہ نبی رحمت تشریف لائے جن کو قرآن مجید نے کہا:

"وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ."

رحمۃ للعالمین ﷺ

"وَمَا أَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ."

مگر نہ آیا کوئی رحمت عالم بنکر

میں نے آپ کے سامنے سورہ انبیاء کی ایک آیت پڑھی ہے، اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے ارشاد فرماتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ (ﷺ) "ہم نے آپ کو سارے جہاں اور سارے جہان والوں کے لئے محض رحمت بنا کر بھیجا ہے" یہ خدا کی طرف سے ایک حیرت انگیز (اور اگر رحمت کی روح اور مفہوم کے منافی نہ ہوتا تو میں کہتا کہ) ایک تہلکہ خیز اعلان ہے، یہ اعلان اس صحیفہ میں کیا گیا ہے، جس کے لئے تقدیر الٰہی کا فیصلہ تھا کہ وہ دنیا کے ہر حصہ میں (اور اپنے نزول کے بعد) تاریخ انسانی کے ہر دور میں پڑھا جائے گا، اس کے پڑھنے والے بھی لاکھوں کروڑوں انسان ہوں گے، اس پر غور کرنے والے، اس کی تشریح کرنے والے، اس کے اسرار اور رموز بیان کرنے والے، اس کے ایک ایک لفظ، بلکہ ایک ایک حرف کی تحقیق کرنے والے، اس کو تنقید اور شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے والے، اور اس کو علم و تحقیق کی ترازو میں تولنے، اور اس کو واقعات کی کسوٹی پر کسنے والے انسانوں کا سلسلہ بھی قیامت تک ختم نہیں ہوگا، ایک شخص ایک بیان جاری کرتا ہے، کئی مضمون نگار کسی اخبار یا

رسالہ میں (جس کی زندگی عام طور پر مختصر اور پڑھنے والوں کا حلقہ اکثر محدود ہوتا ہے) کوئی مضمون لکھتا ہے، تو...... اسکو اس اندیشہ سے کئی کئی بار غور کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ ترازو میں تول تول کر کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ کوئی اس کی تردید نہ کردے، اور اس کی صداقت کو چیلنج نہ کردے، کتابوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے کہ ان کی عمریں عام طور پر اخبارات ورسائل سے زیادہ طویل ہوتی ہیں، اور بعض اوقات سالہا سال تک وہ لوگوں کے مطالعہ میں رہتی ہیں اور کوئی کوئی کتاب صدیوں تک بھی زندہ رہتی ہے اس میں کسی بات کو درج یا کسی چیز کا دعویٰ کرتے ہوئے مصنف کو اپنی ذمہ داری کا زیادہ احساس ہوتا ہے، وہ لکھنے کیلئے قلم اٹھاتا ہے تو اس کو پہلے کسوٹی پر کستا ہے، اور دیکھتا ہے کہ اس دعویٰ یا اعلان کا پڑھنے اور سننے والوں پر کیا ردِ عمل ہوگا، اس کے بعد غور کیجئے کہ خدائے عالم الغیوب ایک ایسی کتاب میں یہ اعلان کرتا ہے کہ جس کے متعلق وہ خود ہی کہتا ہے کہ:-

لَايَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَامِنْ خَلْفِهٖ، تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ. (حٰم سجدہ: ۴۲)

اس پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے (اور) دانا (اور) خوبیوں والے خدا کی اتاری ہوئی ہے۔

اور جس کے متعلق اس کا اعلان ہے کہ:-

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ. (الحجر:۹)

بے شک یہ (کتاب) نصیحت ہمیں نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی

اس اعلان کی وسعت و عظمت اس کے زمانی و مکانی رقبہ کا طول و عرض دونوں ایسی غیر معمولی باتیں ہیں جن سے سرسری طور پر گزرا نہیں جاسکتا۔

زمانی رقبہ سے مراد یہ ہے کہ بعثت محمدی سے لیکر قیامت تک جتنی نسلیں دنیا میں آئیں گی اور تاریخ کے جتنے دور گزریں گے یہ اعلان ان سب پر حاوی ہے اور یہ آیت اس پورے زمانی رقبہ کو جو ہزاروں سال پر پھیلا ہوا ہے۔ گھیرتی (Cover) کرتی ہے۔

مکانی رقبہ کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ دنیا کا کوئی گوشہ بھی اس سے مستثنٰی نہیں کیا گیا، یہ نہیں کہا گیا کہ ہم نے آپ کو جزیرۃ العرب کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے، یا مشرق کے لئے یا کسی براعظم مثلاً ایشیا کے لئے پیام رحمت بنایا ہے، اس کے برخلاف یہ کہا گیا ہے کہ یہ رحمت ساری دنیا پر محیط ہے گویا اردو کے شاعر حالؔی کی زبان میں ؂

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

واقعہ یہ ہے کہ اس اعلان کی وسعت، عمومیت، عظمت اور لا محدودیت کے سامنے دنیا کے سارے مؤرخین، فلاسفہ، مفکرین، مصنفین بلکہ پورے فکر انسانی کو انگشت بدنداں، حیرت زدہ اور ششدر ہو کر کھڑا ہو جانا چاہئے، اور ایک بار سب کام چھوڑ کر اس واقعہ کی تصدیق اور اس اعلان کی صداقت کی تحقیق میں مصروف ہو جانا چاہئے، مذاہب ہی کی تاریخ میں نہیں، تمدنوں اور فلسفوں ہی کی تاریخ میں نہیں، اصلاحی اور انقلابی تحریکوں اور کوششوں ہی کی تاریخ میں نہیں بلکہ پوری تاریخ انسانی اور پورے انسانی لٹریچر میں ایسا پر از اعتماد، ایسا واضح اور بے لاگ، ایسا عمومی و عالمگیر اعلان، کسی شخصیت یا کسی مذہب و دعوت کے متعلق نہیں ملتا، مذاہب عالم کی تاریخیں، انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں اور تعلیمات کا جو ریکارڈ دنیا میں محفوظ ہے وہ بھی اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

’’رحمت‘‘ ہماری روزمرہ زندگی کا ایک کثیر الاستعمال لفظ ہے

کسی چیز کی اہمیت و عظمت اور قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لئے عام طور پر دو پیمانے

ہوتے ہیں ایک اس کی تعداد اور مقدار جس کو ہم جدید علمی اصطلاح میں "کمیّت" یا QUANTITY کے لفظ سے ادا کرتے ہیں، اور ایک کسی شئ کا جوہر یا صفت ہے جس کو اصطلاحاً "کیفیت" (QUALITY) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ قرآنی اعلان جو محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق کیا گیا ہے ان دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہے، یعنی آپ کی بعثت ونبوت، آپ کے وجود گرامی، اور آپ کی تعلیمات سے انسانیت کو جو فیض پہنچا۔ اس کو حیات نو کا جو پیغام ملا اور اس کی بیماریوں کا جو مداوا، اس کے مصائب کا جو خاتمہ ہوا اس پر رحمتوں اور برکتوں کا جو دروازہ کھلا وہ اپنی وسعت وکثرت اپنی مقدار وکمیت (QUANTITY) کے اعتبار سے بھی اور اپنی نوعیت وافادیت، اپنے جوہر وکیفیت (QUALITY) کے اعتبار سے بھی بے نظیر وبے مثال ہے۔ "رحمت" ہماری روزمرہ زندگی کا ایک کثیر الاستعمال لفظ ہے۔ اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جس سے کسی انسان کو فائدہ یا راحت حاصل ہو، اس کے انواع واقسام اور اس کے مراتب ودرجات کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اگر کوئی کسی کو پانی پلادیتا ہے تو وہ بھی ایک طرح کی "رحمت" ہے، اگر کوئی کسی کو راستہ بتادیتا ہے تو وہ بھی ایک طرح کی "رحمت" ہے، اگر گرمی میں کوئی کسی کو پنکھا جھل دیتا ہے تو وہ بھی ایک طرح کی "رحمت" ہے۔ ماں اپنے بچہ کو پیار کرتی ہے، باپ اپنے لڑکے کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرتا ہے اور اس کے لئے زندگی کا ضروری سامان مہیا کرتا ہے، وہ اس سے بھی بڑی ایک "رحمت" ہے، استاذ طالب علم کو پڑھاتا ہے، اس کو علم کی نعمت بخشتا ہے، یہ بھی ایک بڑی قابل قدر "رحمت" ہے، بھوکے کو کھانا کھلانا، ننگے کو کپڑا پہنانا سب "رحمت" کے مظاہر ہیں اور سب کا اعتراف ضروری اور شکریہ واجب ہے۔

رحمت کا مظہر

لیکن "رحمت" کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ کسی جاں بلب مریض کی جان بچالی جائے۔ ایک بچہ دم توڑ رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب آخری ہچکی لے گا، ماں رورہی

ہے کہ میرا لال دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔اس سے کچھ نہیں ہو سکتا، باپ مارا مارا پھر رہا ہے، اور سر پھوڑ رہا ہے، سب بے بس معلوم ہوتے ہیں کہ اچانک ایک طبیب حاذق فرشتۂ رحمت بن کر پہنچتا ہے اور کہتا ہے، گھبرانے کی کوئی بات نہیں! وہ دوا کا ایک قطرہ بچہ کے حلق میں ٹپکاتا ہے، وہ آنکھیں کھول دیتا ہے سب اس کو خدا کا بھیجا ہوا فرشتہ کہیں گے اور وہ ساری رحمتیں جن کا میں نے نام لیا۔اس "رحمت" کے سامنے مات ہو جائیں گی، اس لئے کہ یہ اس مریض ہی پر نہیں، بلکہ اس کے چھوٹے سے کنبہ اور اس سے محبت کرنے والوں پر بھی احسان عظیم ہے کہ اس کی جان بچائی گئی، کوئی نابینا چلا آرہا ہے راستہ میں کوئی خندق یا کوئی کنواں پڑ گیا قریب ہے کہ اس کا اگلا قدم اسی خندق یا کنویں میں ہو، اللہ کا ایک بندہ عین وقت پر پہنچتا ہے اور وہ اس کی کمر پکڑ لیتا ہے اور اس کو اس خندق میں گرنے سے بچا لیتا ہے تو وہ اس کے حق میں فرشتہ کہلائے گا۔ایک نوجوان جو اپنے باپ کی آنکھ کا تارا اور اپنے کنبہ کا سہارا ہے دریا میں ڈوبنے لگا وہ غوطے کھا رہا ہے کوئی گھڑی ہے کہ وہ تہ نشین ہو جائے، ایسے میں کوئی اللہ کا بندہ اپنی جان پر کھیل کر کود پڑتا ہے اور اس کی جان بچا لیتا ہے، اس کے ماں باپ اور بھائی فرطِ مسرت اور احسان مندی کے جذبہ سے اس سے لپٹ جاتے ہیں اور ساری عمر اس کا احسان نہیں بھولتے۔

لیکن "رحمت" کا آخری مظہر یہ ہے کہ پوری انسانیت کو ہلاکت سے بچایا جائے، پھر ہلاکت ہلاکت اور خطرہ خطرہ میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے، ایک عارضی ہلاکت اور تھوڑی دیر کا خطرہ ہے، ایک ابدی ہلاکت اور دائمی خطرہ ہے، خدا کے پیغمبر انسانوں کیساتھ "رحمت" کا جو معاملہ کرتے ہیں وہ ان رحمتوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، یہ زندگی کا موج سمندر، یہ زندگی کا طوفانی دریا، جو انسانوں اور افراد ہی کو نہیں، قوموں اور ملکوں کو غرق کر چکا ہے، تہذیبوں اور تمدنوں کو لقمۂ اجل بنا چکا ہے جس کی موجیں نہنگوں کی طرح منھ پھیلا کر بڑھتی اور بپھرے

ہوئے شیر کی طرح انسانوں پر حملہ کرتی ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ کہ اس بے رحم دریا سے کس طرح پار اترا جائے اور انسانی قافلہ کو ساحل مراد بلکہ ساحل نجات پر پہنچایا جائے، نوع انسانی کا سب سے بڑا محسن اور اس کا نجات دہندہ وہ قرار پائے گا جو انسانی کشتی کو جو ڈانواڈول ہو رہی ہے، جس کے سوار موجود ہیں لیکن ملاح مفقود، ساحل تک پہنچادے۔ نوع انسانی ان کی بھی شکر گزار ہے جو اس کو علم و فن کا تحفہ دیتے ہیں وہ ان کی بھی شکر گزار ہے جو اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں وہ ان کی بھی شکر گزار ہے جنھوں نے اس کی زندگی کو پُر راحت بنایا اور اس کی زندگی کی مشکلات کو ختم یا کم کیا۔ وہ کسی کے احسان کی ناقدری نہیں کرتی، لیکن اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کو دشمنوں سے بچایا جائے جو اس کی جان کے دشمن ہیں اور اس کی کشتی پار لگائی جائے............

پس جاہلیت کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ پوری زندگی کی چول اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی بلکہ ٹوٹ گئی تھی، انسان نہیں رہا تھا، انسانیت کا مقدمہ اپنے آخری مرحلہ میں خدا کی عدالت میں پیش تھا، انسان اپنے خلاف گواہی دے چکا تھا اس حالت میں خدا نے محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا اور ارشاد ہوا:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلعَالَمِيْنَ. اور (اے محمدؐ) ہم نے تم کو تمام جہاں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔ (سورہ انبیاء) (۱)

آئے دنیا میں بہت پاک مکرم بن کر
مگر نہ آیا کوئی رحمت عالم بن کر

---

(۱) محسن عالم ﷺ ص ۵ تا ص ۲۳ باختصار ماخوذ ہے۔

مخلوق کے ساتھ نبی رحمت ﷺ کی غیر معمولی شفقت

لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ رَّحِيْم فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْم. (التوبہ: ۱۲۸)

"(اے لوگو!) تمھارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمھاری جنس سے ہیں، جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں۔ (یہ حالت تو سب کے ساتھ ہے بالخصوص) ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں۔"

رحمت بھی عربی کا لفظ ہے۔ اور رحم بھی عربی کا لفظ ہے لیکن ارد میں رحم کا لفظ زیادہ استعمال ہوتا ہے، رحمت اور رحم کے معنی ہیں ترس کھانا، دوسرے کی مدد کرنا اور دوسرے کی تکلیف کو محسوس کرنا، اس کی تکلیف سے انسان کو تکلیف ہونا اور اس کی تکلیف کو دور کرنے کی خواہش اور کوشش کرنا۔ یہ معنی ہیں رحم اور رحمت کے۔ یہ اچھے انسان کی فطرت ہے۔ اگرچہ یہ اللہ کی صفت ہے وہ ارحم الراحمین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ صفت درجہ بدرجہ انسانوں کو عطا فرمائی

ہے اس کا سب سے بڑا حصہ اس نے اپنے پیغمبر رسول پاک رحمۃ للعالمین ﷺ کو عطا کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَقَدْ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ.

اے ایمان والو تمہارے پاس ایک ایسا پیغمبر آیا ہے جس بات سے تم کو تکلیف ہو اس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے، تمھاری اس کو بڑی فکر ہے۔ ایمان والوں کے ساتھ بہت ہی مہربان بہت ہی شفقت والے۔

اگر تمھارے پاؤں میں کانٹا لگ جائے تو اس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ جس سے تم مشکل میں پڑو دشواری میں پڑو وہ اس کو شاق ہے وہ اس کو پسند نہیں حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ تمھاری اس کو بڑی فکر ہے، اس کو تمھارا بڑا دھیان ہے۔ ایمان والوں کے ساتھ بہت ہی مہربان بہت ہی شفقت والے۔

ہم کو اور آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں ماں باپ سے بڑھ کر کسی اور کی شفقت نہیں، ماں کی مامتا دنیا میں ضرب المثل ہے، اگر کوئی عورت، اگر کوئی انسانی ہستی اگر دنیا کی کوئی بھی مخلوق ماں کی محبت سے بڑھ کر دعویٰ کرے تو سب اس کو جھوٹا کہتے ہیں، جھوٹا سمجھتے ہیں اور اس پر اعتماد نہیں کرتے، اور اس کو بناوٹ، نفاق اور جھوٹا دعویٰ سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بچے کی محبت ماں کے دل میں ڈال دی ہے۔ جب سے یہ نظام عالم قائم ہے، یہ محبت رہی ہے۔ اس نظام عالم میں جسمانی پرورش کا نظام ایک خاص اسٹیج پر چل رہا ہے۔ جس طریقے سے ہمارا یہ جسمانی نظام چل رہا ہے اسی طرح سے روحانی اخلاقی تربیت کا نظام پیغمبروں سے وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی محبت اور شفقت عطا فرمائی ہے کہ اس محبت اور شفقت کے سامنے ماں باپ کی محبت سچ پوچھیے تو گرد ہے، ماند ہے، ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ پیغمبروں کے دل میں اپنی امت کی کس درجہ محبت اور شفقت ہوتی ہے۔ وہ کس طرح سے ان کے دل کی تکلیف کو

محسوس کرتے ہیں۔ ان کے پاؤں میں، ان کے تلوے میں کانٹا چبھتا ہے، انگلی میں ان کے جسم کے کسی حصہ میں پھانس لگتی ہے تو اس کی خلش وہ سارے جسم میں محسوس کرتے ہیں۔ اپنے امتی کے ساتھ ان کا کیسا تعلق ہوتا ہے، اس کا اندازہ کرنا ہمارے لئے مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: میں نے جو آپ کے سامنے آیت پڑھی آپ کو مسلمانوں کی حیثیت سے اور اگر اللہ تعالیٰ نے ہم کو علم دیا ہے سیرت کا، آنحضرتؐ کے حالات سے ہم کو تھوڑی واقفیت ہے تو ہم اس کی لفظ بہ لفظ نہیں، حرف بہ حرف نہیں بلکہ نقطہ بہ نقطہ تصدیق کریں گے۔ لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ. فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ.

(ایسا پیغمبر آیا ہے جو تمھیں میں سے ہے اور اگر وہ ہم میں سے نہیں ہوتا تو اس کو ہمارے درد و دکھ کا احساس نہ ہوتا، ہماری مشکلات کو وہ نہ جانتا، اسے جانتا بھی تو اس مشکل میں شریک نہ ہوتا۔ انسان کا درد انسان محسوس کرتا ہے، بھائی کی تکلیف بھائی محسوس کرتا ہے۔ ایک گاؤں کے رہنے والے، ایک دوسرے کے دکھ درد کو جانتے ہیں، ایک گاؤں کے لوگ بعض اوقات ایک دوسرے کی مشکلات کو نہیں سمجھتے، ریاست، صوبہ، ملک تو بڑی چیز ہیں اور دنیا تو بعد میں بنتی ہے ایک چھوٹے سے گاؤں کے لوگ بھی بسا اوقات ایک دوسرے کی مشکلات کو نہیں سمجھتے، تمھارے پاس ایک پیغمبر آیا ہے جو تم میں سے ہے، تمھاری جنس میں سے ہے۔ یعنی جس چیز سے تم کو ذرا بھی تکلیف ہو وہ اس کو شاق گزرتی ہے وہ اس کو برداشت نہیں ہوتی۔ وہ اس کو کھل جاتی ہے۔ اس کی جان پر بن جاتی ہے۔ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ جس سے تم کو ذرا بھی تکلیف ہو، تمھاری شفقت، تمھارے درد سے، تمھاری بے چینی سے وہ بے چین ہوتا ہے۔ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ اس کو تمھاری بڑی فکر ہے، تمھاری دُھن اس کو لگی ہوئی ہے کہ تم اللہ کے مقبول بندے بن جاؤ۔ اللہ کی رحمت تم پر رہے، مغفرت رہے، اس کی تھوڑی سی غفلت سے تمھارا

دامن کہیں خالی نہ ہو جائے۔ کفر کا کلمہ تمہارے حلق سے اترنے نہ پائے۔ انسان جہنم کے حلقے میں شامل نہ ہونے پائے۔ شیطان کے حلقے میں جانے نہ پائے اور خدا کے دین کی خدمت چھوٹنے نہ پائے بس جو بھی انسان ہے وہ انھیں میں آجائے، اللہ تعالیٰ کی رحمت کی جھولی میں آجائے۔

ایمان والوں کے ساتھ نہایت شفقت کرنے والا اور بہت مہربان ہے۔ آنحضرتؐ کی اپنی امت کے ساتھ جو تعلق تھا، فکر تھی جو درد تھا اس کا اندازہ ہی نہیں کرسکتے کہ وہ کس درجے کی تھی، بس یوں سمجھئے کہ جیسے ایک ماں کی ایک اولاد ہو، ماں کا ایک چھوٹا بچہ ہو، اکلوتا اور ساری زندگی کا سہارا اور سارے گھر کا چراغ، اس ماں کو جیسے اپنے بچے کی فکر ہوتی ہے اس کی ترقی سے خوشی ہوتی ہے، اس کی تکلیف سے تکلیف ہوتی ہے تو سمجھئے ایسا ہی تعلق ایک پیغمبر کو اپنی امت کے ساتھ ہوتا ہے۔ صحابہ کرامؓ کے ساتھ آپ کا تعلق تھا، یہاں تک وہ لوگ جو مکہ کے رہنے والے تھے ان میں سے بعض آپ کے عزیز تھے اور بعض ان میں سے اہل شہر تھے، مگر بدر میں قیدیوں کی حیثیت سے جب وہ پیش ہوئے تو نماز میں بھی آپ بے چین رہے۔ نماز سے آپ کو جو عشق تھا، نماز میں جو مزہ ملتا تھا اور جو طمانیت ہوتی تھی خدا کی طرف توجہ ہوتی تھی اس کا اندازہ ہم آپ کر ہی نہیں سکتے۔

آپ فرماتے ہیں **قرة عینی فی الصلوٰۃ** میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ آپ بلالؓ سے فرماتے ہیں کہ اے بلالؓ!

بلالؓ آپ کے موذن تھے، دنیا کی باتیں ہو رہی تھیں، وہاں کیسی باتیں ہوں گی، اچھی باتوں کے سوا وہاں اور کیا ہو سکتا تھا، اسلام کی تبلیغ کی باتیں، اسلام کو پھیلانے کی تدبیریں، کوششیں اور علم قرآن وحدیث، لیکن آپ کے نزدیک نماز کا جو مقام تھا، نماز سے جو تعلق تھا، آپ نماز کیلئے بے چین ہو کر بلالؓ سے کہتے۔ اے بلالؓ! اذان کہہ کر ہم کو آرام دو، بہت انتظار کیا، اب انتظار نہیں ہوتا، بلالؓ خدا کے لئے اذان دو تاکہ ہم کو سکون حاصل ہو، تاکہ ہم

کو آرام ملے، بس نماز سے آپ کا یہ تعلق تھا اور امت کے ساتھ آپ کا جو تعلق تھا۔ آپؐ کہتے ہیں کہ میں کبھی کبھی نماز میں ہوتا اور پیچھے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آتی، دل تو چاہتا کہ نماز لمبی کروں، دل کھول کر قرآن شریف پڑھوں، اپنے خدا کے سامنے خشوع وخضوع کے ساتھ لمبے لمبے سجدے کروں۔ خوب اس سے باتیں کروں، خوب اس سے دعائیں کروں، اس کا نام لوں، اچھی طرح سے اس کو پکاروں، راضی کروں اور مناؤں، لیکن اس بچے کی آواز کان میں آتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ اس کی ماں بھی نماز میں ہوگی۔ اس زمانے میں مسلمان عورتیں بھی نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں آتی تھیں، اور وہ زمانہ فتنہ وفساد کا زمانہ نہیں تھا۔ خیر القرون کا زمانہ تھا، اس لئے عورتوں کو اجازت تھی کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ، اپنے باپ کے ساتھ، اپنی اولاد کے ساتھ وہ بھی اللہ کے گھر آئیں اور نماز پڑھیں، آپ فرماتے ہیں کہ نماز میں ہوتا ہوں اور میرا اس وقت ارادہ ہوتا ہے کہ اپنے خدا سے دل کھول کر مانگوں گا، دل کھول کر دعائیں مانگوں گا، دل کھول کر قرآن شریف پڑھوں گا، اتنے میں کان میں ایک بچے کی آواز آتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس کی ماں نماز میں ہو اور اس کا دل بے چین رہے گا، اس کا دل نماز میں نہ لگے گا، وہ اپنے بچے کو جلد لینا چاہے گی، اس وقت میں نماز مختصر کردیتا ہوں، بھائیو اس سے بڑھ کر کیا تعلق ہو سکتا ہے، ہم کو نماز سے اس قسم کا تعلق کہاں ہے، جن لوگوں کو نماز سے تعلق ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنی بڑی قربانی ہے۔ یہ ہمارے رسول پاکؐ کی کتنی بڑی قربانی تھی، وہ نماز میں دنیا و آخرت سے بے خبر ہو جاتے تھے، آپؐ کو نماز میں بالکل یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اس وقت دنیا میں کیا ہو رہا ہے، آپ اپنے خدا کے حضور میں کھڑے ہو کر رونے، مانگنے اور گڑگڑانے میں مصروف رہتے، اس میں آپ ایک بچے کی آواز سے نماز کو مختصر کردیتے تھے کیوں؟ اس لئے کہ اس کی ماں کو تکلیف نہ ہو، آپ کا امت کے ساتھ یہ حال تھا، آپ نے فرمایا۔ اے مسلمانو! میری مثال اور تمھاری مثال ایسی ہے

کہ جیسے ایک شخص نے الاؤ روشن کیا، بہت ہی تیز آگ جلائی، جیسے کہ جنگلوں میں آگ ہوتی ہے، لوگ اس کے چاروں طرف بیٹھ کر تاپتے ہیں برسات کی راتوں میں آپ نے دیکھا ہوگا آگ کے پاس کیا ہوتا ہے، پروانے آکر گرتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں آکر جمع ہو جاتے ہیں ایک بتی روشن کر دیجئے بس کافی ہے، روشنی پھیلتے ہی خدا جانے کون ان کو خبر کر دیتا ہے، وہ آتے ہیں امنڈ آتے ہیں، بادلوں کی طرح امنڈ آتے ہیں وہ سب کے سب آگ میں آکر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ تمھاری مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی نے الاؤ روشن کیا اور پتنگے آکر اس پر گرنے لگے اسی طرح سے تم جہنم کی آگ میں گرنا چاہتے ہو، اے انسانو! تم جہنم کی آگ میں، دوزخ میں گرنا چاہتے ہو اور میں تمھاری کمر پکڑ پکڑ کر تم کو آگ سے ہٹاتا ہوں، یہ آپ کی اپنی امت کے ساتھ تعلق کا معاملہ ہے، امت کے ساتھ آپ کو الفت تھی، ایسی الفت کہ اللہ تعالیٰ کو قرآن مجید میں کہنا پڑا۔ سورہ کہف میں آیا ہے:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى آثَارِهِمْ، اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفاً.

کیا تم جان دے دو گے ان انسانوں کے پیچھے، کیا تم اپنا گلا گھونٹ لو گے انکے اسلام نہ لانے پر، ایمان نہ لانے پر؟

آپ کو یہ فکر تھی کہ آپ کی امت میں سے کوئی بھی جہنم نہ جانے پائے، سب جنت کے مستحق ہو جائیں۔(۱)

(۱) ا۔ تحفہ بھٹکل ص۲۶ تا ص ۳۲،

۲۔ شفاخانے رحمت کا مظاہرہ ص ۷-۹ سے مشترک طور پر اخذ و تلخیص ہے۔

بلد امین (مکہ) کی خصوصیات

اور شعار و دعوت

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَّاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَام.
(سورہ ابراہیم: ۳۵)

اور جب ابراہیم نے دعا کی کہ میرے پروردگار اس شہر کو (لوگوں کیلئے) امن کی جگہ بنادے، اور مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے کہ بتوں کی پرستش کرنے لگیں بچائے رکھ۔

قرآن مجید کی اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کا دائمی پیغام، نشان اور شعار، اور اس کی دعوت چار اجزاء پر مشتمل ہے۔

۱۔ توحید خالص کی دعوت جو "وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَام" (الی قولہ تعالیٰ "وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ.)" سے عیاں ہے۔ شرک و بت پرستی کے اس عالمگیر دور ظلمت میں جس میں توحید کی جھلک بھی نظر نہیں آتی تھی، صدیوں کے بعد یہ پہلی انقلاب انگیز، دلرزہ خیز صدا تھی جو اس مقام اور بانی بیت الحرام کی زبان مبارک سے بلند ہوئی۔

۲۔ دوسرے عبادت دائمی اور اقامت صلوٰۃ کی وہ لافانی وصیت جو حضرت ابراہیمؑ نے یہ کہہ کر ساکنانِ حرم اور اپنی اولاد کو دی۔

رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ. رَبَّنَا لِیُقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ. (سورہ ابراہیم۔ ۳۷)

اے پروردگار میں نے اپنی اولاد میدانِ (مکہ) میں جہاں کھیتی نہیں تیرے عزت (وادب) والے گھر کے پاس لا بسائی ہے، اے پروردگار تاکہ یہ نماز پڑھیں۔

خود اس مقام کا انتخاب جو زراعت و تجارت اور تمدن و ترقی کے بنیادی و لابدی اسباب سے خالی ہے، "بِوَادٍ غَيْرِ ذِیْ زَرْعٍ" اس شعور و عزم کو تازہ کرنے والا ہے کہ دنیا کے سرسبز وشاداب اور متمدن و ترقی یافتہ شہروں اور تجارت وزراعت کے مرکزوں کو چھوڑ کر (جہاں سے حضرت ابرہیمؑ کا اس سفر ہدایت میں گذرنا ہوا تھا) اس جگہ کا انتخاب کیوں کیا گیا اور اس کی بیت اللہ کی تعمیر اور آل ابراہیمؑ (معنوی و جسمانی دونوں طور پر) کی سکونت و قیام کے لئے کیوں ترجیح دی گئی؟

۳۔ تیسرے اسباب کے بجائے خالقِ اسباب اور رب الارباب پر توکل کی تلقین وہدایت ہے جو ان کی اس دعا سے مفہوم ہوتی ہے۔

فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ. (سورہ ابراہیم۔ ۳۷)

تو لوگوں کے دلوں کو ایسا کردے کہ ان کی طرف جھکے رہیں اور ان کو میووں سے روزی دے تاکہ (تیرا) شکر کریں۔

اور جو انھوں نے خود آتش نمرود میں مومنانہ و متوکلانہ طریقہ پر داخل ہو جانے کے عمل سے ثابت کر دیا کہ آگ، عناصر اربعہ اور فطری و تکوینی طاقتیں مامور ہیں آمر نہیں، ان کو خود اپنا خاصہ ظاہر کرنے اور اپنا عمل کرنے کا اختیار نہیں، چنانچہ وہ آگ ان کے حق میں بردو سلام بن گئی۔

قُلْنَا یٰنَارُ كُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰۤى اِبْرٰهِیْمَ. (سورہ الانبیاء۔ ۶۹)

ہم نے حکم دیا اے آگ سرد ہو جا اور ابراہیم پر (موجب) سلامتی بن جا۔

اہل مکہ اور ساکنان حرم کو ان تینوں خصوصیتوں کو اپنے سینہ سے لگائے رکھنا اور اپنا

دائمی شعار بنانا ضروری اور مطلوب ہے، اس لئے کہ اس شہر کو البلد الأمین کہا گیا ہے۔ اس کی خصوصیات اس کا مزاج اور اس کی فطرت زمانہ کے ہزاروں انقلابات، حکومتوں کے عروج وزوال، تمدن و ترقی کے تنوعات واختلافات کے ساتھ یہی رہنی چاہئے اور اس پر انقلاب زمانہ کا کوئی اثر نہیں پڑنا چاہئے، پھر میں نے تاریخ کی روشنی میں اور محققین ومستشرقین کے حوالوں سے بتایا، نیز حدیث کی سند سے بھی جس میں کہا گیا ہے کہ اس شہر وملک میں بت پرستی لانے والا عمرو بن لحی تھا، جو عرب کے باہر سے بت پرستی لے کر آیا اور اس نے اس کو رواج دیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ وہ جہنم میں اپنی آنتیں گھسیٹتا ہوا چل رہا ہے۔ (۱) محققین اور فضلائے مغرب کی بھی تحقیق یہی ہے کہ مکہ اور طائف کے مشہور بت ہُبل، لات، مناۃ، وعزیٰ اردن کے شہر بترا (PETRA) اور عراق واردن سے درآمد (IMPORT) کئے گئے، (۱) یہ اس سرزمین بلد امین کی چیز نہیں تھی، اور فتح مکہ میں بیت اللہ اور حرم کے ان بتوں سے خالی کردیئے جانے اور مکہ وطائف کو بتوں سے پاک کردیئے جانے کے بعد پھر یہ سرزمین اساس ابراہیمیؑ پر آگئی، اور حدیث میں بشارت دی گئی ہے کہ آئندہ بھی یہ سرزمین عرب کھلی ہوئی بت پرستی سے محفوظ اور پاک رہے گی۔ ''الا ان الشیطان قد أیس ان یعبد فی بلدکم ہذا ابداً'' اس سرزمین کے بلد امین ہونے کی صفت اور دعوت ابراہیمی کے علمبردار اور داعی ومبلغ ہونے کی خصوصیت ہمیشہ باقی رکھنی چاہئے کہ یہی اس سرزمین کا شرف اور یہاں کے رہنے والوں کا امتیاز اور فخر ہے۔

---

(۱) بخاری۔ مسلم۔ احمد

(۲) تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب ''نبی رحمت'' کا عنوان ''مکہ میں بت پرستی اور اس کا اصل سرچشمہ اور تاریخ'' ص ۷۹ تا ص ۸۰۔

(۳) سنن ابن ماجہ ابواب المناسک

مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کی حرمت

وَمَنْ يُّرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ. (سورہ حج: ۲۵)

اور جو کوئی بھی (حرم کے اندر) کسی بے دینی کا ارادہ ظلم سے کرے گا ہم اسے عذاب دردناک چکھائیں گے۔

یہ آیت قرآن مجید کا مستقل معجزہ اور خدا کے علم محیط وازلی کی ایک نشانی ہے، چھٹی، ساتویں صدی عیسوی تک متمدن دنیا بالخصوص جزیرۃ العرب کو صرف ایک ہی خطرہ اور ایک ہی طرح کے حملہ کا تجربہ تھا اور وہ میدانی جنگ کا خطرہ اور کھلے ہوئے فوجی حملہ کا تجربہ تھا۔ اس کا ایک نمونہ اسی مقدس سرزمین نے ابرہہ کی لشکر کشی اور اصحاب فیل کی فوجی پیش قدمی کی صورت میں دیکھا، جس کو اللہ تعالیٰ نے بری طرح سے پسپا اور ناکام بنادیا اور اس کے بارے میں ایک پوری سورۃ (سورۃ الفیل) نازل فرمائی لیکن اس بلد امین بیت اللہ اور مرکز عالم کے خلاف گہری سازشوں، معنوی تحریفات اور ملحدانہ منصوبہ بندیوں کا کوئی تجربہ تھا لیکن اس علیم وخبیر خدا نے جس نے یہ آخری کتاب نازل کی اس کی طرف سے بھی آگاہی دے دی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے اور اس سے بھی خبردار رہنا چاہئے، اور اس کی سزا اور انجام بھی بتادیا کہ "نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ."

اللہ تعالیٰ نے اس گھر کی تعریف میں "قِيَاماً لِّلنَّاسِ" فرمایا ہے جو ایک بہت عمیق اور وسیع المعنی لفظ ہے۔ اس کی وسعت و معنویت کی تشریح و ترجمانی مشکل ہے۔ اس کا مطلب یہ

ہے کہ مستقبل انسانیت اور امن عالم کے بہت سے انتظامات اور اس کی ضمانتیں اس بیت عتیق سے وابستہ ہیں اور جب تک یہ اس عظمت و حرمت اور تحفظ و تقدس کے ساتھ قائم ہے، انسانیت کے روحانی و معنوی مفادات محفوظ ہیں۔(۱) جو اس تقدس و تحفظ پر دست اندازی کرے گا اور اس مرکز توحید و عبادت و حفاظت انسانیت کو اپنے سیاسی اغراض اور اپنے اقتدار اور قیادت کی بازی گاہ اور میدان بنائے گا۔ اس کو اللہ تعالیٰ خائب خاسر بنادے گا۔

یہیں سے (پرانے محاوروں کے مطابق)(ایک پرتاب تیر کے فاصلہ پر) سردار قریش اور جد رسول عبد المطلب نے حملہ آور ابرہہ سے کہا تھا کہ "ان للبیت رباً یحمیہ" (اس گھر کا بھی ایک مالک و پاسبان ہے جو اس کی حفاظت کریگا) یہ اس وقت بھی ایک حقیقت اور امر واقعہ تھا جس کا ظہور ہوا، اس وقت بھی ہے اور قیامت تک بھی رہے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ بیت اللہ کا احترام اور مدینہ طیبہ سے عقیدت و محبت اسلامی شعور، ایمان اور اسلام سے وابستگی کا ایک نشان اور اس کی ترقی و نقص کو معلوم کرنے کے لئے مقیاس الحرارت (BAROMETER) کا کام دیتا ہے، جب تک ان دونوں مقامات سے مسلمانوں کا والہانہ تعلق اور قلبی و جذباتی لگاؤ ہے اور وہ ان دونوں محبوب و محترم مقامات پر کسی کی غلط نگاہ پڑنے کے روادار نہیں، اس وقت تک ان کا رشتہ اسلام سے مستحکم اور ان کا دین محفوظ ہے۔

اقبال نے اسی جذبہ سے سرشار ہو کر کہا ہے ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے ۔۔۔ نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر

---

(۱) اس موقعہ پر بے اختیار فارسی کا وہ شعر یاد آتا ہے جس کا مفہوم عربی میں سمجھانا مشکل اور نازک تھا لیکن باذوق قارئین کے لئے اس کا نقل کرنا نا مناسب نہ ہوگا۔

از صد سخن پیرم یک نکتہ مرا یاد است ۔۔۔ عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

وادی غیر ذی ذرع کا مقام اور پیغام

رَبَّنَآ اِنِّيْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ.

(سورۃ ابراہیم۔ ۳۷)

اے پروردگار میں نے اپنی اولاد میدان (مکہ) میں جہاں کھیتی نہیں، تیرے غیرت (وادب) والے گھر کے پاس لابسائی ہے اے پروردگار تاکہ یہ نماز قائم کریں۔

وادی کی اصل فطرت

آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب کہا "رَبَّنَآ اِنِّيْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ" تو انہوں نے اس وادی مکہ اور حجاز کے مقام کا قیامت تک کے لئے تعین کر دیا، اصلاً اس وادی کی فطرت "وَادِی غَيْرِ ذِی زَرْعٍ" ہونے کی ہے، اس لئے اگر اس میں کبھی سرسبزی و خوش حالی، باغات اور کھیتیاں، مرغزار و سبزہ، پانی کی بہتات، دولت کی فراوانی اور تجارت کی گرم بازاری دیکھنے میں آئے تو یہ اوپری چیز ہوگی، یہ اندر کی چیز نہیں ہوگی، یہ اس کے لئے ایک غیر فطری مصنوعی اور عارضی عمل ہے، اس وادی کے اصل مزاج کا پہچاننے والا حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ کون ہو سکتا ہے، اور کون اس کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ انھوں نے الہام ربانی اور ہدایت آسمانی سے اپنی اولاد کو یہاں لاکر چھوڑا تھا، اور کہہ دیا تھا کہ میں نے اپنی اولاد کو

"وَادِی غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ" میں بسایا ہے، یہاں اپنا خاندان چھوڑ کر جا رہا ہوں، گویا قیامت تک کے لئے اس وادی کا مزاج اس وادی کا مقام اور اس وادی کی فطرت کو متعین کر دیا، اب یہاں اگر رزق اور معاش کی برکتیں زمین سے ابلیں اور آسمان سے برسیں، جب بھی اس وادی کا مزاج وہی رہے گا جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بیان کیا اور جس کے ساتھ انھوں نے اس کا رشتہ اور ربط قائم کیا۔

غور فرمائیے "اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ" سے "رَبَّنَا لِیُقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ" کا ربط کیا ہے؟ فرماتے تو یہ ہیں کہ میں نے اپنی اولاد کو اس وادی غیر ذی زرع میں آباد کیا ہے، اے ہمارے پروردگار تاکہ یہ نماز قائم کریں۔ نماز پڑھیں آپ نے لِیُقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ کہا، یہ نماز کے قائم کرنے والے ہوں، یہ نماز کے داعی بنیں۔ یہ نماز کے قیام کے روئے زمین پر ذمہ دار ہوں، اگر وہ اپنی اولاد کو نینوا کی سرزمین یا دجلہ و فرات کی وادی میں چھوڑتے (جہاں کے وہ رہنے والے تھے) یا مصر میں جس سے گزر کر آئے تھے یا شام میں جہاں پھر مسجد اقصیٰ بنی اور آپ ہی کی اولاد نے بنائی کیا وہاں لِیُقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ کا ظہور و تحقق نہیں ہو سکتا تھا؟ آپ سب جانتے ہیں کہ وہاں نمازیں پڑھی جا رہی ہیں خدا کے فضل و کرم سے مسلمان موجود ہیں، جگہ کے انتخاب اور اس کی تعریف اور نماز کے قیام و اہتمام کے درمیان جو ربط ہے وہ یہی ہے کہ یہ جب نظر اٹھا کر دیکھیں گے تو انھیں جلے ہوئے پہاڑ نظر آئیں گے۔ انھیں خشک زمین نظر آئے گی ان کو کہیں بہتا ہوا دریا، چلتی ہوئی نہر نظر آئے گی تو ان کی فطرت صحیحہ اور ان کا ذہن سلیم ان کی رہبری کرے گا کہ ہمارے جد امجد ہمارے مورث اعلیٰ کے اس زمین کا انتخاب کرنے کا راز کیا ہے؟ راز یہ ہے کہ اگر ان کو ہم سے معاشی مسئلہ حل کروانا ہوتا ہم کو خوش حالی عطا کرنی اور آسودگی کی زندگی بسر کروانی ہوتی تو پھر کسی سرسبز و متمدن زمین کا انتخاب کیا ہوتا یہاں ٹھہرانے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے ہم سے ان کو کوئی اور کام لینا مقصود ہے اور اس کام کو اس سرزمین سے زیادہ مناسبت ہے۔

اس سر زمین کا پیغام

ان آیات قرآنی کی روشنی میں یہاں کے رہنے والوں کے ذہن میں (چاہے وہ باہر سے آئے ہوں یا یہیں کے رہنے والے ہوں) وادی غیر ذی زرع اور اقامت صلوٰۃ کے درمیان جو رشتہ اور رابطہ ہے، ہمیشہ مستحضر اور تازہ رہنا چاہئے، اس سر زمین کا اصل پیغام ہے "دنیا میں خدا کی عبادت کی دعوت دینا" اس کے خدائے واحد کا اقرار کروانا، اور اسی کے سامنے سجدہ ریز کرنا، اور اسی کی عبادت کو زندگی کا مقصود سمجھنا، اور اسی کو راضی رکھنے کی کوشش کرنا، اور سارے معاشی اور دنیاوی نظام کو اسی کے احکام کا تابع بنانا، اور لوگوں کو بتانا کہ وہ اس نظام کے باغی نہ ہوں، بلکہ اس نظام کے فرماں بردار ہوں، خلاصہ یہ ہے کہ یہ ضروری ہے کہ آپ سمجھیں کہ یہاں کا پیغام اور یہاں کی سوغات کچھ اور ہے، یہاں کے ذرّہ ذرّہ سے کوئی اور صدا آرہی ہے، یہاں کی ہوا کا ہر جھونکا ایک دوسری زندگی کا پیغام دیتا ہے ایسی زندگی گزارنے کا پیغام دیتا ہے، جس میں مادیّت روحانیّت کے تابع ہو، معاش معاد کے تابع ہو، جہاں اعمال عقائد کے تابع ہوں، اقتصادیات اخلاق کے تابع ہوں، اور جہاں ہر محبّت خدا کے تابع ہو(۱)۔

---

(۱) حرمین شریفین اور جزیرۃ العرب کے بیرونی مقیمین کی ذمہ داریاں اور اہل وطن کے حقوق۔ صفحہ ۱۱ تا ۱۴ سے ماخوذ!

نظام عالم مربوط ہے بیت اللہ شریف سے

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِلنَّاسِ. (سورۃ المائدۃ۔ ۹۷)

اللہ نے کعبہ مکان محترم کو (اجتماعی زندگی کے) قیام کا ذریعہ، اور انسانوں کے باقی رہنے کا مدار ٹھہرایا ہے۔

اس حقیقت پر ابھی تک کم لوگوں کی نگاہ گئی ہے کہ نظام عالم کعبۃ اللہ اور اس کی دعوت و مقام سے وابستہ ہے، اس کو ہماری ظاہری نگاہیں نہیں دیکھ رہی ہیں، لیکن اہل بصیرت سمجھتے ہیں کہ جس طرح پہاڑوں کا وجود ملک اور زمین میں ایک استقرار و توازن پیدا کرتا ہے، اسی طریقہ سے اس سے ایک بالاتر نظام ہے، اور وہ نظام وابستہ ہے بیت اللہ سے، جب تک بیت اللہ قائم ہے، اور اس کا وہ پیغام زندہ ہے، اس وقت تک گویا نظام عالم قائم ہے۔

اس سرزمین کا اصل پیغام، اس سرزمین کا اصل تحفہ اور اس سرزمین کی اصل نعمت وہ چیز ہے جو ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے اور جس کے بغیر نہ معاش کا نظام درست ہو سکتا ہے، نہ معاد کا، یہ تو سب جانتے ہیں کہ معاد کا نظام تو درست ہی نہیں ہو سکتا، لیکن یہ کم لوگ جانتے ہیں کہ معاش کا نظام بھی درست نہیں ہو سکتا، اور جو ملک محض معاشی مسئلہ پر قائم ہیں، اور ان کے افراد کا آپس کا تعلق معاشی ہے وہ ایک غیر فطری نظام کے ماتحت زندگی گزار رہے ہیں، جس کے ساتھ نہ اللہ کی مدد ہے نہ اللہ کی رحمت ہے، جتنے مسائل بھی اس وقت ان ملکوں

میں اور ان ملکوں کے اثر سے دوسرے ملکوں میں پیدا ہو رہے ہیں وہ سب اسی کا نتیجہ ہیں کہ وہاں معاش معاد کے ساتھ مربوط نہیں ہے، اور زندگی کا وہ صحیح مقصد وہاں نہیں پایا جاتا جو خالق انسان نے انسان کیلئے متعین کیا ہے، وہ مقصد وہی ہے جس کا آیت ذیل میں تذکرہ ہے:۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلاَّ لِيَعْبُدُوْنَ مَآ أُرِيْدُ مِنْهُمْ مِنْ رِّزْقٍ وَّمَآ أُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنَ إِنَّ اللهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُوْالْقُوَّةِ الْمَتِيْن. (سورہ الذریات ۵۶-۵۸)

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں، میں ان سے طالب رزق نہیں اور نہ یہ جانتا ہوں کہ مجھے (کھانا) کھلائیں، خدا ہی تو رزق دینے والا ہے زور آور اور مضبوط ہے۔

یہ حقیقت ان کی نگاہوں سے او جھل ہو گئی ہے اس لئے وہاں معاد کا معاملہ تو الگ رہا معاش بھی خطرہ میں ہے، وہاں وہ معاشی پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں جن کا کوئی حل نہیں، وہاں ایک فرد دوسرے فرد کے مفاد سے، ایک جماعت کی ترقی دوسری جماعت کی ترقی سے، ایک حکومت کا نظام دوسری حکومت کے نظام سے ٹکرا رہا ہے، معاش معاش سے ٹکرا رہی ہے، بلکہ اس ملک کی معاش دوسرے ملکوں کی معاش کو خراب کرنے یا استحصال پر آمادہ کرتی ہے اس ملک کی معاشی ترقی کا انحصار بھی دسرے ملکوں کی معاشی ابتری اور بدنظمی پر موقوف ہے، اس لئے نہ صرف اس ملک میں مسائل پیدا ہو رہے ہیں بلکہ اس ملک کی وجہ سے دوسرے ملکوں میں بھی نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں اور وہ معاش ان کے لئے وبال جان بن گئی ہے، یہ ایک ایسا مسئلہ لا ینحل ہے جس کا حل ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ ان کے بڑے بڑے عقلاء و مفکرین سر گرداں و پریشان ہیں مگر راستہ نظر نہیں آتا۔

لیکن اس سرزمین پر اللہ تعالیٰ کا جو گھر (کعبۃ اللہ) ہے اسکے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

"جَعَلَ اللهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰماً لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ".

میں (اس کے باوجود کہ عربی اردو دونوں سے واقف ہوں اور دونوں کا ذوق رکھتا ہوں۔) اس

بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ "قیماً للناس" کا صحیح ترجمہ نہیں کر سکتا۔ میں نے جو اردو کے تراجم دیکھے ہیں، میں اس سے بھی مطمئن نہیں ہوں کہ "قیماً للناس" کا اردو میں صحیح ترجمہ ہوا ہے لیکن میں اس کا مفہوم ادا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو لوگوں کی زندگی کا دارومدار بنایا ہے۔

یہ نظام عالم نہ حکومتوں سے مربوط ہے نہ تنظیمات سے نہ فوجی طاقت سے نہ اخلاقی فلسفوں اور تہذیبوں اور علمی مرکزوں سے مربوط ہے۔ نظام عالم جہاں تک ہماری نگاہیں نہیں پہونچ سکتی بیت اللہ شریف سے اور اس دعوت سے مربوط ہے جس کے لئے بیت اللہ قائم ہوا۔

حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کعبہ کے وقت یہی دعاء مانگی تھی:۔

"اے اللہ! میں نے تیرے گھر کو اس لئے بنایا ہے کہ تیری توحید کی منادی کی جائے۔"!

تو نظام عالم مربوط ہے، حرمین شریفین سے اور ان کی دعوت سے، وہ صحیح اعتقاد، صالح سیرت واخلاق، انسانیت کے رشتے، اخوت ومحبت، انسانیت کے احترام، انسانی جان ومال کا تحفظ اور ہر چیز میں خدا کو حاضر وناظر سمجھنے سے اصل میں نظام عالم قائم ہے۔ نظام عالم سائنس پر قائم نہیں ہے۔ ٹکنالوجی پر قائم نہیں ہے۔ سائنس وٹکنالوجی نے بتایا کہ وہ نظام عالم کے لئے خطرہ ہیں۔ آج ایک منٹ میں پورا نظام عالم فنا ہو سکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ نظام عالم قائم ہے ارادۂ الٰہی پر، نظام الٰہی قائم ہے ان اصولوں اور تعلیمات پر جن کو پیغمبر لے کر آئے، اور اس سب کا مرکز وہ دعوت، وہ مقاصد، وہ تعلیم، وہ مرکزیت ہے جس کے داعی اول سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور جس کے مجدد وخاتم اور مکمل ومحافظ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور جن کی نمائندگی بیت اللہ شریف اور مسجد نبوی کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ" اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو بیت اللہ الحرام بنایا، عزت کی جگہ بنائی، "قیاماً للناس" لوگوں کی زندگی کا دارومدار، اس کے اندر

لوگوں کی معشیت، دُنیا اور نسل انسانی کو برقرار رکھنے کا راز ہے۔

اس آیت سے ہندوستانی مسلمانوں پر بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہاں دینی حیثیت سے یہی ملت اسلامیہ بیت اللہ کی نمائندگی کرتی ہے، اگر یہ ملک خدانخواستہ مال کی بڑھی ہوئی محبت، انسانی کشی، مردم آزاری، اور روز مرہ کے فسادات، خود غرضی اور بے ضمیری اور انسانیت کی قدر و قیمت نہ جاننے کی وجہ سے تباہ ہوا تو ہمارا دامن ہوگا اور رسول اللہ ﷺ کا دست مبارک، اس لئے کہ ہم انھیں نبی کی امت ہیں جن کو "رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْنَ" کا لقب دیا گیا ہے۔ "وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ" اور کہا گیا ہے کہ "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيْهِمْ، وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ" (سورہ انفال ۳۳) (اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں تھے، انھیں عذاب دیتا، اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور انھیں عذاب دے)۔

اس امت کی موجودگی میں بھی جو نبی رحمت سے نسبت رکھتی ہے اور ان کی تعلیمات کی حامل اور ان کی ساختہ پرداختہ ہے، کسی ملک کو تباہ نہیں ہونا چاہئے۔ اسکی ذمہ داری ہے یہ حقیقتیں زندہ رہیں، وہ ملک کے محافظ بنیں اور اس کو اجتماعی خودکشی اور خود سوزی سے بچائیں۔ (۱)

---

(۱) مشترک اخذ و تلخیص۔ از ۱۔ کاروانِ زندگی حصہ سوم ص ۱۹۰ تا ص ۱۹۲

۲۔ حرمین شریفین کی ذمہ داریاں ص ۸ تا ص ۱۰

۳۔ تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ ار دسمبر ۱۹۸۶ء

باب ۱۰

مادی افکار و نظریات

"......میں نے قرآن مجید کو اس نظر سے پڑھا کہ:
وہ ایک زندہ کتاب اور ایک بولتا ہوا مرقع یا آئینہ ہے،
جس میں افراد بھی اپنے اپنے چہرے دیکھ سکتے ہیں،
قومیں بھی اپنی صورتیں دیکھ سکتی ہیں......
اور قوموں، سلطنتوں، تمدنوں کی ترقیات و عروج کے انجام بھی
اس کتاب میں دیکھے جا سکتے ہیں......"

(علی میاں ندوی)

مادی نظریات اور ان کی کوتاہ نظری

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلاً رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعاً .... وَلَوْلَا اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللّٰهُ لَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ. (الکہف: ۳۲ تا ۳۹)

دو باغ والے کا قصہ

قرآن مجید دو باغ والے کا قصہ بیان کرتا ہے...... یہ وہ قصہ ہے جس سے ہم کو روز مرہ کی زندگی میں پہلے قصہ سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے۔ اگر اصحاب کہف کا قصہ صدیوں اور برسوں میں پیش آتا ہے تو یہ قصہ تقریباً ہر جگہ اور ہر وقت ہمارے سامنے آتا ہے اور بار بار دہرایا جاتا ہے یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو ہر اعتبار سے خوش نصیب واقبال مند تھا، آسائش وخوشحالی کے سارے سامان اس کے لئے مہیا تھے، اس کے پاس انگور جیسے لطیف ومرغوب پھل کے دو باغ تھے ان کے چاروں طرف کھجور کے دلنواز درخت تھے، جنھوں نے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا، درمیان میں کاشت کے قطعے بھی تھے، یہ ایک متوسط درجہ کی زندگی کے لئے سعادت ومسرت کی

آخری منزل تھی اور متوسط طبقہ اور درمیانی معیار زندگی ہی اکثر دنیاوی معاملات میں معیار و پیمانہ ہے۔

لیکن اس دولت مند اور خوشحال شخص کی سعادت وکامیابی کا سارا انحصار محض ان باغات کے وجود تک محدود نہ تھا، بلکہ سارے اسباب ووسائل اس کے لئے مسخر تھے، اور یہ دونوں باغ اپنی بہترین پیداوار دے رہے تھے:-

كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئاً وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهْراً.
(سورہ کہف۔ ۳۳)

پس ایسا ہوا کہ دونوں باغ پھلوں سے لد گئے، پیداوار میں کسی طرح کی بھی کمی نہ ہوئی، ہم نے ان کے درمیان (آب پاشی کے لئے) ایک نہر جاری کردی تھی۔

غرض اس طرح سعادت وکامرانی کی پوری تکمیل ہو چکی تھی اور آرام وراحت کے سارے اسباب نہ صرف موجود بلکہ ارزاں وفرواں تھے۔

مادی مزاج اپنا رنگ دکھاتا ہے

اس موقع پر اس شخص کے اندر وہ مادی مزاج اپنا رنگ دکھاتا ہے جو ہمیشہ اہل حکومت جاگیرداروں، قومی لیڈروں، صنعت کاروں، کارخانہ داروں اور فوجی طاقت رکھنے والوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے، اس کے اندر وہ شدید مادی رجحان پیدا ہوتا ہے جو ایمان، معرفت صحیحہ، اور تربیت کا پابند نہیں، وہ اپنی ساری خوشحالی اور خوش بختی کو اپنے علم ولیاقت اور اپنی ذہانت ومحنت کی طرف منسوب کرتا ہے جس طرح اس سے پہلے قارون نے کیا تھا اور کہا تھا:-

اِنَّمَا اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ. (سورہ قصص۔۷۸)
یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے۔

وہ اپنے اس دوست پر فخر کرتا ہے، جس کو یہ مرادیں حاصل نہ تھیں، اور بڑی صراحت بلکہ ناروا جسارت سے کہتا ہے:

اَنَا اَکْثَرُ مِنْكَ مَالاً وَّ اَعَزُّ نَفَراً (سورہ کہف۔۳۴)
دیکھو میں تم سے زیادہ مالدار ہوں اور میرا جتھا بھی بڑا طاقتور جتھا ہے۔

وہ اپنے اقتدار و قوت کے چشمہ میں اور دولت و خوشحالی کے اس مرکز میں اس طرح داخل ہوتا ہے کہ نہ اس کو اپنی خبر ہوتی ہے نہ اپنے رب کی، نہ غیبی اسباب اور ارادۂ الٰہی کی جو سات آسمان سے اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے، اور انسان اور اس کی ملکیت بلکہ انسان اور اس کے قلب کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، وہ اپنے نفس پر علمی و عملی، اخلاقی اور عقلی ہر لحاظ سے ظلم کرتا ہے، یہ کور چشم مادی ذہنیت اس کی زبان سے اعلان کرواتی ہے کہ اب نہ اس کو زوال ہے، نہ اس کے باغات کو، وہ حشر و نشر کا انکار کرتا ہے، اور بڑے پھوہڑپن اور غایت درجہ حماقت کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ یہ کامیابی و خوشحالی ابدی و لافانی ہے، اور دنیا و آخرت (اگر آخرت ہو) کسی جگہ ختم ہونے والی نہیں:۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ قَالَ مَا اَظُنُّ اَنْ تَبِیْدَ هٰذِهٖ اَبَداً وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً. (سورہ کہف۳۵۔۳۶)
(پھر وہ) یہ باتیں کرتے ہوئے اپنے باغ میں گیا اور وہ اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر رہا تھا، اس نے کہا میں نہیں سمجھتا کہ ایسا شاداب باغ کبھی ویران ہو سکتا ہے، مجھے توقع نہیں کہ (قیامت کی) گھڑی برپا ہو۔

وہ سمجھتا ہے کہ اس کا شمار ان معدودے چند خوش نصیب وکامران افراد انسانی میں ہے، جن سے اقبال کبھی منہ نہیں موڑتا اور قسمت کبھی بے وفائی نہیں کرتی اور جو ہمیشہ اور ہر جگہ سعادت اور عزت کے بام پر نظر آتے ہیں:۔

وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا. (سورہ کہف۔۳۶)

اور اگر ایسا ہوا بھی کہ میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا گیا تو (میرے لئے کھٹکا ہے؟) مجھے ضرور (وہاں بھی) اس سے بہتر ٹھکانا ملے گا۔

اس طرح کے لوگ ہمیشہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایمان، عمل صالح، اور محنت وکاوش کی کیا ضرورت ہے، یہ ان کی فطری اور وہبی سعادت ہے، جو ہر وقت ان کو شاد کام وبامراد رکھ سکتی ہے۔

ایمانی طرز فکر

اس کے دوست کی چشم بصیرت اللہ تعالی نے حق وایمان کے لئے کھولدی تھی، اس کو معرفت الٰہی اور اس کے صفات وافعال کے علم کی لازوال دولت حاصل تھی، وہ جانتا تھا کہ صرف وہی اس کائنات میں تصرف کرنے والا ہے، اور اسباب کا خالق ہے، اور جب چاہے حالات کو پلٹ سکتا ہے، اس نے اس کی بات پر اعتراض کیا اور اس کے اس مادہ پرستانہ طرز فکر کی کھل کر مخالفت کی، اس کو اصل وحقیقت اور آغاز سے آگاہ کیا، یہ وہ سخت اور سنگین حقیقت ہے جس کو یہ ظاہر پرست اور اپنے کو خوش نصیب سمجھنے والے ہمیشہ فراموش کرنا چاہتے ہیں، اور اس کے تذکرے سے دور بھاگتے ہیں:۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗ اَكَفَرْتَ بِالَّذِىْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰكَ رَجُلاً.

(سورہ کہف۔ ۳۷)

یہ سن کر اس کے دوست نے کہا اور باہم گفتگو کا سلسلہ جاری تھا "کیا تم اس ہستی کا انکار کرتے ہو جس نے تمھیں پہلے مٹی سے اور پھر نطفہ سے پیدا کیا اور پھر آدمی بنا کر نمودار کر دیا۔"

متکبر و مغرور اشخاص کے لئے اس بات کا سننا کتنا شاق و ناگوار ہے، اس کا اندازہ ہم کر سکتے ہیں، اس نے کہا کہ وہ اس کے بالکل دوسرے رخ پر ہے، اور دوسرے رجحان کا حامل ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ پر ایمان:۔

لٰكِنَّا هُوَاللّٰهُ رَبِّىْ وَلَا اُشْرِكُ بِرَبِّىْ اَحَداً.

(سورہ کہف۔ ۳۸)

لیکن میں تو یقین رکھتا ہوں کہ وہی اللہ میرا پروردگار ہے اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔

پھر اس نے اس کو وہ بنیادی اور اصولی حقیقت یاد دلائی جسکے گرد پوری سورہ کہف گردش کر رہی ہے اور اس جگہ انگلی رکھی جو اس طرح کے لوگوں کی کمزوری یا دکھتی رگ ہوتی ہے، اس نے کہا کہ دیکھنے کی چیز اسباب ظاہری نہیں بلکہ وہ خالق و مالک ہے جس کے ہاتھ میں ان سارے اسباب و وسائل کی ڈور ہے اور یہ سامان راحت اور اسباب عیش جن پر وہ خوش اور نازاں ہے نہ اسباب کی کارگزاری ہے اور نہ خود اس کی دست کاری یا عقل و ذہانت کی کارفرمائی، وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت کا نتیجہ ہے جس نے ہر چیز کو بہترین طریقہ پر بنایا ہے وہ بڑی حکمت کے اور نرمی کیساتھ اس کو خدا کی قدرت کے اعتراف اور اس کی نعمت کے شکر کیطرف متوجہ کرتا ہے:۔

وَلَوْلَا اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَاشَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

(سورہ کہف: ۳۹)

اور پھر جب تم اپنے باغ میں آئے (اور اس کی شادابیاں دیکھیں) تو کیوں تم نے یہ نہ کہا کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے اور اس کی مدد کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔

اس باغ والے کے قصہ سے مجھے ایسا معلوم ہوا گویا کہ میرے سامنے اس دور حاضر کی (جو اپنی مادی ترقی کے نقطہ عروج تک پہونچ گیا ہے) تصویر ان آیتوں میں پیش کی گئی ہے۔

كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ آتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئاً وَّفَجَّرْنَا خِلاَلَهُمَا نَهْراً. وَكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ، فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَراً.

(سورہ کہف: ۳۳-۳۴)

دونوں باغ کثرت سے پھل لاتے اور اس کی پیداوار میں کسی طرح کمی نہ ہوتی اور دونوں میں ایک نہر بھی جاری کر رکھی تھی اور اس طرح اس شخص کو ان کی پیداوار ملتی رہتی تھی تو ایک دن جبکہ وہ اپنے دوست سے باتیں کر رہا تھا کہنے لگا کہ میں تم سے مال و دولت میں بھی زیادہ ہوں اور جتھے اور جماعت کے لحاظ سے بھی عزت والا ہوں۔

امریکہ کی تصویر اس سے بہتر کیا کھینچی جا سکتی ہے؟ (جنتین) آپ شمالی وجنوبی امریکہ کو لے لیجئے یا مشرق و مغرب کو لے لیجئے، "جنتین من اعناب" یہاں کس چیز کی کمی ہے، یہاں کون سا میوہ نایاب ہے؟ یہاں کس چیز کا فقدان ہے؟ یہاں خدا کی دی ہوئی ساری نعمتیں موجود، لیکن یہاں کس چیز کی کمی ہے؟ اس چیز کی کمی جس کی طرف ایک صاحبِ ایمان، صاحبِ بصیرت دوست نے متوجہ کیا۔

وَلَوْلَا اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَاشَاءَ اللّٰهُ لَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ. (سورہ کہف: ۳۹)

اور بھلا جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو تم نے ماشاءاللہ لا قوۃ الا باللہ کیوں نہ کہا؟

صرف ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ کی یہاں کمی ہے، یہ ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ وہ چیز ہے جو مٹی کو سونا بنادے، یہ ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ وہ چیز ہے جو مادیت کو اعلیٰ درجہ کی عبادت بنادے، یہ ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ وہ چیز ہے جو نفس انسانی کے سرکش گھوڑے کو اس طرح رام کرتی ہے کہ وہ مطیع و فرمانبردار مرکب اور منزل مقصود تک لے جانے والی ایک مبارک سواری ہوتی ہے، ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ کلید ہے جس قفل پر آپ رکھ دیں یہ اس کو کھول دے گا، اس مغربی دنیا میں اس مادی دنیا میں جس چیز کی کمی ہے وہ ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ کی کمی ہے، سننے میں تو چند لفظ ہیں، اور اپنی زندگی میں بار بار استعمال کرتے ہیں، ماشاء اللہ آپ کب تشریف لائے، ماشاء اللہ آپ نے یہ سوٹ کب بنوایا، ماشاء اللہ آپ کے لڑکے نے کب گریجویشن کیا، ماشاء اللہ آپ نے یہ موٹر کب خریدی، ماشاء اللہ آپ نے یہ مکان کب بنوایا۔

"ماشاء اللہ" کے اندر بلاغت کے جو دریا بہہ رہے ہیں اور جو ساری دنیا کو حاوی ہے اور اس کے اندر مادیت کو، غرور کو، اور اپنی طرف نسبت کرنے والی طاقت کو یعنی انسان کو جو دھوکا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ وہی کررہا ہے، اس کو دبانے اور مغلوب کرنے کی جو عجیب و غریب طاقت ہے اس کا ہم کو اور آپ کو احساس نہیں رہا، اس لئے ہم اس کو موقع بے موقع استعمال کرتے ہیں، اور اتنے مواقع پر پڑھتے ہیں کہ اس کی عظمت اور اعجاز کا احساس نہیں رہا، ماشاء اللہ کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے خدا کے ارادہ اور قدرت سے ہو رہا ہے، اس میں انسان کا کوئی کمال نہیں ہے، اس میں انسان کی کوئی تعریف نہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. (سورہ فاتحہ:۱)

سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو تمام مخلوقات کا پروردگار ہے

میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے اور

اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئاً اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنَ. (سورہ یٰسین: ۸۲)

اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے فرمادیتا ہے، ہو جا، تو وہ ہو جاتی ہے۔

میں جو بات کہی گئی ہے اور "رفع السمٰوت 'الخ" میں جو فضیلت بیان کی گئی ہے وہ ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ میں سمٹ کر آگئی ہے کہ اللہ جو چاہے گا وہی ہوگا اور لا قوۃ الا باللہ، اللہ کے سوا کسی میں کچھ طاقت نہیں ہے۔

اگر آج مجھ سے کوئی پوچھے کہ امریکہ میں سب کچھ موجود ہے، خدا نے اپنے خزانوں سے اس کو مالامال کر دیا ہے "اَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَّبَاطِنَہٗ" کا مصداق "یَأْتِیْھَا رِزْقُھَا مِنْ کُلِّ مَکَانٍ" کی تصویر۔ موسلا دھار بارش کی طرح برستے تھے، امریکہ کا حال یہی ہے لیکن اگر پوچھا جائے کہ امریکہ دنیا کو امن وسکون کا پیغام کیوں نہیں دے رہا ہے، آج امریکہ دنیا کو ہدایت کا پیغام کیوں نہیں دے رہا ہے؟ وہ مادی تعاون کرتا ہے، معاشی احسانات کرتا لیکن......امریکہ کا کوئی مخلص دوست نہیں۔

امریکہ صحیح آسمانی مذہب سے محروم ہے

امریکہ میں سب کچھ ہے لیکن وہ کتاب الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی نعمت سے محروم ہے۔ یہ سمجھنا کہ یہ کارخانہ خدا چلا رہا ہے اور ہم نے یہ جو کچھ کیا ہے خدا نے کیا ہے اور ہم کو یہ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق صرف کرنا چاہئے اور ہم کو یہ سب

کچھ اس کی بندگی میں صرف کرنا چاہئے، اور ہم خدا کے غلام ہیں، اسی سے وہ یکسر نا آشنا ہے، ملک میں اگر کسی چیز کی کمی ہے تو اسی چیز کی کمی ہے۔

"جنتین من اعناب" تو ہیں لیکن "ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ" نہیں لیکن جنت ارضی کا مالک وہی ہو سکتا ہے جس کی نشاندہی قرآن نے کی "مثل الرجلین" میں سے احد الرجلین جو ہے وہ خالص مادہ پرست ہے، باغی ہے، خدا کا ناشکرا ہے، مادیت پرست اور خود پرست ہے اور دوسرا انسان مومن ہے وہ کمزور ہے، اس کے پاس "جنتین من اعناب" نہیں ہے وہ باغات سے محروم ہے، لیکن وہ مومن ہے خدا نے اس کو ایمان کی دولت دی ہے۔

"کلتا الجنتین آتت اکلھا" دونوں باغوں نے کوئی کمی نہیں کی، جیسے کوئی چیز ابل پڑی ہے، دونوں باغ اس طرح ابل پڑے جیسے چشمے ابلتے ہیں، ان کے اندر کی طاقتیں اور شادابی ابل پڑی، انھوں نے کوئی کمی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

اب دوسرے بھائی کی باری آتی ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن اس میں صرف اس کی ضرورت ہے کہ ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ کا اضافہ کر لیا جائے "لَوْلَا اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَاشَاءَ اللّٰهُ الخ" جب تم نے اپنے باغ میں قدم رکھا تھا تو کہتے ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ، یہ سب خدا کا فضل، اس کی دین اس کی رحمت و قدرت کا کرشمہ ہے۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

"ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ" دراصل سارے قصہ کی جان ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اور آپ کے ساتھ قرآن مجید کے پڑھنے والے

کو اس کی ترغیب دی ہے کہ وہ اپنا سارا معاملہ اور ساری طاقت وصلاحیت کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دے اور مستقبل کے ہر ارادہ اور نیت کو اس کے سپرد اور اس کی مشیت کے ساتھ مشروط اور وابستہ رکھے:-

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَيْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَداً. اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللهُ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَداً.

(سورہ کہف۔ ۲۳-۲۴)

اور کوئی بات ہو مگر کبھی ایسا نہ کہو "میں کل اسے ضرور کر کے رہوں گا" الا یہ کہ سمجھ لو، ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا اور جب کبھی بھول جاؤ تو اپنے پروردگار کی یاد تازہ کر لو، تم کہو "امید ہے میرا پروردگار اس سے بھی زیادہ کامیابی کی راہ مجھ پر کھول دے گا۔"

اور ہر موقع پر دل سے ماشاء اللہ اور انشاء اللہ کہتا ہو۔

جو شخص ہر فضل و کمال کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہو اور ہر نیت میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہو اور اس کے فضل و کرم کا امیدوار ہو وہ اسباب ظاہری، مادیت اور مادہ پرستوں کے سامنے اپنا سر کیسے جھکا سکتا ہے، اور نفس اور نفسانی ارادہ کے ہاتھ میں اپنی زمام کار کیسے دے سکتا ہے؟

"ماشاء اللہ" اور "انشاء اللہ" بظاہر بڑے ہلکے پھلکے لفظ ہیں اور اکثر ان کا استعمال بغیر سوچے سمجھے کیا جاتا ہے اور اس کے پیچھے کوئی احساس و شعور نہیں ہوتا لیکن درحقیقت یہ دونوں بڑے وزنی، بڑے گہرے اور معانی و حقائق سے لبریز بول ہیں، اور اندھی مادیت نفس، اور ارادۂ انسانی پر بھروسہ و اعتماد پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔(۱)

(۱) مشترک اخذ و تلخیص از

۱۔ معرکۂ ایمان و مادیت، ص ۴۳ تا ص ۷۹

۲۔ نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں، ص ۵۵ تا ۶۰

جدید ترین اسالیب و آلات تسلی وتفریح

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ. وَّيَتَّخِذَهَا هُزُواً. اُوْلٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ. (سورہ لقمان۔٦)

اور کوئی انسان ایسا بھی ہے جو اللہ سے غافل کرنے والی باتیں خرید تا ہے تا کہ اللہ کی راہ سے بے سمجھے بوجھے (دوسروں کو) گمراہ کرے اور اس راہ کی ہنسی اڑائے، ایسے ہی لوگوں کے لئے ذلت کا عذاب ہے۔

لہو لعب اور تمتع و تفریح کے ساز و سامان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق کھیل مقابلوں اور مظاہروں سے حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی اور محویت وانہماک سے ہے۔(۱) دوسری قسم لطف و تفریح کی گفتگو ہے جس میں پڑ کر لوگ فرائض وواجبات اور ذکر اللہ سے غافل ہو جاتے ہیں، اس میں کہانی قصے اور فحش روایات آتے ہیں، یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں لہو لعب، کہانی قصے دونوں کو یکجا کر دیا ہے

(۱) افسوس ہے کہ کرکٹ اور فٹ بال میچوں اور ٹورنامنٹ سے سعودی عرب اور خلیج کی ریاستوں کی دلچسپی بڑھتی جارہی ہے اور ان پر گرانقدر وہوش ربا رقمیں صرف ہوتی ہیں، تماشہ دیکھنے والوں کا ہجوم ناقابل قیاس ہے، وقت اور مال کا یہ زیاں ہر طرح افسوسناک ہے، معلوم نہیں کتنے آدمیوں کی نمازیں قضا ہوتی ہوں گی، ان ممالک کے علماء اور ذمہ داروں کے سوچنے اور توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

اور اس کو "لہو الحدیث" سے تعبیر فرمایا ہے۔

قرآن کا ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ یہ آیت آج کے جدید ترین اسالیب و آلات، تسلی و تفریح پر بھی منطبق ہوتی ہے، خصوصاً ویڈیو و ٹیلی ویژن پر تو پوری طرح منطبق ہوتی ہے، اس لئے یہ بیک وقت لہو بھی ہے، اور حدیث بھی، تطبیق کی تکمیل آیت کریمہ کے اگلے لفظ سے مزید ہو جاتی ہے کہ فرمایا:-

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" (اور لوگوں میں بعض ایسے ہیں جو بیہودہ حکایتیں خریدتے ہیں تاکہ لوگوں کو بے سمجھے خدا کے راستہ سے گمراہ کریں۔

اب دیکھئے کہ اس کے حصول کے لئے رقم خرچ کرنے اور بازار سے خریدنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے صرف نام لینا رہ گیا ویڈیو اور ٹی وی کا، قرآن تو عربی زبان میں ہے، اس میں انگریزی کا لفظ کیسے آتا، عقل کی بات نہیں تھی، لیکن قرآن کا اعجاز معلوم ہوتا ہے کہ آج سے چودہ سو برس پہلے جو کتاب نکلی، اگر میں مسجد میں بیٹھ کر کہوں کہ اس میں ٹی وی اور ویڈیو کا ذکر ہے تو میں غلط نہیں کہوں گا، اس لئے کہ قرآن میں کہا گیا "مَنْ يَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِيْث" جو لوگ عربی کی بلاغت سے واقف ہیں اور اس کی زبان کا صحیح ذوق رکھتے ہیں اہل زبان کی طرح، اور محض اللہ کا شکر و انعام ہے کہ ہمیں اسی حجاز و یمن کا فیض پہونچا ہے کہ ہم اس قابل ہوئے، ہمارے استاد عرب تھے (۱) ہم نے ساری عربی عربوں سے پڑھی الحمد للہ! تو ہم "لہو

(۱) شیخ خلیل بن محمد یمانی (مستقل مضمون ملاحظہ ہو "پرانے چراغ اول")

الحدیث" کا لطف لے رہے ہیں۔ ہمارا عربی کا ذوق "لہو الحدیث" کے دائرے کی وسعت کو دیکھ رہا ہے، میں اس لفظ کا ترجمہ نہیں کر سکتا حالانکہ لکھنؤ کا رہنے والا ہوں، میں اقرار کرتا ہوں کہ میں لہو الحدیث کے ترجمہ کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس کے معنی ہیں باتوں کا کھیل، اب بتایئے ریڈیو اور ویڈیو وغیرہ میں کیا ہے، اگر یہ ہوتا کہ بہت سے لوگ ہیں جو کھیل کو پسند کرتے ہیں کھیل خریدتے ہیں تو اس میں ویڈیو اور ٹی وی نہ آتا مگر باتوں کا کھیل کہا گیا یہ وہ ہے جو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ قرن اول، قرن ثانی، قرن ثالث، قرن رابع، اور پانچویں، چھٹی، ساتویں، آٹھویں یہاں تک کہ میں کہوں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا ذہن بھی یہاں تک نہیں گیا ہوگا، (یعنی ویڈیو اور ٹی وی کی طرف) یہ قرآن کا معجزہ ہے "حدیث" کا "لہو" باتوں کا کھیل، اور وہ کیا ہے؟ یہ ویڈیو کا پروگرام، ٹی وی کی بولتی تصویریں، یہ ویڈیو، یہ رکارڈ جو سنے جاتے ہیں سب "لہو الحدیث" ہیں۔

آج سے چودہ سو برس پہلے جب یہ سب چیزیں ایجاد ہونا تو درکنار، کسی نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا، اس وقت کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اس وقت اللہ کی کتاب نے کہہ دیا، بہت سے لوگ ہیں جو "لہو الحدیث" خریدتے ہیں۔(۱)

---

(۱) مشترک اخذ و تلخیص ۱۔ کاروان زندگی حصہ چہارم، ص ۱۴۱-۴۰

۲۔ قرآن کا مطالبہ مکمل اطاعت و کامل سپردگی، ص ۲۶-۲۷

مغربی فکر وادب کی بے راہ روی کا بنیادی فرق

قرآن مجید کی دو آیتیں اس وقت مجھے یاد آرہی ہیں جن میں مغرب کی صاف تصویر نظر آتی ہے اور ان میں مغربی ذہن کی نقاب کشائی کی گئی ہے، عربی داں حضرات، ادبی ذوق رکھنے والے اور قرآن کی زبان وبیان سے مناسبت رکھنے والے ان آیتوں اور ان الفاظ کے آفاق واعماق تک پہونچنے کی کوشش کریں گے، میں ان کا صحیح اور مکمل ترجمہ کرنے سے قاصر ہوں، ان دو آیتوں میں ایک سورہ نمل کی یہ آیت ہے:-

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُمْ مِنْهَا عَمُوْنَ.

بلکہ تھک کر گر گیا ان کا فکر آخرت کے بارہ میں بلکہ یہ لوگ اس سے شک میں مبتلا ہیں بلکہ یہ اس سے اندھے ہو رہے ہیں۔

(سورہ نمل۔۶۶)

میں معذرت کے ساتھ کہتا ہوں، منزل قرآن اور صاحب قرآن سے تو معذرت کی جرات نہیں کر سکتا، لیکن قران کی بلاغت اور قرآن کے اعجاز سے معذرت کے ساتھ میں "بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ" کا ترجمہ کرتا ہوں کہ ان کا

علم پنکچر ہو گیا، آخرت کے بارہ میں اور مجھے مغرب کی صورتحال اور اس کے علمی واختراعاتی سفر کی اس سے بہتر تشبیہ نظر نہیں آتی کہ جیسے کوئی کار چل رہی ہو اور اچانک اس میں کوئی ایسا نقص پیدا ہو جائے کہ اس کی تمام توانائیاں ختم ہو جائیں اس کے لئے پنکچر سے بہتر کوئی لفظ نہیں، ذرا دیکھئے اور غور کیجئے کہ وہ علم خاصا چل رہا تھا، اطمینان سے سفر طے کر کے آیا تھا، جس نے عقلیات پر، طبیعات پر، ریاضیات پر اور مابعد الطبیعات تک میں اپنی فکر کی جولانی اور ذہن کی تابانی دکھائی، وہی علم جب واجب الوجود کی ذات و صفات تک پہونچا اور آخرت یعنی اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کے مرحلہ تک پہونچا تو "ادَارَكَ عِلْمُهُمْ" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اچانک پہیہ سے ہوا نکل گئی اس آیت کے بعد کے الفاظ میں مغرب کی مختلف ذہنی کیفیات یا مختلف طبقات کی تصویر نظر آتی ہے کہ "بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا" وہ اس کے بارہ میں شک میں مبتلا ہیں "بَلْ هُمْ مِنْهَا عَمُوْنَ" بلکہ وہ اس کے معاملہ میں بالکل بے بصیرت ہیں۔

دوسری آیت جس کو امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب "النبوات" کی گویا اساس بنایا ہے یہ ہے:-

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَاوِيْلُهُ. (یونس۔۳۹)

بلکہ انھوں نے جھٹلادیا ان چیزوں کو جن کا ان کے علم نے احاطہ نہیں کیا۔

مغرب کی یہ خام خیالی ہے کہ جو مشہود نہیں، وہ موجود نہیں، موجودات کو مشہودات میں محدود کرنا یہ علم انسانی اور عقل انسانی کی شدید کمزوری ہے، جسے مغرب نے علمی رنگ دے دیا ہے اور یہ انسان کی بڑی بدقسمتی ہے بلکہ انسانیت کے حق میں زیادتی ہے اور فیض الٰہی سے محروم علم اور نبوت میں یہی فرق ہے، جس کو حضرت

ابراہیم علیہ السلام نے بہت ہی سادہ لفظوں میں بیان کیا ہے:

اَتُحَاجُّوْنِّیْ فِی اللّٰہِ وَقَدْ ھَدٰنِ. (الانعام۔۸۱)

تم مجھ سے کٹ حجتی اور بحث کر رہے ہو خدا کے بارہ میں؟ جبکہ وہ مجھے ہدایت سے نواز چکا، جب وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اس راستہ پر لگا چکا تو اس میں شک یا کلام کی گنجائش کہاں؟

کوہ صفا کی تقریر کا حاصل بھی یہی ہے کہ آپ ﷺ پہاڑ کی چوٹی پر تھے اور لوگ نیچے وادی میں، آپ نے کہا اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک فوج بیٹھی ہے اور وہ کسی آن حملہ کر سکتی ہے تو کیا آپ لوگ میری تصدیق کریں گے؟ عرب فلسفہ و تمدن میں مغرب سے پیچھے تھے، لیکن عقل سلیم میں ان سے بہت فائق ثابت ہوئے، انھوں نے دیکھا کہ بات ایک ایسا شخص کہہ رہا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر ہے، آگے بھی دیکھ سکتا ہے اور پیچھے بھی دیکھ سکتا ہے۔ پھر وہ کبھی غلط بات بھی نہیں کہتا، انھوں نے صفائی کے ساتھ کہہ دیا ہم ضرور تصدیق کریں گے! وہ عرب اپنی سلامت فہم سے وہاں پہونچ گئے، جہاں یونان و روم نہیں پہونچ سکے اور جہاں مغرب آج تک نہیں پہونچ سکا۔ انھوں نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ محض اس بنیاد پر جھٹلانے کا کوئی جواز نہیں کہ ہم نہیں دیکھ سکتے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مغربی افکار و نظریات اور اسلامی حقائق و عقائد کے درمیان جب بھی تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اس فرق کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہئے، اسکے بغیر وہ سر رشتہ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا جس سے ہم اصل حقیقت تک پہونچ سکیں۔"(۱)

---

(۱) ماخوذ از کاروان زندگی حصہ سوم، ص ۲۲۳ تا ص ۲۲۵

شیطانی ترغیبات

اَلَمْ تَرَ اَنَّا اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ تَؤُزُّھُمْ اَزًّا (سورہ مریم)

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:-"اَلَمْ تَرَ اَنَّا اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ "تم نے دیکھا نہیں کہ تم نے شیطان کو بھیجا کافروں پر۔"تَؤُزُّھُمْ اَزًّا" اور ان کو وہ ابھار ابھار کر اچھالتے ہیں۔

یہ "تَؤُزُّھُمْ اَزًّا" دو لفظ ہیں، "تَؤُزُّھُمْ اَزًّا" از ،یؤز،ازّا، سے، لیکن ان کے مظاہر، ان کی شکلیں، اور ان کے درجات اور ان کے وسائل اتنے کثیر ہیں کہ جو شمار میں نہیں آسکتے، یہ شیاطین کثرت سے اپنے ماننے والوں کو ابھارتے ہیں، کیا کیا لالچیں دیتے ہیں، کیا کیا رشوتیں دیتے ہیں، کیا کیا ان کے اندر محرکات اور کس کس طرح سے پیدا کرتے ہیں، کس طرح ان کے لئے ان کو آسان بناتے ہیں، کس طرح ان کی ترغیب دیتے ہیں؟

یہ سب ان دو لفظوں میں آگیا ہے، "تَؤُزُّھُمْ اَزًّا"(ان کو ابھارتے ہیں اچھال کر)یعنی کبھی ان کے کان میں کچھ منتر پھونکتے ہیں۔ کبھی ان کے سامنے کوئی نقشہ لاتے ہیں، کبھی ان کو کوئی امید دلاتے ہیں، کبھی ان کے سامنے کچھ ایسے آثار پیدا ہو جاتے ہیں، جن سے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں اور ہمیں یہ گناہ کرنا چاہئے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ تشریعی چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کافروں پر

شیاطین کو بھیجتا ہے، تو ان کافرین کے لئے جواز پیدا ہو جاتا ہے، بلکہ یہ اللہ تعالی اپنا انتظام TEST بتاتا ہے، اس کی اطلاع دیتا ہے کہ شیاطین کو امتحاناً اس کا موقع دیا جاتا، کہ وہ اپنے ماننے والوں کے پاس، ہمارے منکروں کے پاس جائیں اور ان کو مختلف ترکیبوں سے گناہوں پر ابھاریں۔

اس کی شکلیں اگر لٹریچر کا مطالعہ کریں اور آج کل ٹی وی (T.V) اور ریڈیو وغیرہ دیکھیں، ناولوں کو پڑھیں، سنیما کا کبھی آپ کو اتفاق ہوا ہو، یا آپ نے سنا ہو، اسی طریقہ سے مالی ترغیبات، جنسی ترغیبات، سیاسی ترغیبات اور اقتدار کی لالچیں اور اپنے مقصد تک پہونچنے کے راستے، اور ان کو جن کو "زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ" اللہ فرماتا ہے (شیطان نے آراستہ کردیا) یہ سب 'تَؤُزُّهُمْ اَزًّا'' میں آجاتا ہے۔

یعنی اس وقت جو کچھ دنیا میں، امریکہ میں، یورپ میں، مشرقی ممالک میں، اسلامی ممالک میں، جو گناہوں کی ترغیبات، اور خدا کی نافرمانیوں کے جو راستے ہیں، اور جو لوگوں کے سامنے مقاصد آتے ہیں، مطمع نظر آتے ہیں، اور پھر ان کے لئے وہاں تک پہنچنے کے راستے دکھائی دیتے ہیں یا وہ راستے نکالتے ہیں، یہ سب "تَؤُزُّهُمْ اَزًّا" میں آتا ہے۔

اس طرح شیاطین کا ایک جال بچھا ہوا ہے کہ جو ترغیبات کے ذریعہ امیدیں دلا کر، اور سبز باغ دکھا کر، اور مثالیں اور نمونے پیش کر کے اور اندر سے اس کے لئے جذبات اور تقاضے پیدا کر کے اور ان کے سامنے لاکر جو اس کی ترغیب دیتے ہیں، قرآن مجید میں اس طرح آیا کہ ان کے جو رفقاء ہیں ان کے سامنے وہ ان کو مزین کر کے دکھاتے ہیں، ان کو ابھارتے ہیں گناہوں پر۔ اور جس طریقہ سے کہ نیکیوں کے انصار اور حامی ہوتے ہیں، ترغیبات ہوتے ہیں، آسمانی کتابوں کے ذریعہ، حدیث

وسیرت کے ذریعہ اور روحانیت کے راستے سے اور اللہ تعالی کے مخلص ومقبول بندوں کی زبان سے، جن کے واقعات تاریخ میں ملتے ہیں کہ سیدنا عبد القادرؒ، امام حسن بصری کے مواعظ میں دیکھیں گے، ان کے اثرات کو کہ لاشیں نکلتی تھیں ان کے مواعظ کے جلسوں سے، اور بیسوں اور سیکڑوں کی تعداد میں عیسائی اور یہودی اسلام لاتے تھے، اور جرائم پیشہ لوگ جن کو "شتارین" کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے، عربی تاریخ اور رعربی لٹریچر میں، وہ جرائم پیشہ لوگ اور حیلہ باز اور چوری کرنے والے عیار لوگ توبہ کرتے تھے، اسی طرح ہندوستان میں اس وقت جو اذانین ہو رہی ہیں، اس ملک میں آج جو اسلام موجود ہے، یہ سب خواجہ معین الدین چشتی کا فیض ہے، تو جس طریقے سے ان کے یہاں اثرات دیکھتے ہیں۔

ایسے ہی برے اثرات آپ دیکھ لیں شیطانی حلقوں میں، کہ ان پر شیطان کا تسلط ہے، شیطان کا قابو چل گیا ہے، اس کے لئے اللہ تعالی نے عربی کے دو بلیغ لفظوں میں سب کچھ کہدیا "تؤزھم ازا" ان کو وہ ابھارتے ہیں، اچھال کر، جیسے گیند اچھالی جاتی ہے، جس میں بچوں کو اٹھا اٹھا کر اونچا کیا جاتا ہے، جیسے کسی گری پڑی چیز کو آپ لوگوں کو اٹھا کر دیتے ہیں، تو وہ اصل میں ان کی فطرت تو ہے پستی یعنی وہ چیزیں اپنی حقیقت کے لحاظ سے اور نتیجے کے لحاظ سے، اپنی ساکھ اور اپنے مادے کے لحاظ سے وہ پست ہیں، لیکن وہ ان کو اونچا کر کے دکھاتے ہیں، تاکہ وہ آمادہ ہوں۔ تو اس "تؤزھم ازا" میں سب آجاتا ہے، یوں اس کا ترجمہ تقریباً محال ہے پورے طور پر کسی زبان میں، عربی میں بھی اس کو ادا کرنا مشکل ہے۔(۱)

(۱) تفسیر سورہ مریم غیر مطبوعہ کیسٹ سے نقل کر کے قلمبند کی گئی۔

کامیابی کا مادی نقطۂ نظر

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ آیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ آمَنُوْا اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِیًّا. وَکَمْ اَهْلَکْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِئْیًا.

(سورہ مریم: ۷۳-۷۴)

"اور جب ہماری آیتیں ان کو واضح طریقہ پر سنائی جاتی ہیں تو کافر (بول اٹھتے ہیں) ان لوگوں سے کہتے ہیں جو ایمان لائے کہ دونوں گروہوں سے کس کو زیادہ اچھی جگہ (حاصل) ہے اور کس کے پاس زیادہ سامان اور کون دیکھنے میں (اس وقت) زیادہ اچھا ہے۔"

ان آیات میں بڑی عبرت بھی ہے اور بشارت و تسکین کا سامان بھی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

"جب ہماری آیتیں ان کو کھلی کھلی واضح طریقہ پر سنائی جاتی ہیں "قَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْ" اس وقت کافر بول اٹھتے ہیں، ان لوگوں سے کہتے ہیں، ان کو خطاب کرتے ہیں "لِلَّذِیْنَ آمَنُوْا" جو ایمان لائے "اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِیًّا" ذرا انصاف کرو، دیکھو تو ہم اور تم دو گروہ ہیں ان دونوں گروہوں میں سے کون اس وقت زیادہ آرام سے ہے۔ کس کو زیادہ اچھی جگہ حاصل ہے۔ اور کس کا اچھا منظر ہے۔

"اَحْسَنُ نَدِيًّا" کس کے پاس زیادہ سامان اور اس وقت کون دیکھنے میں زیادہ اچھا ہے۔ یہ ہم کیسے مان لیں، یہاں تو ہم آرام کر رہے ہیں، ہم عیش کر رہے ہیں، مزے لوٹ رہے ہیں، ہم عزت کے ساتھ ہیں، ہم کوٹھیوں پر رہے ہیں اور تم جھونپڑیوں میں رہ رہے ہو۔ (وہاں مسلمانوں اور کفار کا فرق تھا، بہت سے مسلمانوں اور کفاروں کے درمیان) تو یہ اب کیسے الٹ جائے گا وہاں (آخرت میں) جا کر؟ کہ تم جنت کے محلات میں رہو گے۔ اور ہم کو کہتے ہو کہ ہم جہنم میں جائیں گے اس کی کیا دلیل ہے؟

یعنی یہ انسان نے (مادی اعتبار سے) قیاس کیا ہے، وہ قصہ جو "صاحب الجنتین" کا سورہ کہف میں آیا ہے۔ اس میں دو طریقہ پر جس کو اللہ نے دو باغ دیئے تھے اور وہاں نہریں جاری کردی تھیں اور باغ پھل دے رہے تھے، اور انگور کی کیاریاں اور کیا کیا سب ...... اس نے کہا کہ یہاں جو میرا حال ہے وہی حال مرا وہاں بھی ہوگا۔ بڑی صراحت کے ساتھ کہدیا گیا "وَلَئِنْ رُدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا" (میں جب لوٹایا جاؤں گا اپنے رب کی طرف تو میں اس سے بہتر پاؤں گا۔ انسان کے اندر یہ غلط قیاس کی ایک مشترک چیز ہے کہ جب ایک دور گزرتا ہے اچھا، آرام کا، عزت کا، یا حکمرانی کا، اقتدار کا، تو آدمی اس پر قیاس کرتا ہے کہ پھر یا تو یہی باقی رہے گا یا اگر کوئی تبدیلی آئی تو اس سے بہتر چیز ہمیں ملے گی۔ تو اس میں "صاحب الجنتین" نے جو بات کہی اللہ تعالیٰ یہاں نقل کر رہا ہے۔ "ای الفریقین خیر مقاما واحسن ندیا" ذرا نظر اٹھا کر دیکھو! تم کہاں کی باتیں کرتے ہو، خیالی باتیں کرتے ہو؟ دوسری دنیا کے عیش اس وقت کس کو حاصل ہیں؟ کون کوٹھیوں پر رہ رہا ہے؟ کون مزے کر رہا ہے اور کس کا ڈنکا بج رہا ہے؟

تمہارا حال یہ ہے کہ تم کو کھانے کو بھی پورے طور پر نہیں ملتا، کبھی فاقہ ہوتا ہے، کبھی کھانے کو ملتا ہے پہننے کے لئے پورا کپڑا اور تمہارے پاس رہنے کے واسطے مکان اور ٹھکانے کی جگہ نہیں ہے۔ تو کیسے مان لیں، یہ الٹ جائے گا سارا معاملہ؟ اور مرنے کے بعد سب کچھ تم کو مل جائے گا اور ہم محروم رہ جائیں گے؟

یہ انسان کی ایک کمزوری ہے کہ وہ ایک اچھی حالت پر دوسری حالت کو قیاس کرتا ہے اور وہ یہ فرق نہیں سمجھتا کہ پیمانہ بدل جائے گا تو پھر کیا ضروری یہاں کا پیمانہ کچھ ہے وہاں کا پیمانہ کچھ! یہاں کا پیمانہ ہے وراثت، یہاں کا پیمانہ ہے مفت میں دولت مل جانا، یہاں کا پیمانہ ہے محنت اور کوشش، یہاں کا پیمانہ ہے ان فنون کو جاننا، ان طریقوں کو جاننا جن سے دولت ملتی ہے کہ ان کی ٹکنالوجی اور امتحانات اور ڈگریاں یہ پیمانہ ہے یہاں کا، کچھ عالم اسباب میں یہ سبب ہے راحت کا۔

آخرت کا پیمانہ دوسرا ہے

لیکن اس عالم میں پیمانہ دوسرا ہے۔ اس (آخرت) کا پیمانہ ہے عقائد، اس کا پیمانہ ہے نیک اعمال، اور اس زندگی میں کیا کام کئے تھے، وہاں پیمانہ ہے اللہ کی رضا، عدم رضا تو جب پیمانے بدل گئے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ملک کی حالت کو دوسرے ملک کی حالت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں کے پیمانہ کچھ ہیں، امریکہ کے پیمانہ کچھ اور ہیں۔ وہاں مثلاً دولت حاصل کرنے کے طریقہ اور یہاں اور، اور وہاں جن لوگوں کو دولت حاصل ہوتی ہے ان کی حیثیت، ان کا ماضی، ان کا سرمایہ، ان کا امتیاز کچھ اور ہے اور ہمارے یہاں کچھ اور ہے، ہمارے یہاں ایسا ہوتا ہے کہ مفت میں ایک کروڑ پتی کا لڑکا

لکھ پتی کا لڑکا، لکھ پتی اور کروڑ پتی ہے یا یہ کہ کسی کو دفینہ مل گیا، یا کسی پر کوئی مہربان ہے، اس کو دیدیا۔ لیکن ان ملکوں میں محنت ہے، لیاقت ہے، امتیاز ہے، تفوق ہے۔

تو جب ہم ایک ملک کے پیمانہ کو، ایک ملک کی حالت کو دوسرے ملک کی حالت پر قیاس نہیں کر سکتے، اس لئے کہ پیمانے مختلف ہیں، تو ایک عالم کو دوسرے عالم پر، ایک عالم کی حالت کو دوسرے کی حالت پر کیسے قیاس کر سکتے ہیں؟ کہ وہاں تو پیمانے بالکل ہی مختلف ہیں اور یہاں کے پیمانے اگر مٹھی بھر کے ہیں یا بالشت بھر کے ہیں تو وہاں (آخرت) کے پیمانے تو میلوں تو کیا زمین و آسمان کے پیمانے ہیں۔ وہاں پیمانہ ہے ایمان و کفر، وہاں پیمانہ ہے اللہ تعالیٰ کا خوش ہونا، راضی ہونا اور ناراض ہونا، وہاں کا پیمانہ ہے نبی کی اتباع کرنا، یا نافرمانی کرنا، وہاں کا پیمانہ حدود پر چلنا یا حدود شکنی کرنا۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ تو سطحی نظر کے لوگ ہیں جب ان کو ایمان کی دعوت دی جاتی ہے تو کہتے ہیں "اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَاماً وَّاَحْسَنُ نَدِیًّا" ذرا دیکھو تو نظر اٹھا کر، جائزہ لو کہ کون یہاں آرام کر رہا ہے۔ کون یہاں عزت کے ساتھ ہے؟ مطلب یہ ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا تو اللہ فرماتا ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا کوئی جواز نہیں۔ اس لئے کہ یہاں تو اللہ نے محنت دی ہے، "کھاؤ، کماؤ محنت کرو" جو زیادہ محنت کرے گا وہ زیادہ اچھا مکان بنالے گا۔ زیادہ آرام کے ساتھ رہے گا۔ جو زیادہ یہاں کے علوم و فنون میں قابلیت پیدا کرے گا، جو رائج الوقت ہیں، وہ زیادہ امتیازات کے ساتھ رہے گا۔

لیکن وہاں تو اس کی بالکل کوئی قیمت نہیں۔ "اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُھُمْ فِی الْحَیَاۃِ الدُّنْیَا وَھُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا" (الکہف) یہاں پر جو لوگ کام کر رہے

ہیں وہ سمجھتے ہیں "اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا" ہم بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے "ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا" ان کی سب کوشش دنیا کے میدان اور دنیا کے دائرہ میں صرف ہو رہی ہیں۔ اور آخرت میں کچھ کام نہیں آئیں گی۔

پچھلی تاریخ پر نظر ڈالو

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اور ان کو سمجھانے کے لئے دوسری مثال دیتا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ "اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا" کہ دیکھ لیجئے کون یہاں زیادہ بہتر جگہ پر، عزت کی جگہ پر رہ رہا ہے اور کون زیادہ نظر میں بہتر ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اچھا ذرا آخرت تو دور ہے۔ اس کو وہاں جا کر دیکھو گے، پچھلی تاریخ پر نظر ڈالو، ابھی کل کی بات ہے۔

"كَمَا اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ" کتنی ہم نے ایسی نسلوں کو، ایسی قوموں کو اور ایسی بستیوں کو تباہ کر دیا" هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِئْيًا" جو اپنے اثاث وسامان، یہاں "اثاث" کا ترجمہ فرنیچر بھی کیا جاسکتا ہے تو اس فرنیچر میں اور سامان آرائش میں اور دیکھنے میں کہیں بہتر تھے۔

اگر اللہ تبارک وتعالیٰ ان سب چیزوں کے باوجود ان کو ہلاک کر سکتا ہے اور کچھ کام نہیں آئیں وہ چیزیں تو پھر اس عالم کے ختم ہونے کے بعد اس نئے عالم کے شروع ہونے کے بعد کیا کام آئیں گی؟ اگر کام آئیں تو ان ہی کے کام آئیں۔ "وَهُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِئْيًا" وہ سامان میں۔ اب دیکھئے وہ زمانہ زیادہ سامان کا نہیں تھا لیکن قرآن مجید ابدی کتاب ہے آج "اثاث" کی بڑی اہمیت ہے، پہلے اثاث کی اتنی اہمیت نہیں تھی۔

تمہارے پاس یہ ہے کہ نہیں؟ تمہارے یہاں ایر کنڈیشن ہے کہ نہیں، تمہارے یہاں کرسیاں کتنی ہیں، میزیں کتنی ہیں؟ یعنی تمہارا ڈرائنگ روم کیسا ہے؟ ڈرائنگ روم دیکھنے میں سجا ہوا ہے کہ نہیں؟ اس سے آدمی کے مرتبہ کا اندازہ کیا جاتا ہے اور اس کو درجہ دیا جاتا ہے اور ڈرائنگ روم کیسا ہے، ڈرائننگ ہال کیسا ہے اور تمہارے یہاں باتھ روم اٹیچڈ ہے یا نہیں؟ کوئی مہمان آئے گا کہاں ٹھہرے گا؟ یہ سب چیزیں آج کل چل رہی ہیں۔

اثاث کی قدر و قیمت

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثاً وَّرِئْيًا" (جو بہتر تھے اثاث میں) جس وقت قرآن مجید نازل ہو رہا تھا ہمارا اندازہ ہے قیاس ہے کہ اس کے سننے والے جو عرب کے بادیہ نشین تھے، عرب کے محدود اثاث زندگی میں رہتے تھے وہ "اثاث" کی اہمیت اور "اثاث" کی قدر و قیمت اتنی نہیں سمجھ سکے ہوں گے۔ جتنی آج ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ہم میں سامان آسائش کے لحاظ سے کون بہتر ہے، تو عربوں کے ذہن میں یہ آیا ہوگا کہ بھگونہ تھا کہ نہیں تھا، چولہا تھا کہ نہیں تھا، وہ برتن کچھ مکمل تھے کہ نہیں تھے، کہ ان سے کھانا پکا لیا جائے، یہی ان کی زندگی تھی، بادیہ کے رہنے والے، اونٹ کا دودھ پینے والے اور اونٹ کا دودھ مل جائے اور روٹی ہوئی نہ ہوئی اور کھجور کے ساتھ گذارا کر لیا کرتے، تو یہ ان کے کھانے پینے کا حال تھا، اور گھروں کا حال۔ غرض کہ تمدن بہت ابتدائی حالت میں تھا۔

"اَحْسَنُ اَثَاثاً وَّرِئْيًا" "اثاث" جس کا ابھی ہم نے ترجمہ فرنیچر کیا ہے وہ اس

کے لحاظ سے بھی بالکل اس عہد میں اس کی وسعت اور اس کی اہمیت اور س کا مفہوم سمجھنا زیادہ آسان ہو گیا کہ یہ بتاؤ! ان میں کون اپنے سامانِ آرائش و سامان آسائش کے لحاظ سے بہتر تھا، کون دیکھنے میں بہتر تھا؟ کہ دیکھ کر آدمی مرعوب ہو جائے کہ ...... اوہ ...... اتنا سامان؟ تو کیا ہوا؟ "وَاَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ" ہم نے ان بستیوں کو ایسے ہلاک کر دیا جیسے کبھی کوئی چیز کام نہیں آئی۔ اس وقت ان کو خاک میں ملا دیا۔ اور بالکل جھاڑو پھیر دی۔ (ان کے سامان کے لحاظ سے جھاڑو پھیرنے کو اب بھی مناسبت ہے) تو اس سامان پر ہم نے جھاڑو پھیر دی۔ بہت سی جھاڑوں پر ایسی جھاڑو پھیر دی کہ بہت سی جھاڑوئیں تھیں ان سب پر ہم نے ایک اپنی جھاڑو پھیر دی لمبی جھاڑو، سب گیا۔ (۱)

قرآن مجید کی نظر میں اس زندگی کی جس کی ابدیت پر یہ مادہ پرست ایمان لائے ہیں اور جس کو منفعت پرستوں اور لذت پرستوں نے اپنا مرکز اور معبود بنالیا ہے صرف اتنی ہی حقیقت ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ وہ ان پیمانوں اور پیمائشوں کو غلط اور بے بنیاد قرار دے کر (جن پر تنگ نظر ظاہر پرستوں اور اسباب کے گرفتاروں نے پورا اعتماد کر رکھا ہے اور اس سے بڑی توقعات اور آرزوئیں قائم کر لی ہیں) ایمانی پیمانوں کو قابل ترجیح اور معیار صحیح قرار دیتا ہے۔ (۲)

---

(۱) تفسیر سورہ مریم غیر مطبوعہ کیسٹ سے نقل کر کے قلمبند کی گئی۔

(۲) معرکہ ایمان و مادیت، ص ۸۵

اہل ایمان میں فواحش ومنکرات کا رواج

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ آمَنُوْ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالآخِرَةِ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. (سورۂ النور)

جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں بے حیائی پھیلے، انکو دنیا اور آخرت میں دکھ دینے والا عذاب ہوگا۔ اور خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

یہ آیت ایک معجزہ ہے۔ جس وقت یہ آیت ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین آمنوا نازل ہوئی تھی، مدینہ طیبہ کے محدود معاشرے میں ایک خاص واقعہ پیش آیا تھا۔ اس واقعہ کا لوگ اپنی مجلسوں میں چرچا کرنے لگے۔ مجلسیں کتنی بڑی تھیں، وہ واقعہ کتنا بڑا تھا، کن افراد سے اس کا تعلق تھا، یہ ساری چیزیں ایسی تھیں کہ قرآن مجید کی اس آیت کی وسعت اس سے زیادہ تھی۔ وہ قرنوں سے بڑھ کر اور تاریخی اور جغرافیائی فاصلوں سے آگے بڑھ کر کچھ اور چاہتی تھی۔ آج ہم اس آیت کی تفسیر دیکھ رہے ہیں۔ "اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ آمَنُوْ" جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اہل ایمان میں فواحش اور منکرات کی محبت کا رواج ہو، اس کا تصور آج صحافت، ٹیلی ویژن، ریڈیو کے اس دور میں ناولوں کے اس دور میں، پکچر اور فلم کی ترقی کے اس دور میں اور لٹریچر اور فلسفوں کے اس دور میں اس کی جیسی تفسیر نہیں، بلکہ

تصویر دیکھی جاسکتی ہے، کسی اور زمانہ میں مشکل ہے۔ مدینہ کے اس ماحول میں لوگوں نے ایمان بالغیب سے کام لیا ہوگا اور انھوں نے اس کا انطباق کیا ہوگا۔ کسی مخصوص واقعہ پر، لیکن آج دنیا کی ساری طاقتیں جس طرح ان تشیع الفاحشۃ پر لگی ہوئی ہیں اس کا اس سے پہلے کیا اندازہ ہو سکتا تھا۔

ہمارے معاشرے میں تخریبی طاقتیں جس طرح اخلاقی انار کی اور بغاوت پھیلا رہی ہیں ان کے پاس وہ وسائل ہیں جو رات کو دن اور دن کو رات ثابت کر سکتے ہیں، نور کو ظلمت اور ظلمت کو نور بنا سکتے ہیں۔

دنیا کی سیاسی، اقتصادی، اجتماعی تنظیمات سب کا حال یہی ہے۔ یورپ، امریکہ اور روس کی حکومتوں کو دیکھئے، اسی کے ساتھ مشرقی حکومتوں کو بھی دیکھئے کہ وہ فاسق الخیال فاسد المقصد، جن کے مقاصد تخریبی، جن کی زندگی فاسد، جن کے اخلاق خراب، جن کے افکار و خیالات فاسد، ان سبھوں نے ایک اجتماعی نظام بنالیا ہے اور وہ اجتماعی نظام قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ کر رہا ہے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ اس گروہ کا جادو چل رہا ہے جس کے ہاتھ میں ابلاغ کے ذرائع ہیں جن کی تعریف قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے:-

"اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ آمَنُوْ"(۱)

(۱) ماخوذ از حدیث پاکستان، ص ۵۰-۵۲

باب ۱۱

قانونِ مکافات

"قرآن مجید میں:-

عمل اور جزائے عمل کا بیان اور اللہ تعالیٰ کا قانونِ مکافات پورا پورا موجود ہے۔اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے:-

مسلمانو! نہ تم پر کچھ منحصر ہے اور نہ اہل کتاب پر (جن کو بڑے بڑے دعوے ہیں) ہمارا قانون الٰہی یہ ہے:-

"مَنْ يَّعْمَلْ سُوْءً يُّجْزَبِهٖ" جو کوئی برائی کرے گا اس کو بدلہ ملے گا، کمزوری کا، کوتاہی کا، غفلت کا، غداری کا اور بے وفائی کا، اختلاف کا، بے عملی کا، دولت پرستی کا، اقتدار پرستی کا، سب کا خدا کے یہاں ایک نتیجہ، ایک جزا ہے، جس میں کوئی رعایت اور استثناء نہیں......

یہ مضمون قرآن مجید میں:-

کہیں صراحتاً اور کہیں کنایۃً بیان کیا گیا ہے، اس میں قوموں کے، سلطنتوں کے، بڑے بڑے جباروں کے تذکرے بھی ہیں، اور کمزوروں کا ذکر بھی ہے۔"

(حضرت مولانا مد ظلہ العالی)

بقائے انفع کا بے لاگ قانون

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ، كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ.

"جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لئے نافع ہے وہ ٹھہر جاتی ہے۔ اس طرح اللہ مثالوں سے (اپنی بات) سمجھاتا ہے۔" (سورہ رعد:)

اللہ تعالیٰ کا جو نظام اس کائنات میں جاری و ساری ہے جو ہمیں قرآن مجید کے مطالعہ سے اور تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے وہ بقائے انفع کا قانون ہے۔ یوں تو اس وقت دنیا نے جس قانون کو تسلیم کیا وہ بقائے اصلح کا قانون ہے۔ SURVIVAL OF THE FITTEST ہے لیکن حقیقت میں قرآن مجید سے جو سمجھ میں آتا ہے وہ ہے "بقائے انفع" کا قانون...... صاف صاف قرآن مجید میں ہے، سورہ رعد کی آیت ہے:۔

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ، كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ.

جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لئے نافع ہے وہ ٹھہر جاتی ہے۔ اس طرح اللہ مثالوں سے (اپنی بات) سمجھاتا ہے۔

جس چیز میں کوئی نافعیت نہیں، جس چیز میں کوئی پیام نہیں ہے، جو چیز کوئی اہم

خدمت انجام نہیں دے رہی ہے، جس پر انسان کی بقاء اور نشو اور انسان کی راحت اور ترقی کا کوئی انحصار نہیں ہے۔ اس کو قرآن مجید نے "زبد" کے لفظ سے ادا کیا ہے۔ جو بہت ہی جامع اور نہایت وسیع اور عمیق لفظ ہے۔ اور معانی سے لبریز ہے "زبد" پھین کو کہتے ہیں، یعنی دریا کا جھاگ جو اپنے اندر کوئی ہستی نہیں رکھتا، جس کے اندر ثبات واستقامت کی کوئی صلاحیت نہیں، وہ دریا کے جوش کی ایک نمود ہے، دریا کے جوش کا ایک خارجی ظہور ہے۔ اس کے اندر استقرار نہیں، کوئی صلاحیت نہیں، بس ایک پھولی ہوئی سی چیز ہے۔ جس کے اندر ہوا ابھر گئی ہے، یا کہئے کہ نیچے کا جو میل کچیل تھا وہ اوپر آگیا ہے۔ اس کے اندر انسانوں کو فائدہ پہونچانے کی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ وہ اوپر بہہ جائے گا، یا کنارہ جا کر کسی چیز سے اٹک جائے گا اور باقی نہیں رہے گا۔ اس لئے کہ اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا قانون اس کی اجازت نہیں دیتا کہ "زبد" زیادہ دنوں تک باقی رہے، اس لئے کہ یہ عالم اتنی وسعت نہیں رکھتا کہ اس میں "زبد" کی سمائی ہو، اگر دریاؤں کا جھاگ اور پانی کا پھین اس طرح باقی رہنے لگے تو جن کو باقی رہنا چاہئے ان کے لئے مشکل ہو جائے۔

"وَاَمَّامَا یَنْفَعُ النَّاسُ" لیکن جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہے "فیمکث فی الارض" وہ ٹھہر جاتی ہے۔

بہت سے قومیں دنیا میں ہیں جو بالکل ختم ہو گئیں، لیکن بہت سی قومیں ایسی ہیں جو بار بار شکست کھانے کے بعد بھی باقی ہیں۔ مسلمانوں نے تاتاریوں سے شکست

کھائی تھی، لیکن چونکہ ان کے اندر "وما ینفع الناس" کا مادہ تھا، وہ ایک پیام رکھتے تھے، وہ ایک زندہ دعوت رکھتے تھے، اس لئے تاتاریوں کو ان کے سامنے جھکنا پڑا۔ وہ تاتاریوں کے سامنے جھکے، لیکن تاتاریوں کی تلواروں کو، دلوں کو اور دماغوں کو ان کی نافعیت کے سامنے اور ان کے پیام کے سامنے جھکنا پڑا۔ اس لئے کہ زمانہ جس زبان کو سمجھتا ہے وہ "نفع" کی زبان ہے۔ وہ زندگی کے استحقاق کی زبان ہے۔

یہ ہے خدا کا بنایا ہوا وہ ابدی قانون جس کو قرآن مجید کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ:

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسُ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ، كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ.

جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لئے نافع ہے وہ ٹھہر جاتی ہے۔ اس طرح اللہ مثالوں سے (اپنی بات) سمجھاتا ہے۔

اگر آپ " وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسُ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ" کے مصداق ہوں گے۔ زندگی کا استحقاق ثابت کر دیں گے اور اپنے اندر نافعیت پیدا کر لیں گے یعنی اپنے جوہر کا ثبوت دیدیں گے اور یہ ثابت کر دیں گے کہ زندگی کی کوئی ضرورت ہے جو آپ کے بغیر پوری نہیں ہوتی۔ تو کوئی بے رحم اور بے درد ہاتھ، کوئی ظالم ہاتھ اور کوئی انقلاب و تغیر آپ کے نقش کو مٹا نہیں سکتا۔ اور سچی بات یہ ہے آپ کے لئے انقلاب نہیں ہے۔ آپ کیلئے کوئی تغیر نہیں ہے۔ اس لئے کہ آپ نے اپنی نافعیت ثابت کر دی۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کے لئے خاص طور پر ضمانت ہے جو دین کے ذریعہ دین کے راستہ میں اپنی نافعیت ثابت کر دے۔

جب ہی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا "اللھم ان تھلك هذه العصابة لن تعبد" اے اللہ تیری عبادت کا انحصار ان پر ہے، تیری توحید کا انحصار ان پر ہے، آپ بھی ثابت کر دیجئے کہ اگر مسلمان نہ رہیں تو زندگی بے معنی ہو کر رہ جائے گی یا زندگی ناقص ہو جائے گی۔ اور کم سے کم اس میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو جائے گا جس کا کوئی اور پر نہیں کر سکتا۔(۱)

(۱) پا جا سراغ زندگی تلخیص ص ۱۵۹ تا ص ۱۷۴

خزاں رسیدہ انسانیت کے ساتھ اللہ کا فیصلہ

وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَته، وَهُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیْد.

"وہی ہے جو ہمیشہ برساتا ہے لوگوں کے مایوس ہو جانے کے بعد، اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے وہی قابل تعریف ولی ہے۔" (سورہ شوریٰ: ۲۸)

اس آیت نے میری بڑی رہنمائی کی ہے اور قرآن مجید اسی طرح ہمیشہ رہنمائی اور مشکل کشائی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَته، وَهُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیْد.

اللہ وہ ہے جو بارش کو نازل کرتا ہے، حقیقت میں "غیث" کا ترجمہ "بارش" پورا ترجمہ نہیں ہے۔ "غیث" اس چیز کو کہتے ہیں جو عین وقت پر مدد کردے، عین وقت پر مشکل کشائی کرے، فریاد رسی کرے، دست گیری کرے، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس طرح کسی جاں بلب مریض کے حلق میں آب حیات کے کچھ قطرے ٹپکا دیئے جائیں اس کو کوئی داروئے حیات مہیا کر دیا جائے، اسی طرح سے تپتی ہوئی، سلگتی ہوئی، جلتی ہوئی اور دم توڑتی ہوئی زمین پر اللہ تعالیٰ آب حیات کے قطرے برسایا کرتا ہے۔

"وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا" وہ فریاد رسی کرتا ہے اور زندگی

کا سامان مہیا کرتا ہے انسانوں کے لئے، اس کے بعد کہ وہ مایوس ہو چکے ہوتے ہیں، ان کی آنکھیں آسمان سے لگیں ہوتی ہیں وہ بڑے ارمان و حسرت کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھتے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پانی برسا کر سوکھی کھیتی کو ہرا کردے۔

وَهُوَ الَّذِىْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَته، وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْد. اور اپنی رحمت کا دامن پھیلا دیتا ہے اور اپنی رحمت کی ہوائیں چلاتا ہے اور وہ "الولی الحمید" ہے۔

یہاں، پر جن صفات کا انتخاب کیا گیا ہے وہ بھی بڑی معنی خیز ہیں۔ اللہ کے سب نام اچھے "وَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنىٰ" اللہ کی سب صفات اعلیٰ و برتر ہیں۔ "وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلىٰ" لیکن یہاں "الولی الحمید" کی صفات کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ اس مضمون سے اور انسانیت کی چارہ سازی اور سچائی سے اس کا خاص تعلق ہے۔

یہ انسانیت کس کی ہے؟ اللہ کی ہے! وہی اس کا والی و وارث ہے، کوئی اپنی کھیتی کو سوکھا نہیں دیکھ سکتا، کوئی برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی لگائی ہوئی کھیتی سوکھ جائے وہ "الولی" ہے، وہ اس کا مالک بھی ہے اور پیدا کرنے والا بھی۔ "الحمید" ہے۔ وہ حمد کا مستحق ہے، جس کی شان حمید کی ہے، جس کی صفت حمید کی ہے، اس کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق کو اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ دے۔(۱)

(۱) پاجا سراغ زندگی ص ۱۸۰-۱۸۱

نیکی پر دس گنا- برائی پر اتنا ہی

"مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ." (الانعام:۱۶۰)

"جو کوئی نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لئے دس گنا (اجر) ہے۔ اور جو کوئی گناہ لے کر آئے گا اس کو اتنا ہی بدلہ ملے گا اور ان کے ساتھ زیادتی نہ کی جائے گی۔"

یہ ایک بہت بڑی بشارت ہے جو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ:-

"مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا." جو کوئی نیکی لے کر آئے گا اس کو اس کا دس گنا بدلہ ملے گا، "وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا" اور جو کوئی گناہ لے کر آئے گا، برائی لے کر آئے گا اس کو اتنا ہی بدلہ ملے گا۔ "وهم لا يظلمون" اور ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کی جائے گی۔

تمام دنیا کا قانون یہ ہے کہ اگر نیک کام کیا ہے اتنا ہی انعام ملے، اسی کے بقدر، اس کے اس اچھے کام کی جسامت، اس کا رقبہ اور اس کا وزن دیکھ کر اس کو انعام دیا جاتا ہے اور اگر کوئی قصور کرے، غلطی کرے اس کا بدلہ دیا جاتا ہے اور جزا و سزا دونوں ہی میں مماثلت ہوتی ہے جو بھی قانون ایک کے لئے ہے وہی دوسرے کے لئے اختیار کیا

جاتا ہے۔ اور اس وقت دنیا میں جتنے بھی دستاویز ہیں، جتنے بھی قوانین ہیں، نظام چل رہے ہیں اس دنیا میں اسی پر عمل ہوتا ہے سوائے اس کے کہ کسی خاص وجہ سے کوئی استثنا ہو۔

مگر اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قانون بیان کیا ہے کہ نیکی پر تو ہم دس گنا دیں گے اور برائی پر برائی کے بقدر دیں گے۔ "مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ." یہ محض اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے اور انسان کی کمزوری کا، اس کے ضعیف البنیان، اس کے قصوروار اور اسکے خطاکار ہونے کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اگر یہاں بھی یہ قانون ہوتا کہ برائی پر بھی دس گنا وبال ہوتا، تاوان ہوتا تو انسان کہیں کا نہ رہ جاتا۔ اس لئے کہ برائی زیادہ ہوتی ہے انسان سے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ قانون بنایا کہ نیکی پر تو دس گنا اور غلطی پر اتنا ہی۔ یہ محض اللہ کا فضل ہے۔

"وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ" اور ان کیساتھ کوئی کمی نہ کی جائے گی یہ نہیں کہ اگر برائی کی تو اللہ ناراض ہو کہ بالکل برباد کر کے رکھ دے۔ اس لئے کہ وہ تو خالق اور وہ محسن ہے، مزکی ہے۔ اپنی بنائی ہوئی چیز سے جب قصور ہوتا ہے تو بہت زیادہ غصہ آتا ہے۔ اپنے پڑھائے ہوئے شاگرد سے، اپنے پروردہ لختِ چشم سے جس پر اس نے احسان کیا ہے اور اپنے ملازم سے غلطی ہو جائے تو آقا کو زیادہ غصہ آتا ہے۔ اس لئے فرمایا "وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ" ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کی جائے گی۔

اس پر عمل نہیں کیا جائے گا کہ ہم نے نیست سے ہست بنایا، معدوم سے موجود

کیا، اس کو قوت عطا کی، زندگی عطا کی، جسم ودماغ اور دل عطا کیا اور ہم نے کوئی کمی نہ کی اور اس نے گناہ کیا تو اس کو پیس کر رکھ دینا چاہئے، مٹا کر رکھ دینا چاہئے۔ تاکہ پھر انسان نافرمانی نہ کرے۔ اس کو یہ بھی حق تھا لیکن وہ فرماتا ہے:-

"وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ"

(ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کی جائے گی)(۱)

---

(۱) مسجد دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں درس قرآن کے سلسلہ کی ایک تقریر جس کو مولانا سید بلال عبدالحئی ندوی نے کیسٹ سے نقل کر کے ہمیں عنایت کی۔ (مرتب)

کامیابی کی ضمانت خواہشات نہیں حقائق ہیں

لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَا اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتَابِ. مَنْ یَعْمَلْ سُوْءً یُّجْزَ بِہٖ.

(نہ تمہاری تمناؤں سے کام چلتا ہے اور نہ اہل کتاب کی تمناؤں سے، جو شخص کوئی برا کام کرے گا وہ اس کے عوض سزا دیا جائے گا؟(سورہ النساء: ۱۲۳)

خواہشات اور حقائق میں فرق

دنیا میں دو چیزیں ہمیشہ سے رہی ہیں اور وہ ہیں انسانی نفسیات اور فطرت انسانی کا خاصہ ہیں۔ ایک تو ہیں خواہشات اور ایک ہیں حقائق۔ سنت اللہ بھی یہی ہے اور عقل کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ اس دنیا میں اقوام و ملل کی قسمتوں، ان کی تقدیر اور جرأت کے آگے یہ بھی کہتا ہوں کہ مذاہب اور ان کی عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا معاملہ واقعات و حقائق کے ساتھ ہے خواہشات کے ساتھ نہیں ہے۔ قرآن مجید میں آپ کو یہ دونوں چیزیں علیحدہ علیحدہ ملیں گی۔

"لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَا اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتَابِ. مَنْ یَعْمَلْ سُوْءً یُّجْزَ بِہٖ" اس آیت میں دونوں چیزوں کی پوری نمائندگی ہے۔ جہاں تک خواہشات کا تعلق ہے

اخلاقی و عقلی حیثیت سے یہاں تک کہ دینی و روحانی حیثیت سے کیسی ہی عزیز اور قابل احترام ہوں لیکن فیصلہ خواہشات پر نہیں ہے۔ لیس بامانیکم اور یہ بھی قرآن کی حکمت ہے کہ والاامانی اهل الکتاب سے پہلے لیس بامانیکم فرمایا تاکہ یہ خیال نہ ہو جہاں تک مذاہب باطلہ کا تعلق ہے ان کی خواہشات پر کیا فیصلہ ہوگا۔ ان کی کیا قیمت ہے۔ تو پہلے کہا اور یہ قرآن مجید کا امتیاز ہے کہ تمہاری اور آپ یہ بھی دیکھ لیجئے کہ مخاطب کون ہے؟ مخاطب بعد کی آنے والی نسلیں تو بعد میں ہیں۔ ثانوی درجہ میں ہیں۔ مخاطب صحابہ کرامؓ ہیں۔ اصحاب بیعت رضوانؓ اصحاب بدر ہیں۔ اور عشرہ مبشرہ ہیں۔ ان سب کو مخاطب کر کے فرمایا گیا۔ "لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ" تمہاری خواہشات پر بھی فیصلہ نہیں ہے۔ وَلَااَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتَابِ" ہمارے یہاں اٹل کا قانون یہ ہے کہ "من يعمل سوء يجز به" یعنی عمل کا نتیجہ ظاہر ہوگا۔ اس کو عمومی دائرے میں لیں۔ تو "مَنْ يَّعْمَلْ سُوْءً يُّجْزَ بِهٖ" کا تعلق صرف عالم آخرت ہی سے نہیں ہے۔ بلکہ اس تکوینی دنیا اور عالم آخرت دونوں سے ہے۔ ہمارے یہاں قانون یہ ہے کہ جو عمل کرے گا اس کی جزا ظاہر ہوگی۔

بقائے انفع

دنیا میں ہمیشہ سے بلکہ آخری دور میں خاص کر یورپ میں ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر یہ اصول تسلیم کیا گیا اور جس کو Survival of the Fittest کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔

"بقاء اصلح" جو زیاد صالح ہوگا وہ باقی رہے گا۔ اس کی بنیادیں مذہبی کتابوں اور مذہبی انسانوں کے بیانات میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ قرآن مجید میں اس سے بھی آگے کا اصول بیان کیا گیا ہے۔ جو نفسیات قرآنی اور نفسیات دینی سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ جو دوسرا قانون ہے وہ بقائے انفع کا۔ "فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَّاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (الرعد ۱۷) اس میں ایک حکمت ہے جو قابل غور ہے۔ "بقائے اصلح" کا فیصلہ بڑا مشکل ہے۔ "اصلح" اصل میں اسم تفضیل کا صیغہ ہے، اشیائے صالحہ میں اصلح کا فیصلہ اشیائے فاسدہ میں صالح کا فیصلہ نہیں ہے۔ بقائے اصلح کے معنی یہ ہیں کہ جو صالح چیزیں ہیں ان میں اصلح کون سا ہے۔ اشیائے صالحہ جن کو زندگی کا حق ہے جو کشمکش حیات میں پوری اتر سکتی ہیں وہ چیزیں وہ نہیں ہیں بلکہ ان اشیائے صالحہ میں اصلح کون سا ہے اس کا فیصلہ کون کرے گا۔ کون سی عدالت کرے گی۔ لیکن فطرت انسانی شروع سے ایسی ہے کہ نافع کا فیصلہ تو جلد کر لیتی ہے۔

نافع کا فیصلہ

نافع کا فیصلہ ہر دور میں یعنی علم و ترقی کے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی اور علم و ترقی کی پستی اور ابتدائی حالت میں بھی۔ نافع کا فیصلہ فطرت انسانی کی وہ صلاحیت ہے وہ ملکہ ہے جو ہمیشہ رہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں (چونکہ یہ کتاب کتاب انسانیت ہے پوری نوع انسانی کو یہ صحیفہ دیا گیا ہے یہ ہر دور کا ہے، اور عقلی و علمی، روحانی و عملی جتنی سطحیں ہو سکتی ہیں ان سب پر حاوی ہیں) اس لئے قرآن مجید نے اس کو

بقائے اصلح پر نہیں چھوڑا۔ بلکہ بقائے انفع کا اصول بتایا ہے۔

ہم میں کا ایک بچہ بھی یہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ اس کے لئے زیادہ مفید ہے اس سے اس کو زیادہ آرام ملے گا۔ والدین کے حق میں اس کا یہی تجربہ ہوتا ہے کہ وہ ان کو انفع سمجھتا ہے۔ اپنے عزیز واقارب کو وہ انفع سمجھتا ہے۔ جو زیادہ پڑھے لکھے تجربہ کار اور عقلمند ہوتے ہیں ان کے متعلق بھی بچہ اگر وہ فاترالاستعداد نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی اصطلاح میں وہ بھی یہ اندازہ کرلیتا ہے کہ یہ میرے لئے زیادہ مفید ہے۔ تو بقائے انفع ایک ایسا اصول ہے جو نوع انسانی اور تاریخ انسانی کے ہر دور اور نوع انسانی کی ہر نسل میں وہ کام دیتا ہے۔ تو قرآن مجید نے یہ کہہ دیا "فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّامَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ" میں نے یہ تمہید اس لئے بیان کی کہ خواہشات اور حقائق یہ دو چیزیں ہیں اور اس میں قومی، ملی، حکومتی، انفرادی اور عوام کی جمہوری سطح پر بڑی غلطی ہے کہ خواہشات کو خواہشات سے بہ نسبت حقائق کے زیادہ وابستگی رہی ہے۔

حقائق کو صحیح طور پر محسوس نہ کرنا اور ان حقائق کا تقاضہ پورا نہ کرنا یہ ایسی غلطی ہے کہ اس میں بڑی بڑی طاقتور حکومتیں رومن ایمپائر اور پرشین ایمپائر اور پھر اخیر میں خلافت اندلس کی مستحکم وسیع اور طویل المیعاد سلطنت اور اسی طریقے سے خلافت عباسیہ اور پھر خوارزم شاہ کی وہ شہنشاہی کہ جو ساری اسلامی سلطنتوں کو اس نے اپنے اندر ضم کرلیا تھا۔ اگر ہم ان کی تاریخ پڑھیں گے اور ان کے زوال کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو حقائق سے نظرپوشی نظر آئے گی۔(۱)

---

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵ر مارچ ۱۹۸۶ء

نیک بندوں کے حق میں محبت کی فضا ہوتی ہے

"اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا."

(سورہ مریم:)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے بھلے کام کئے "رحمٰن" ان کے لئے ایک محبت پیدا کردے گا" یہاں "رحمٰن" کا لفظ آیا ہے یعنی ایسی محبت جس میں رحمت بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نیک بندوں کے حق میں ایسی محبت کی فضا پیدا کردے گا۔ اور کس انداز سے؟ مفسرین نے تو اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرے گا، لیکن صحیح تفسیر اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبت دلوں میں پیدا فرمادے گا۔ چنانچہ حدیث قدسی میں صحیح حدیث ہے غالباً صحیحین کی کہ "جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو فرشتہ جبریلؑ سے کہتا ہے کہ "مجھے فلاں بندے سے محبت ہے، تم بھی اس سے محبت کرو" وہ دوسرے فرشتوں سے کہتے ہیں پھر اوپر کے آسمان والے دوسرے آسمان والوں کو، یہاں تک کہ اس کی محبت دریا کی مچھلیوں تک اور سوراخوں کی چیونٹیوں تک سرایت کر جاتی ہے۔"

اور یہ آنکھوں سے مشاہدہ کیا، اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے فضل سے دکھایا کہ اللہ

تعالیٰ کے محبوب و مقبول بندوں کی محبت کہاں کہاں تک پہونچ جاتی ہے اور ایسی ہوتی ہے کہ قلوب مسخر ہو جاتے ہیں اور یہ ایسی خبر متواتر اور ایک ایسی حقیقت ہے۔ تاریخی حقیقت بھی ہے اور مشاہدہ بھی کہ اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

ہم نے چند بزرگوں کو دیکھا ہے۔ ہندوستان میں اور کچھ بزرگوں کو دیکھا ممالک عربیہ میں، کہ جیسے ایک انتظام ہے کہ کوئی جا کر دلوں میں ان کی محبت ڈال دے۔ اور ان کو پلا دے، یعنی گویا کوئی چیز ہے، کوئی پیالہ ہے، جو جا کر سب کو پلایا جاتا ہے، ان کو خود خبر نہیں ہوتی، اور نہ اس کا کوئی ذمہ دار ہوتا ہے۔ اور اس کا نہ کوئی منتظم ہوتا ہے۔ آپ ہی آپ محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ بالکل جیسے آب و ہوا کا اثر ہوتا ہے، تبدیلی ہوتی ہے یا لطافت ہوتی ہے آب و ہوا کی، یا چمن کی خوشبو ہوتی ہے، پھول کی خوشبو ہوتی ہے، اس طرح وہ خوشبو پہنچ جاتی ہے، اب جس درجہ کا آدمی ہے اتنے ہی بڑے حلقہ میں وہ خوشبو پہنچ جاتی ہے۔

ہم نے چند بزرگوں کو دیکھا، حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کہ تقسیم سے پہلے پاکستان میں ان کے پاس بڑے بڑے لوگ لاہور کے آتے اور سر جھکا کر بیٹھے ہوتے تھے اور حضرت تقریر کرتے تھے، ایک مرتبہ تقریر کی کہ "اے لاہوریو! احمد علی اتنے دنوں سے لاہور میں ہے کہ ایمانیوں کو دیکھنے کو ترستا ہے، تمہارے یہاں سب کچھ ہے لیکن ایمان والے بہت کم ہیں۔ اور اس میں کوئی راستہ میں بیٹھا ہے اور ہم دیکھتے تھے کہ چوٹی کے لوگ آتے تھے، معلوم ہوتا جیسے کسی نے جا کر گھول کر پلا دیا ہو۔

ہندوستان میں ہم نے اپنے حضرت شیخ و مرشد مولانا عبد القادر رائے پوریؒ کو

دیکھا پورے علاقہ میں کیا یہاں (ہندوستان) سے لے کر پاکستان تک جہاں سے کہ جب وہ حجاز گئے تو ہم نے دیکھا کہ پورے حجاز میں احترام اور ایک محبت کی فضا تھی۔ اسی طرح حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کو دیکھا بغیر کسی تشہیر کے، اور حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو اور پھر آخری دور میں حضرت تھانویؒ کو دیکھا، ان کی زیارت کی، وہاں بھی دیکھا کہ لوگ چلے آرہے ہیں بڑے سے بڑا عالم چلا آرہا ہے، دروازہ بند ہے، ابھی سب باہر ہیں تخت بچھا ہوا ہے، بہت سے کھڑے ہیں، بہت سے بیٹھے ہیں، اس انتظار میں کہ دروازہ کھلے اور ہم جائیں، مجھے یاد ہے کہ بڑے سے بڑے عالم اور بڑے سے بڑے معزز لوگ بھی وہاں ہوتے تھے، سب سر جھکائے ادب سے بیٹھے ہیں کہ حضرت کی زبان سے کوئی لفظ نکلے۔

اب یہ سب کیا چیز ہے؟ "سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدّاً" اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کیلئے "رحمٰن" نے ان کے لئے یعنی ان کے لئے دلوں میں جو محبت پیدا ہوگی اس میں خود رحمت کا شائبہ ہوگا، رحمت ملی ہوئی گی۔

اور ایک محبت ایسی ہوتی ہے جو رحمت کے بغیر ہوتی ہے۔ (نازک لفظوں والی چیز ہے اس کو بیان کرنا بھی مشکل ہے) ایک محبت ہے، محبت تو ہے لیکن اس میں رحمت نہیں۔ آدمی اپنی محبت کا اظہار کر دینا چاہتا ہے۔ چاہے اس کو تکلیف پہونچے، اب بہت سی مرتبہ دیکھا کہ محبت کے اظہار میں، محبت کا معاملہ کرنے میں آدمیوں کو جسمانی تکلیف پہونچ گئی، نہیں، بلکہ ہم اپنی محبت کا اظہار کریں کہ اس کو دبائیں گے، ہم ان کو چمٹائیں گے، ان کو لٹائیں گے، ہم یہ کریں گے، ہم ان کو گھسیٹ کر اپنے گھر

لے جائیں گے، کھلائیں گے، دعوت ضرور کریں گے، چاہے ان کا پرہیز ہو۔

یہ وہ محبت ہے جس کے ساتھ رحمت شامل ہے۔ "سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا" ان اللہ کے بندوں کے حق میں جو محبت پیدا کی جاتی ہے اس میں رحمت بھی شامل کردی جاتی ہے۔ تاکہ یہ کام کریں تاکہ یہ ابھی رہیں تاکہ ان سے فائدہ پہونچے اور یہ آرام پائیں۔

اب ایک ایک لفظ جو قرآن مجید کا ہے اپنے پیچھے ایک عالم رکھتا ہے، کتب خانہ رکھتا ہے، کسی تفسیر میں ان کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ نہ کسی زبان میں "ودا" یہ نکرہ ہے۔ ایک خاص طرح کی محبت یعنی اس کی بھی قسمیں ہوں گی کہ ان کا احاطہ نہیں ہو سکتا اور ان کے درجات بھی ایسے ہوں گے۔ ۱۰۰ نمبر کے، ۹۰ نمبر کے، ۸۰ نمبر کے، ۷۰ نمبر کے ہوں گے۔ "ودا" کسی قسم کی محبت اللہ پیدا فرمادے گا۔

محبت کی بھی ایسی شکلیں ہیں کہ ایک تو معالج کی محبت ہوتی ہے، ایک ماں باپ کی محبت ہوتی ہے، ایک استاذ کی محبت ہوتی ہے، ایک دوست کی محبت ہوتی ہے، یہ سب جس کے ساتھ جو مناسب سمجھے گا وہ محبت پیدا کرے گا۔ (۱)

(۱) تفسیر سورہ مریم غیر مطبوعہ۔ کیسٹ سے نقل کر کے قلمبند کی گئی۔

انسانی سعی وکوشش کے آثار ومظاہر

وَاَنَّ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى. وَاَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرٰى. ثُمَّ يُجْزٰاهُ الْجَزَاءَ الْاَوْفٰى.

(النجم: ۳۹-۴۰-۴۱)

اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی، پھر اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

حیات آفریں پیغام

یہ آیات صرف مسلمانوں ہی کو ہمت کا پیغام نہیں دیتیں بلکہ پوری نوع انسانی کو اور ان سب لوگوں کو جو کوئی صحیح مقصد رکھتے ہیں، کسی مفید دعوت کے علمبردار ہیں، کسی اچھی بات کے لئے جدوجہد کرنا چاہتے ہیں، کسی عظیم مقصد کے لئے وہ کھڑے ہوئے ہیں، ان سب کے لئے ان آیات میں حیاتِ نو کا پیغام ہے۔ اور خاص طور پر ہماری تعلیم گاہوں کیلئے، اصلاحی مراکز کیلئے اور خاص ان مرکزوں کیلئے جہاں پر نوجوان ہوں امت کے، اور ملت کے بچے وفرزند ہوں، جن کی اٹھتی ہوئی عمر ہے اور چلتی ہوئی کشتی ہے۔ تو ان کیلئے اس آیت میں پورا دستور العمل ہے اور ایک چراغ راہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان کے لئے اتنا ہی ہے جس کی وہ کوشش کرے، اور پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور خاص طریقہ ادائے قرآنی کے ساتھ فرمایا گیا، "وان سعیہ سوف یریٰ" (اور اس کی کوشش ایک مرتبہ نظر آکر رہے گی) یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے کہ یہاں "سوف" کا لفظ استعمال ہوا، جو عام طور پر مستقبل بعید کے لئے استعمال ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر جلدی تمھیں نتائج نظر نہ آئیں تو مایوس نہ ہونا "سوف یریٰ" وہ نظر آئے گا، جو کچھ دنیا میں دیکھ رہے ہیں، سلطنتوں کا قیام، تہذیبوں کا عروج، علوم وفنون کی اشاعت، باکمال لوگوں کا پیدا ہونا، سب انسانی سعی وجہد کے ظہور کے نتائج ہیں اور قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر ہے۔

عزم راسخ ہے نشانِ قیس وشانِ کوہ کن
عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت وکوہ سار

یہ شاعر کی بات نہیں، یہ اصل میں قرآن کی ترجمانی ہے۔

کوشش کا نتیجہ ضرور نکلے گا

اس طرح امت کے تشخص کی حفاظت کی ذمہ داری خود ملت کا فرض ہے، قرآن مجید نے صرف فرد کو مخاطب کر کے نہیں فرمایا۔ ہر فرد اور ہر ملت کے لئے قانون خداوندی یہی ہے کہ

وَاَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰیۙ۔ اور انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔

(سورہ النجم: ۳۹)

انسان کو اپنی زندگی اور زندگی کے بعد کی زندگی میں اتنا ہی حصہ ملتا ہے جس کی اس نے کوشش کی، اس کے حصے میں اس کی سعی آئے گی، اور سعی کے نتائج آئیں گے، وہ چند فیصلے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں طے شدہ ہیں اور وہ قرآنی حقیقتیں اور صداقتیں جو ابدی ہیں ان میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ:

"وَاَنَّ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی" (انسان کو وہی ملیگا جس کی اس نے کوشش کی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے، وہ جب کہہ رہا ہے کہ کوشش شرط ہے اور انسان کی کوشش ہی کا نتیجہ نکلے تو پھر دوسرا انسان کیا کہہ سکتا ہے، نہیں ہے انسان کے لئے مگر جس چیز کی اس نے کوشش کی ہے "وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰی" اور اس کی کوشش کا نتیجہ ظاہر ہوگا، اس کی کوشش کا نتیجہ دکھائی دے گا، آنکھوں کو دکھائی دے گا کہ جو کوشش کی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا، پھر اس کے بعد بڑی بشارت سناتا ہے "ثُمَّ يُجْزٰهُ الْجَزَاءَ الْاَوْفٰی" اسم تفضیل کا صیغہ ہے اتنا آپ جانتے ہوں گے؟ پھر اس کو بدلہ دیا جائے گا بھرپور بدلہ، زیادہ سے زیادہ بدلہ، ایک تو انسان کی کوشش ضائع نہیں ہوگی۔ کوشش کا نتیجہ نکلے گا پھر انسان کی کوشش کا نتیجہ اس کی توقع سے، اس کے استحقاق سے، اس کی محنت کی مقدار سے بھی بڑھ کر نکل سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ بشارت سناتا ہے کہ ہوگا ایسا اور ساری تاریخ بتاتی ہے علم کی تاریخ بتاتی ہے، دعوت و اصلاح کی تاریخ بتاتی ہے کاموں سے اشتراک کی تاریخ بتاتی ہے تحقیقات و تصنیفات کی تاریخ بتاتی ہے، اصلاحی کاموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ کوشش کا نتیجہ بعض اوقات ہی نہیں بلکہ اکثر اوقات کوشش سے زیادہ نکلا، کوشش کا جو پیمانہ تھا اس کا جو سائز تھا اس سے بہت

بڑھ کر نتیجہ نکلا، وہ نتیجہ کوشش کے سائز سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس سے بڑھ کر بشارت کیا ہو سکتی ہے؟ آپ اگر پکڑ لیں اس بات کو اور دل پر لکھ لیں کہ ہم کوشش کریں گے تو کوشش کا نتیجہ ضرور نکلے گا امید ہے کہ کوشش کی حیثیت سے بڑھ کر نکلے گا، توقع سے بڑھ کر، قیاس سے بڑھ کر نکلے گا اور اس کے لئے نہ کسی بہت بڑی جگہ کی ضرورت ہے، نہ کسی بڑی دانش گاہ کی ضرورت ہے، نہ کسی بڑے اونچے خاندان کی ضرورت ہے، نہ بہت اعلیٰ درجہ کے اساتذہ کی ضرورت ہے، نہ بہت وسیع کتب خانہ کی ضرورت ہے اس کے لئے کوشش کی ضرورت ہے۔ نیت کی ضرورت ہے، سنجیدگی اور دیانت داری کی ضرورت ہے۔

محنت اور حسن نیت واخلاق یہ دو چیزیں جمع ہو جائیں تو پھر وہ ضائع نہیں ہوگا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے جو کہ عالم الغیب اور قادر مطلق ہے، دیکھئے ایک تو عالم الغیب ہونا یہی ایک بڑی بات ہے لیکن وہ قادر مطلق بھی ہے، عالم الغیب بھی ہے، مخبر صادق بھی ہے اور رب العالمین بھی ہے۔ وہ جب فرماتا ہے، اعلان کرتا اور اس کی ذمہ داری لیتا ہے "وَاَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرٰى" اور اس کی کوشش کا نتیجہ ظاہر ہو کر رہے گا تو پھر دنیا میں اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہی، کچھ اس میں اضافہ ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ ایک حیات آفریں پیغام ہے، تمام انسانی نسلوں اور تاریخ کے تمام ددوروں کے لئے کہ انسان کی کوشش کا نتیجہ ضرور بر آمد ہوگا، اور اس کے اثرات ونتائج مشاہدہ میں آئیں گے۔

ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْاَوْفٰى۔ پھر اس کو اس کوشش کا بھرپور بدلہ ملے گا۔

چراغ زندگی اور دستور العمل

قرآن مجید کی اس آیت میں پورا پیغام ہے۔ زندگی کا پورا پیغام اس کے اندر ہے، زندگی ہر طرح گزارنی چاہئے، زندگی کے لئے کیا سامان پیدا کرنا چاہئے، زندگی دینی زندگی ہو، علمی زندگی ہو، دعوتی زندگی ہو، اصلاحی زندگی ہو، ان سب کے لئے ہر طرح تیاری کرنی چاہئے اور اس تیاری کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ اس لئے کہ انسان کی فطرت میں ہے کہ اس کو فائدہ بھی معلوم ہونا چاہئے، کون سی کوشش کا کیا فائدہ ہے؟ فلاں دوا کا کیا خاصہ ہے؟ فلاں بیج کا کیا مادہ ہے؟ اور فلاں میدان کا کیا تقاضہ ہے؟ یہ انسان کی فطرت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ذہن میں القاء فرمائی اور دل میں ڈالی جس میں پوری زندگی کا نظام آگیا ہے اور پورا قانون آگیا ہے۔ اور آپ اس آیت کو سمجھ لیں اس کو اپنا دستور العمل اور اپنا رہنما بنالیں اور اس آیت کی صداقت پر آپ ایمان لے ائیں اور یقین کرلیں اور دل میں اس کو اتار لیں، اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمایا ہوا ہے دنیا کے تمام حکما اور بڑے بڑے ذہین لوگ بھی کوئی بات کہتے ہیں کہ یہ ہوگا اور ایسا ہوگا اس کا یہ نتیجہ نکلے گا تو اس کا پورا سو فیصدی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ زندگی کا تجربہ ہے اور تاریخ کا مطالعہ ہے کہ کتنے آدمیوں کی پیشین گوئی غلط نکلی اور کیسے کیسے فائدے فلاں فلاں چیز کے بتائے گئے تھے ان میں سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ پوری تاریخ اس سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ فرمادے کہ اس کا یہ خاصہ ہے۔ یہ کروگے تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا تو پھر اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا، پھر ایسی کیا بات ہے کہ کہی جائے کہ اس کو آپ اپنا دستور العمل بنالیں اس کو اپنا چراغ

زندگی بنالیں اور اس کی روشنی میں آپ چلیں۔

انسانی سعی کی جس نتیجہ خیزی اور بار آوری کا اس آیت میں اظہار کیا گیا ہے وہ ایک حوصلہ افزا اور حیات بخش پیغام ہے۔ اقبالؔ نے انسان کے لئے کہا تھا ؂

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے(۱)

(۱) ۱۔ تحفہ دین و دانش ص ۴۳

۲۔ پندرہویں صدی ہجری تاریخ کے آئینہ میں ص ۱۰۰۸

۳۔ تعمیر حیات ۲۵؍ مارچ ۱۹۹۴ء – ۱۰؍ دسمبر ۱۹۹۳ء – ۲۵؍ جنوری ۱۹۹۸ء سے مشترک ماخوذ ہے۔

علم کا بھی ایک قانون ہے

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا. وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَأْتُوْا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا. وَاتَّقُوْا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. (البقرہ:)

صحیح راہ کی ضرورت

جو لوگ تفسیر پڑھتے ہیں اور ان کی تفسیر کی کتاب شروع ہو چکی ہے یا کم سے کم سورہ بقرہ اور اس کا ترجمہ و تفسیر انھوں نے پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ جاہلیت میں جو لوگ حج کو نکلتے تھے ان کا ایک عرف اور ضابطہ یہ بن گیا تھا جو خود ساختہ تھا، شریعت میں نہیں تھا لیکن انھوں نے اپنی طرف سے اپنے اوپر ایک پابندی عائد کر لی تھی کہ جب تک کہ حج سے فارغ نہ ہوں، حج کے ارکان میں مشغول ہوں اور اس دوران اگر ضرورت ہو گھر آنے کی، کوئی بات کہنے کی تو گھر کے دروازے سے نہ آئیں کہ ابھی تو اللہ کے گھر سے ہو کر نہیں آئے تو اپنے گھر میں قاعدے سے کیسے داخل ہوں، تو چھتوں پر سے یا دیواروں کی طرف سے من ظھورھا پشت سے وہ گھر میں آیا کرتے تھے اور اس کو وہ بڑی نیکی کا کام سمجھتے تھے کہ اس میں بیت اللہ کا ادب و احترام ہے۔ اللہ

، تعالیٰ فرماتا ہے "لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تَأتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا" یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم گھروں میں پشت کی طرف سے آؤ "وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَأْتُوا لْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا" گھروں میں، گھروں کے دروازوں سے آؤ۔

یہی قاعدہ ہے اور یہی عقل سلیم اور ذوق سلیم کی بات ہے، اور قانون قدرت ہے کہ جس چیز کا جو مدخل ہے اس سے آدمی آئے، قرآن مجید تو پوری زندگی کی کتاب اور پوری زندگی کے لئے کتاب ہدایت ہے، ہر طبقہ کیلئے، ہر مشغلہ، ہر میدان اور مرحلہ کے لئے وہ ایک دستور العمل اور ایک ہدایت نامہ کا کام دیتا ہے، قرآن کے یہ دو لفظ بڑے اہم ہیں "وَأْتُوْا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا" یہ پوری زندگی پر حاوی ہے، اس میں پوری زندگی کی حکمت بتادی گئی، یہ صرف گھر کا معاملہ نہیں ہر چیز کا معاملہ یہی ہے کہ جو اس کا دروازہ ہے اس دروازہ سے آنا چاہئے، اگر کوئی شخص پیشہ سیکھنا چاہے، کوئی صنعت سیکھنا چاہے، لیکن صنعت کے استاذوں سے نہ سیکھے اور صنعت کے آداب کا خیال نہ کرے اور صنعت کے اوزار مہیا نہ کرے اور تدریج کے ساتھ درجہ بدرجہ مرحلہ وار اس کو نہ سیکھے اور یہاں تک کہ ان کی وردی استعمال نہ کرے، لوہاروں کی ایک وردی ہے اور سقاؤں کی ایک وردی ہے، سپاہیوں کی ایک وردی ہے اور ڈاکٹروں کی ایک وردی ہے تو وردی بعض اوقات ضروری ہوتی ہے ورنہ وہ اپنے پیشہ میں کامیاب نہیں ہوگا، اس کو پیشہ نہیں آئے گا، فن نہیں آئے گا۔ تو جب یہ معمولی چیزوں کا حال ہے اگر کوئی کہتا ہے کہ فضول باتیں ہیں ہمیں لوہاری کا فن سیکھنا ہے یا ہمیں فوج میں بھرتی ہونا ہے لیکن وردی کا جھگڑا اہم مول نہیں لیتے یہ پہنو وہ نہ پہنو اور صاحب لیفٹ

رائٹ Right, Left فضول بات ہے، ہم اپنی ذہانت سے کام لیں گے، ہم دوسرا طرز ایجاد کریں وہ یوں ہی رہ جائے گا۔ اچھا سپاہی بن نہیں سکتا، ایسے ہی لوہار نہیں بن سکتا نجّار (کارپنٹر) نہیں بن سکتا اس کے لئے بھی "وَأْتُوْا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا" کی ضرورت ہے جو اس کا دروازہ ہے ادھر ہی سے آؤ۔

یہ "وَأْتُوْا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا" ساری زندگی دین ودنیا سب پر حاوی ہے کہ اللہ نے اور فطرت انسانی نے، فطرت سلیم نے سالوں سال کے تجربے سے جو اصول مقرر کئے ہیں اور جو اس کے مداخل اور مخارج ہیں اگر کوئی شخص اس کا پابند نہ ہو ان کا کوئی احترام نہ کرے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔ ایک شخص کہے کہ حروف تہجی کا جھگڑا عجیب ہے، ا، ب، ت، کا کون جھگڑا مول لے کہ پہلے الف، ب، ت، پڑھے ہم براہ راست پڑھنا شروع کر دیتے ہیں تو وہ کتنا ہی ذہین ہو کبھی اس کو پڑھنا نہیں آئے گا جو، ا، ب، ت، نہیں پہچانتا یا A.B.C.D. نہیں پہچانتا وہ کبھی ایک سیکنڈ نہیں بول سکتا آپ کسی وقت بھی تجربہ کر کے دیکھئے کہ آپ کے زمانے کا کوئی بقراط سقراط ہو جو پڑھا ہوا نہ ہو خواندہ نہ ہو، آپ اس کو ایک کتاب دیجئے اردو کی دیجئے یا انگریزی کی دیجئے یا عربی کی دیجئے یا یہیں کی کنٹر زبان کی دے دیجئے اور کہئے کہ رات بھر نہیں آپ کو ایک مہینہ کی مہلت دی جاتی ہے آپ کے پاس کوئی دوسرا آدمی نہیں جائے گا۔ یہ کتاب ہے اور آپ ہیں، ہم آپ کو کمرے میں بند کر دیتے ہیں تالہ لگا دیتے ہیں کھانے پینے کا سب سامان کھڑکی سے ہم پہونچاتے ہیں اور وہاں پہلے سے موجود اور زندگی کی سب ضروریات ہیں ایک مہینہ نہیں چھ مہینے آپ اس میں رہئے اور یہ صفحہ حل کر دیجئے اس صفحہ کو آپ پڑھ دیجئے اور اس نے

حروف تہجی نہیں پڑھے تو آپ یقین مانئے کہ جب وہ نکلے گا تو ویسے ہی جاہل ہو گا جیسے وہ داخل ہوا تھا اس لئے کہ "وَأْتُوْالْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا" پر اس نے عمل نہیں کیا، حروف تہجی بڑے حقیر ہیں کیا حقیقت ہے، ا،ب، ت، بچوں کو پڑھایا جاتا ہے لیکن بڑے بڑے علامہ امام غزالیؒ، امام رازیؒ بھی محتاج تھے کہ حروف تہجی پڑھیں پھر احیاء علوم الدین اور تفسیر رازی تک پہونچیں وہ احیاء علوم اور تفسیر رازی تک ہر گز نہیں پہنچ سکتے اگر انھوں نے حروف تہجی نہ پڑھے ہوتے، ایسے ہی ہر فن، ہر علم کا، ہر شعبہ کا ایک قانون ہے اس قانون پر چلنا ہو گا۔ یہ ہمارا علم اول تو مجرد علم ہے، مجرد علم کا حال بھی یہی ہے کہ بہت سی چیزیں تو اس میں مشترک ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری دنیا الگ ہے ان کی دنیا الگ لیکن آپ دیکھیں گے تو زیادہ حصہ دنیاوی اور دینی تعلیم میں مشترک ہے مثلاً درجہ بدرجہ پڑھنا استاذ سے پڑھنا محنت کرنا، استاذ کا احترام کرنا۔

علم دین کا امتیاز

کچھ چیزیں تو مشترک ہیں لیکن پھر اس کے بعد ایک سرحد ایسی آتی ہے ایک ایسی لکیر آتی ہے جہاں سے ہماری سرحد الگ ہو جاتی ہے وہ کیا مثلاً اللہ کی رضا کی طلب ہو، اخلاص ہو، دعا ہو خدا سے کہ اے اللہ ہم سے تو جو محنت ہو سکتی ہے ہم کریں گے اصل تو دینے والا ہے علم کا۔

حضرت امام شافعیؒ کا شعر یاد کیجئے :

شکوت إلی وکیع سوء حفظی — فأوصا نی الی ترك المعاصی

بان العلم نور من الـه — ونور الله لا یعطی لعاصی

میں نے اپنے استاد وکیع سے شکایت کی میرا حافظہ کمزور ہے انھوں نے کہا کہ گناہوں سے اجتناب کرو بہت گناہوں سے دور رہو اس لئے کہ علم جو اللہ کا نور ہے اللہ کا نور نافرمان کو نہیں دیا جاتا۔ یہاں سے سرحد الگ ہو جاتی ہے۔ یہ ہمارا علم جو ہے جس علم کے طالب علم ہیں۔ یہ علم خاص آداب رکھتا ہے، یہ پہلوانی کا علم نہیں ہے کہ آدمی کہے کہ کون ہوتا ہے استاذ، کیا کتابوں کا ادب، کیا پرانی دقیانوسی باتیں کرتے ہو، اللہ نے ہمیں ذہن دیا ہے حافظہ دیا ہے محنت صحت ہماری اچھی ہے، ہم سب کر کے دکھادیں گے، نہیں ایسا نہیں بعض لوگ کم صلاحیت کے ساتھ ایسے کامیاب ہو گئے ہیں کہ دنیا میں ان کا ڈنکا بج گیا، مجھے یاد ہے کہ لاہور میں ایک صاحب تھے انھوں نے غلط لائن اختیار کی تھی اور کالج میں پڑھاتے تھے ان کی ذہانت اور معقولات میں ان کی دسترس مسلم تھی یہاں تک کہ ڈاکٹر اقبال بھی ان کو مانتے تھے لیکن جو فیض ان سے پہنچنا چاہئے تھا، جو علوم وسنت کا اجراان سے ہونا چاہئے تھا اور جو اشاعت ہونی چاہئے تھی جو ان لوگوں میں بیٹھ کر خشیت پیدا ہونی چاہئے تھی وہ لوگوں میں پیدا نہیں ہوئی کہنے لگے کہ مولوی حسین احمد مدنی تو ہمارے ساتھ تھے تو ان کا شمار غبی طالب علموں میں تھا وہ کچھ وہاں نمایاں نہ تھے یہ بڑے نمایاں تھے ان سے کیا فیض پہنچا، ذہانت کے باجود؟ ایسے ہی ایک صاحب کہنے لگے ارے مولوی الیاس تو جب دیکھو نفلیں پڑھتے تھے، پڑھنے کے زمانے میں نفلیں پڑھتے تھے مولوی الیاس صاحب نے کیا کر دکھلایا، دنیا کو ہلا کر رکھ دیا، یہاں تک کہ امریکہ اور افریقہ میں بھی ان کی دعوت مقبول ہوئی تو بڑے تجربے کی بات بتاتا ہوں تھوڑی صلاحیت سے وہ طریقہ اختیار کر کے

"وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا" پر عمل کر کے آدمی وہاں پہنچ سکتا ہے جہاں وہ لوگ جن کو اپنی ذہانت پر ناز ہے اور اپنے قوت مطالعہ پر اور محنت پر وہ نہیں پہنچ سکتے، ان کے پڑھنے پڑھانے میں برکت نہیں ہوگی کہ لوگوں کو نفع پہنچے۔ علم کے ساتھ سنتوں کا اجرا ہو بدعات کا محو ہو، معصیتوں سے نفرت پیدا ہو، طاعت میں رغبت پیدا ہو، نور آئے یہ بات پیدا نہیں ہوگی۔ یہ بات جب پیدا ہوگی کہ آدمی اس طریقہ پر عمل کرے جو استاد بتائے ایک صاحب تھے بہت بڑے علامہ، شام کے علامہ بیطار، کہنے لگے کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ہم لوگ اپنے استاد کے پاس نہیں جا سکے بڑی سخت سردی تھی، سردی شام میں ہوتی ہے برف پڑتی ہے کہنے لگے ہم مجبور ہو گئے، دوسرے وقت گئے تو کہنے لگے کیوں نہیں آئے، ہم نے کہا سردی بہت تھی اوپر سے ایک گھڑا پانی اور ڈال دیا کہنے لگے کہ یہ سردی ہے، کہنے لگے کہ ہم لوگوں نے برداشت کیا اور کوئی شکایت نہیں کی اور پھر جانے لگے اب وہ علامہ بیطار بن گئے، انھوں نے خود سنایا یا

ایسے ہی ایک صاحب نے ان کے ہم عصروں میں سے سنایا، تو یہ اس زمانہ کا طریقہ تھا کہ استاد خدمت بھی لیتے تھے اور پڑھاتے بھی تھے اور پھر استاد استاد ہی نہیں ہوتا تھا ایک طرح کا پیر ہوتا تھا اس کے پاس رہتے کہ نماز کیسے پڑھتا ہے، کیا خشوع و خضوع ہے، سنتوں کا کہاں تک اہتمام کرتا ہے، مسجد آتا ہے تو پہلا قدم کون سا رکھتا ہے، نکلتا ہے تو کون سا قدم نکالتا ہے یہ باتیں سیکھتے تھے استادوں سے اور اب یہ باتیں کم ہو گئیں۔

بس وہی بات ہے کہ "وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا" کہ بیت علم میں باب علم سے داخل ہو، باب علم کیا ہے وہی قواعد و ضوابط پر چلنا، احترام کرنا، نظام کے ساتھ رہنا

مطالعہ دیکھنا محنت کرنا۔

بس چند باتیں ہیں لمبا قصہ نہیں ہے، اگر ان پر عمل کیا جائے تو آج بھی اللہ کا قانون یہی ہے جو سیکڑوں، ہزاروں برس پہلے تھا۔(۱)

(۱) تحفۂ بھٹکل تلخیص از ص ۵۷ تا ص ۶۰

خلفائے اربعہ کی ترتیب خلافت میں

قدرت وحکمت الٰہی کی کارفرمائی

وَالشَّمْسُ تَجْرِی لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا، ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ. (سورہ یٰسین: ۳۸)

اللہ تعالیٰ اس آیت کریمہ میں فرماتا ہے کہ:

"آفتاب اپنے مستقر کی طرف (اللہ تعالی نے اس کے لئے طلوع اور غروب کی جو جگہ متعین کی ہے) بے اختیارانہ بڑھتا اور اس کی طرف چلتا رہتا ہے، اور یہ اس مالک کا مقدر کیا ہوا اور بنایا ہوا نظام وحساب اور اس کا قانون ہے، جو "العزیز" بھی ہے، "العلیم" بھی غالب بھی ہے اور علم والا بھی، نظام بنانے والا اور حساب مقرر کرنے والا بھی"۔

اگر کوئی صرف غالب ہو تو ضروری نہیں کہ اس کا نظام وحساب حکمت پر مبنی ہو، اور وہ محض اپنی قوت سے کام لیتا ہے، لیکن اس کی ساری کاروائی اور کارفرمائی ضروری نہیں کہ حکمت پر مبنی ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ حکم دینے والا علیم ہو، لیکن غالب نہ ہو، تو سارا کام پورا ہونا مشکل ہے۔

آفتاب دین ودعوت کے نظامِ شمس کا انضباط

اس آیت مبارکہ (جس میں نظام شمس کا ذکر کیا گیا ہے، کہ آفتاب اللہ تعالی کے ارادے سے ایک خاص جگہ سے چلتا ہے اور ایک خاص جگہ پہونچتا ہے اور وہ اپنا پورا سفر اللہ کی قدرت اواس کے علم کے مطابق طے کرتا ہے) روشنی میں آفتاب رسالت، آفتاب دین حق، آفتاب دین ودعوت کے نظام شمس کے انضباط اور اپنے مقاصد کی تکمیل کو بھی سمجھا جاسکتا ہے، ان کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اس میں اتفاقات کوئی چیز نہیں ہیں، وہ سب اللہ کے منشا اور اس کے حکم کے مطابق اوراس کی حکمت کے عین موافق گردش کرتے ہیں، اوراس کے تابع ہو کر ان کا نظام چلتا ہے۔

آپ اس نظام نیابت کو دیکھیں جو "خلافت راشدہ" کے لقب سے مشہور ہے کہ آنحضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے سفر کرنے کے بعد جو شخصیتیں مسند خلافت پر آئیں اور پھر جس ترتیب کے ساتھ مسند خلافت پر متمکن ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے فرائض خلافت ادا کرنے کا جو موقعہ ان کو عطا فرمایا یہ بالکل "ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمُ" کا مظہر ہے۔ اس سلسلہ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی ترتیب اور ایسے نظام کے ساتھ چلایا کہ وہ اس کی رحمت واسعہ، اسکی حکمتِ بالغہ اور اسکی قوتِ قاہرہ کی ایک مثال ہے۔

پہلی ضرورت دین کی حفاظت کا کام

مذاہب وادیان کی تاریخ بتاتی ہے کہ دین کے لئے جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے (میں ریڑھ کی ہڈی نہیں کہوں گا اس کیلئے یہ روح کا درجہ رکھتی ہے) وہ اس دین کی

حفاظت کا کام ہے۔ اس کا لانے والا، اس کا حامل اول اس کو جس طرح لایا ہے اور اس میں جس چیز کا جو مقام ہے اور جس چیز کا جو درجہ اور اس کی جو ترتیب ہے اس کے مطابق اس کا جانشین اس کو قائم رکھے اور اس میں ذرا بھی تبدیلی کا روادار نہ ہو، یہ سب سے ضروری اور اہم کام ہوتا ہے۔ مذاہب کی تقدیر کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ پیغمبر کے بعد (اس دین کے اولین لانے والے کے بعد) کون اس کی جگہ لیتا ہے کہ دین اپنی اصلی حالت اور صحیح ترتیب پر اور اس کی تعلیمات اپنی اہمیت کے مطابق اپنے مقام پر قائم و باقی رہیں؟

ایمان کامل کے بعد، معرفت الٰہی کے بعد اور توحید خالص کے بعد دنیا میں جو بہترین اوصاف ہو سکتے ہیں ان میں سب سے زیادہ کسی مذہب کے بقاء کے لئے (میں ارتقاء نہیں کہتا ارتقاء تو بعد کی چیز ہے) جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ ہے جذبہ حفاظت اور نبی کی تعلیمات کے بارے میں شدید غیرت...... دوسری صفات بعد کی ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر ان سب کا مقام ہے لیکن پہلی شرط جس پر دین کی بقاء کا انحصار ہے وہ یہ کہ نبی کا جانشین اس کا نائب اس کی جگہ پر امت کی رہنمائی کا منصب سنبھالنے والا جو کچھ بھی ہو اپنی جگہ پر لیکن دین کے معاملہ میں حد درجہ غیور ہو۔ اس سے بڑھ کر ذکی الحس، اس سے بڑھ کر خوددار و حساس، اس کے ایک ایک نقطہ کی حفاظت کا جذبہ رکھنے والا کوئی دوسرا نہ ہو۔

سارے مذاہب و ادیان کی تاریخ بتاتی ہے کہ سب سے زیادہ یہ مذاہب اس وجہ سے تحریف کا شکار ہوئے اور انھوں نے بہت جلد اپنی شکل بدل دی اور ایک دوسرے راستہ پر پڑ گئے کہ ان مذاہب کو اپنے لانے والوں کے بعد (لاکھوں درود و سلام ہوں

ان پر) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا جانشین، محافظ وامین اور وفادار و غیور جانشین نہیں ملا۔ حضرت ابو بکر صدیق کس درجہ کے آدمی تھے؟ ان کی صفات، کمالات، فضیلت، ان کا عدل و تقوی، خدا کے ساتھ ان کا تعلق اور ان کا زہد وایثار یہ سب سیرت اور حدیث کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

لیکن ان کی سب سے بڑی اور غالب صفت جس کی پہلے مرحلہ میں سب سے بڑھ کر ضرورت تھی، وہ ان کی دین کے بارے میں حد سے بڑھی ہوئی غیرت، ذکاوت حس، اس کے ایک ایک نقطہ کی حفاظت کا جذبہ اور منشائے رسول کی تکمیل کا غیر متزلزل عزم و فیصلہ تھا۔ یہ ان کا وصف خاص اور انکی سیرت کی کلیدی صفت ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ آج دین پر عمل ہو رہا ہے، فرائض اور شرعی احکام زندہ ہیں۔ دین تحریف اور امت کلی طور پر ضلالت سے جو محفوظ ہے یہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اسی حفاظت دین کے جذبہ کا نتیجہ اور ظہور ہے اور ان کی خلافت اولی کا رہین منت ہے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ دین کے بارے میں ایسی غیرت رکھتے تھے جو غیرت عزت و آبرو کے بارے میں ہوتی ہے۔ اور یہی ان کا سب سے بڑا وصف اور ان کا اصلی جوہر تھا۔ جس کی اس وقت سب سے زیادہ ضرورت تھی، ان کے اس وصف کو ان کا وہ جملہ بتاتا ہے جس کو تاریخ نے انھیں کے لفظوں میں نقل کیا ہے۔ یہ جملہ خود بول رہا ہے کہ وہ کس دل سے نکلا ہے اور کس ایمان و یقین کے ساتھ نکلا ہے۔ وہ جملہ ہے "أینقص الدین وانا حی" (میرے جیتے جی دین میں کتر بیونت ہو سکتی ہے؟ میری

آنکھوں کے سامنے اللہ کے دین میں ایک حرف کیا ایک نقطہ کی بھی کمی ہو سکتی ہے؟

یہ ہے وہ چیز جس کی مذاہب وادیان کو سب سے پہلے ضرورت پڑتی ہے اور یہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں بدرجۂ کمال موجود تھی۔

دوسری ضرورت حاملین دین کا مزاج نہ بدلنے پائے

اب دوسرے نمبر پر ضرورت تھی کہ دین تو محفوظ رہ گیا لیکن حاملین دین بھی محفوظ رہیں اور جو داعیانِ اول ہیں اور اس کے نمونہ اکمل ہیں اور جو اس کے عملی پیکر اور اس کا مظہر کامل ہیں ان کا مزاج بدلنے نہ پائے۔

اس وقت روم اور شام اور ایران فتح ہو رہے ہیں، مصر و شام کی دولت امنڈ امنڈ کر آرہی ہے اور بارش کی طرح برس رہی ہے جن کو آنکھوں نے کبھی دیکھا نہیں تھا وہ چیزیں ان کے ہاتھوں میں آرہی ہیں۔ اب خطرہ یہ تھا کہ امت تمدن کے اس سیلاب میں بہ نہ جائے۔

اللہ تعالیٰ اس موقعہ پر ایسی ہستی کو سامنے لایا جو اس وصف میں سب سے زیادہ ممتاز تھی۔ کہا نہیں بالکل نہیں...... میرے سامنے عربوں کا، امت اسلامیہ کا مزاج نہیں بدل سکتا، یہ تمدن کا شکار نہیں ہو سکتے، عیش و عشرت میں نہیں پڑ سکتے، انھوں نے عربوں کو بڑی تاکید سے سادگی، جفاکشی، شہسواری، زہد و قناعت اور اپنی قدیم نسلی سپاہیانہ و متقشفانہ خصوصیات قائم رکھنے کی ہدایت و تلقین کی۔

اسلامی فتوحات اور باکمال افراد کی ضرورت

تیسرے نمبر پر کس چیز کی ضرورت تھی؟ فتنہ ارتداد ختم ہو چکا، تحریف کا دروازہ بند ہو چکا، انسانی مساوات اور عدل کا نظام قائم ہو چکا تھا، اب ضرورت تھی کہ یہ اسلامی مملکت قائم رہے گی تو خیر کا دروازہ کھلا رہے گا، کیسی کیسی قومیں حلقہ بگوش اسلام ہوں گی، کیسے کیسے باکمال افراد پیدا ہوں گے۔ کیسے کیسے عالم ربانی پیدا ہوں گے، کیسے کیسے آئمہ و مجتہدین پیدا ہوں گے۔ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ جیسے، کیسے کیسے محدث پیدا ہوں گے، امام بخاری اور امام مسلمؒ جیسے، کیسے کیسے قانون ساز پیدا ہوں گے، امام ابو یوسف اور امام محمدؒ جیسے، کیسے کیسے فاتح پیدا ہوں گے، عقبہ بن نافع اور طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم جیسے۔

چنانچہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب فرمایا، کیونکہ انھیں کے خاندان کے لوگ زیادہ تر ملکوں کے فاتح اور حاکم و منتظم تھے اور یہ انسانی فطرت ہے کہ جب اہل کاران سلطنت کا خونی رشتہ بھی ہوتا ہے، نسبتی و وطنی رشتہ بھی ہوتا ہے تو وہ اس چیز کو اپنی چیز سمجھتے ہیں، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ہم محض ملازم ہیں اور جوابدہ ہیں تو اس وقت اس کے ساتھ خیر خواہی کرتے ہیں، اب یہاں پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ضرورت تھی، چنانچہ وہ آئے اور تاریخ بتاتی ہے کہ کیسی فتوحات ان کے زمانہ میں ہوئیں۔ آپ کے زمانہ میں قبرص، افریقہ کا ایک بڑا حصہ، آذربائیجان، اصطخر، سابور، شیراز، اصفہان، طبرستان، سجستان اور نیشاپور فتح ہوئے۔

سیاسی اقتدار کی ضرورت

اسلام کی طرف سے اب بالکل اطمینان ہو چکا تھا، سیاسی، انتظامی اور عسکری طور پر اب کوئی خطرہ باقی نہ تھا۔ اب ضرورت تھی کہ مسلمان اتنے دنوں تک حکومت کر چکے تھے اور تمدن کا اثر پڑنا لازمی تھا اور سیاسی طرز فکر کا آنا بھی ضرری تھا کہ آدمی سیاسی اقتدار کے ذریعہ سوچے اور فیصلہ کرے کہ اس وقت یہ کرنا مناسب ہے اور یہ کرنا نامناسب، سیاسی مصلحت کا تقاضہ یہ ہے اور دین کا مطالبہ یہ ہے۔

اب ضرورت تھی کہ خلیفہ رابع سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو لایا جائے جن کا اصل وصف اور اصل امتیاز یہ تھا کہ سیاسی اصولوں اور سیاسی منافع اور مفادات پر خالص دینی اصولوں کو ترجیح دی جائے اور اس کی ذرا پرواہ نہ کی جائے کہ خلافت ہاتھ میں رہے گی یا نکل جائے گی، نہیں یہ چیز یہاں کے لئے مناسب نہیں اس کو بدل دینا چاہئے۔ یہ کام یہاں نہیں ہونا چاہئے۔

آپ کے عہد خلافت کی ایک یہ خصوصیت وافادیت تھی کہ آپ نے اس کا نمونہ پیش کیا کہ اندرونی فتنوں، ہم مذہبوں کی مخالفت وانتشار کے دور میں کسی طرح اصول پر قائم رہا جاتا ہے اور سیاست دین پر غالب نہیں ہونے پائی، امام ابو حنیفہؒ نے خوب فرمایا کہ اگر حضرت علیؓ کا دور نہ ہوتا تو ہمیں خیر القرون کی کوئی مثال اور نمونہ نہ ملتا، کہ فتنوں اور خود مسلمانوں کی مخالفت کی حالت میں کیا کرنا چاہئے۔

یہ تھا وہ جوہر جس کی چوتھے نمبر پر ضرورت تھی...... اسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ

نے اس سلسلہ کو جاری رکھا، اور دیکھئے یہی ہے تقدیر الٰہی اور "ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمُ" سے میں اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ آپ روز سورج کو مشرق سے نکلتے اور مغرب میں ڈوبتے دیکھتے ہیں۔ یہی تنہا اللہ کے قہار ہونے اور حکیم و غالب ہونے کی دلیل نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ آفتاب رسالت کے اللہ تعالیٰ کے جو منازل مقرر کئے اور جن منازل سے اس کو گذارا۔ اور جس طرح کے اس کے دین کو تکمیل تک پہونچایا اور اس طرح جس کے جانشین مہیا کئے اور اپنے نبی کو جو خلفاء دئے یہ بھی "ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمُ" کا مظہر ہے۔(۱)

---

(۱) ماخوذ باختصار از "خلفائے اربعہ کی تربیت خلافت میں قدرت و حکمت الٰہی کی کار فرمائی ص۲۶ تا ۲۹

باب ۱۲

عبرت وموعظت

"قرآن مجید:-

......قوموں...... تاریخی ادوار...... مختلف مراحل حیات

اور مختلف زندگیوں کے انواع واقسام کا..................

ایک بولتا ہوا مرقع......اور چمکتا ہوا صاف وشفاف آئینہ ہے،

جس کا جی چاہے:-

فرد ہو یا قوم......جماعت ہو یا انجمن

......خاندان ہو یا قبیلہ......

اس میں اپنی صورت دیکھ لے،

اور اپنے متعلق خود فیصلہ کرلے کہ......

ہمارے ساتھ:-

کیا معاملہ ہونے والا ہے،

اللہ تعالیٰ سے کسی کا رشتہ نہیں......!

(حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ)

”جاہلیت“ اور ”اسلام“ کا فرق

”جاہلیت“ اور ”اسلام“ کا ذکر قرآن مجید نے اپنے بلیغ انداز میں کیا ہے اور عظیم الشان فرق بتایا ہے جو ان دونوں میں پایا جاتا ہے۔ فرمایا ہے:-

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْكُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَاناً وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ. (آل عمران۔ ۱۰۴)

اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے، اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہونچ چکے تھے تو خدا نے تم کو اس سے بچالیا۔

أَوَ مَنْ كَانَ مَيْتاً فَأَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهِ فِي النَّاسِ. (الانعام)

بھلا جو (پہلے) مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لئے روشنی کر دی جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے۔

حقیقت میں جاہلیت اور اسلام کی اس سے زیادہ بولتی ہوئی تصویر نہیں کھینچی جا سکتی، اور دونوں کے فرق و خصائص کو اس سے زیادہ وضاحت اور بلاغت کے ساتھ

بیان نہیں کیا جا سکتا۔

جاہلیت اور اسلام کی پوری تاریخ انھیں دونوں آیتوں کی تفسیر اور اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

"جاہلیت" کیا ہے "کُنْتُمْ اَعْدَاءً" اور "کُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ" کا مظہر! اور اسلام کیا ہے "اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ" کی تفسیر اور "أَنْقَذَكُمْ مِنْهَا" کی تصویر! عہد جاہلیت میں ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ انسان کی صحیح تعریف اس سے زیادہ صحیح اور اس سے زیادہ بلیغ نہیں کی جا سکتی، جو قرآن نے "أَوَمَنْ كَانَ مَيْتاً" سے کی ہے، اسلامی انقلاب بلکہ مجموعہ، انقلابات اور سلسلہ انقلابات کی اگر تصویر کھینچنا ہو تو اس کے لئے "فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ" سے زیادہ بلیغ لفظ نہیں مل سکتے۔(۱)

اللہ تعالیٰ نے (جیسے کوئی ہجے کر کے بتاتا ہے) اور دو اور دو چار اس طریقہ سے سمجھایا ہے، بھلا وہ جو مردہ تھا "اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ" ہم نے اس کو زندہ کیا، اور اتنا ہی نہیں "وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ" ہم نے اس کو ایک روشنی عطا کی جس کے سہارے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے "كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا" کیا وہ اس کی طرح ہو سکتا ہے کہ جو اندھیروں میں بھٹکتا پھرتا ہے، نکلنے کا اس کو کوئی راستہ ہی نہیں ملتا (۲)

---

(۱) مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی ص ۱۲۲

(۲) تحفہ دین و دانش ص ۶۵-۶۶

جاہلی طور طریقوں سے بچنے کی تاکید

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ
(سورہ المائدہ. ۵۰)

تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، حالانکہ جو لوگ یقین رکھنے والے ہیں ان کے یہاں اللہ سے بہتر اور کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں۔

"حکم" کے معنی

سورۂ مائدہ کی آیت ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اَفَحُكْمُ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ" کیا وہ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں۔ میں "حکم" کے متعلق عرض کردوں، عربی زبان سے ایک خصوصی تعلق رکھنے والے انسان کی حیثیت سے اور عربی ذخیرہ کی چھان بین کرنے والے طالب علم کی حیثیت سے بھی! "حکم" کا لفظ قرآن مجید میں بڑا وسیع اور بلیغ ہے، "حکم" کے معنی صرف قانونی فیصلہ کے نہیں "ترجیح" و "اختیار" کے بھی ہیں، کسی چیز کو ترجیح دینا اور کسی چیز کو اختیار کرنا یہ بھی "حکم" میں شامل ہے، "حکم" کا لفظ ان سب معانی پر حاوی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

کیا جاہلیت کے فیصلہ کو، کیا جاہلیت کے انتخاب کو، کیا جاہلیت کے رجحان کو، کیا جاہلیت کے اصول کو وہ ترجیح دیتے ہیں؟ وہ چاہتے ہیں "وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ" اللہ تعالیٰ سے بہتر حکم دینے والا ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں کون ہے؟

جاہلیت کا مفہوم

سارا مسئلہ اسلام اور جاہلیت کے فرق کا ہے اور اب میں معذرت کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں، ہمارے بہت سے پڑھے لکھے بھائی بھی "اسلام" و "جاہلیت" کے فرق کو بھول چکے ہیں، چونکہ جاہلیت ان کے نزدیک ختم ہو چکی ہے۔ زیادہ تر "جاہلیت عربیہ" ان کے ذہن میں ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ جاہلیت اور اسلام کی کوئی کشمکش اب نہیں ہے اور اسلام و جاہلیت کے فرق کو سوچنا اور اس کا جائزہ لینا گویا ایک طرح سے تضییع اوقات ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ملت میں جو بھی کمزوریاں اور خرابیاں ہیں وہ سب اس فرق کو فراموش کر دینے کا نتیجہ ہے جو اسلام اور جاہلیت کے درمیان ہے۔

جاہلیت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف جاہلیت عربیہ مراد ہے اور جاہلیت عربیہ سے مراد ہے بت پرستی کا دور، دختر کشی کا دور، شراب نوشی کا دور، اور رہزنی کا دور، ان کے سامنے صرف یہ آتا ہے ہے لیکن معاشرت، طرز معیشت، طرز زندگی، فیصلے کرنے کے معیار و اصول اور رغبات اور نفرتیں، یہ چیزیں جاہلیت کے تصور کے ساتھ ذہن میں نہیں آتیں، حالانکہ جاہلیت ان سب پر مشتمل ہے، اگر جاہلیت کا

ترجمہ اردو میں کیا جائے تو اس کا جو ترجمہ حاوی ہے اور ان سب چیزوں کو اپنے ضمن میں لے لیتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ دور ہے جو نبوت کی روشنی اور ہدایت سے محروم رہا ہے، قوم کا وہ دور جو نبوت کی روشنی اور ہدایت سے محروم رہا ہے، چاہے وہ یورپ ہو یا ساسانی مملکت ہو، چاہے وہ ہندوستان ہو، چاہے وہ عرب ہو، میں اس کا ایک دوسرا ترجمہ کرتا ہوں "من مانی زندگی"! جاہلیت کیا ہے؟ من مانی زندگی گذارنا، یہ روح ہے جاہلیت کی، جاہلیت کی اسپرٹ ہے، جو چیز اسلام کی مخالف و متوازی ہے اور آسمان سے اللہ کے نازل کئے ہوئے ادیان سے اور صحف سماوی سے اور تعلیمات ربانی سے بے نیاز ہے، وہ یہ ہے کہ نبوت اور ہدایت آسمانی کی روشنی سے جو دور محروم ہو وہ جاہلیت ہے اور اس میں پھر کیا ہوتا ہے، زندگی کیسے گذاری جاتی ہے، من مانی زندگی، یعنی جو دل میں آئے جو ہماری سوسائٹی، ہمارا ماحول چاہتا ہے اور جو معیار اس وقت مقرر ہو چکے ہیں اور "حیثیت عرفی" کے اظہار کے جو اصول مقرر ہو گئے ہیں ہم تو اس پر چلیں گے، یہ ہے من مانی زندگی! اور اس کو قرآن ور حدیث کی اصطلاح میں "جاہلیت" کہا گیا ہے۔

جو جاہلیت کا نعرہ لگائے

دیکھئے اگر آپ احادیث کا جائزہ لیں تو آپ کو کئی جگہ ایسا معلوم ہوگا کہ حضور ﷺ نے ایسی چیز پر بھی جس کا تعلق عقیدہ سے نہیں تھا، جاہلیت کا اطلاق فرمایا، ایک صحابی ہیں (جن کا نام نہیں لوں گا) ان کا معاملہ اپنے ملازم کے ساتھ کوئی مساویانہ نہیں تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: "انك امرؤ فيك جاهلية" تم ایک ایسے

آدمی ہو، تمہارے اندر جاہلیت کی بو ہے، اب عقائد تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، خادم کے ساتھ ایسا معاملہ رکھنا کہ یہ مالک ہے اور وہ مملوک ہے، اس کو جاہلیت کہا اور پھر اس سے بڑھ کر ''من تعزیٰ علیکم بعزاء الجاهلية'' جو تمہارے سامنے جاہلیت کی دعوت دی، عصبیت جاہلیت کی طرف بلائے ور جاہلیت کا نعرہ لگائے، اس کے ساتھ سخت کلام کرو، سخت سے سخت بات اس کے سامنے کہو ''ولا تکنوا'' اور کنایہ واشارہ سے بھی کام نہ لو۔ اس کو جاہلیت کیوں کہا؟

فرمایا:............''من تعزی علیکم بعزاء الجاهلية'' اس کے معنی اگر آپ کسی عالم سے پوچھیں تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں جو تمہارے سامنے جاہلیت (خلافِ اسلام) کا نعرہ لگائے، اس کے کسی فعل یا رواج کی تحسین کرے، تم سخت لفظ استعمال کرو اور ذرا بھی رعایت، اشارہ اور کنایہ سے کام نہ لو، کون کہہ رہا ہے وہ رحمۃ للعالمین فرما رہے ہیں، اور جو سراپا رافت ورحمت ہیں وہ یہ کہہ رہے ہیں، مثال نہیں مل سکتی۔ اس سے آپ اندازہ کیجئے کہ جاہلیت کو، جاہلی زندگی کو، جاہلیت کے معیاروں کو، جاہلی دعوتوں کو کس نظر سے خدا نے بھی دیکھا ہے اور اس کے رسولؐ نے بھی دیکھا ہے۔

یہ سوچنے کی بات ہے کہ آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین اور اعظم ترین پیغمبر کی بعثت جس زمانہ میں ہوئی اس میں ہزاروں عیب تھے، بت پرستی، ظلم وڈاکہ زنی، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا وغیرہ۔ اسی طریقہ سے پچاس قسم کے عیب ان کے اندر تھے، اس سے مسلمانوں کو سبق لینا چاہئے کہ اس دور کا نام ''جاہلیت'' رکھا گیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس زمانہ کی مذمت کرنے کے لئے اور س زمانہ کے عیب

کو ظاہر کرنے کیلئے اور اس جیسے زمانہ سے ڈرانے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے عربی جیسی فصیح زبان میں اس عہد کا نام "جاہلیت" رکھا۔ یہ کہا ہوتا کہ بت پرستی کا زمانہ، یہ کہا ہوتا کہ کشت وخوں کا زمانہ، یا یہ کہا ہوتا کہ ظلم وزیادتی کا زمانہ یا خانہ جنگی کا زمانہ، لیکن قرآن شریف میں اس عہد کا نام "جاہلیت" آیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے۔

(۱) وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلىٰ	دیکھو عورتو! تم اس طرح اور بے پردہ نہ پھرو جس طرح جاہلیت اولی میں ہوا کرتا تھا۔
(۲) اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ.	جبکہ لوگوں نے اپنے دل میں جھوٹی غیرت اور خواہ مخواہ کی خودداری پیدا کی جو جاہلیت اولیٰ کی تھی۔
(۳) اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ.	تو کیا یہ لوگ جاہلیت کے فیصلہ کو چاہتے ہیں۔

اسلام کی صحت کی دلیل جاہلیت اور اس کے متعلقات سے نفرت ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں "جاہلیت" کا لفظ استعمال کیا ہے، ہم قرآن شریف پڑھتے ہیں، گذر جاتے ہیں ہمیں خیال نہیں آتا، الفاظ کا انتخاب یہ بڑی اہم چیز ہوتی ہے، جس کو مصنف وادیب، محققین اور بڑے وسیع النظر لوگ اور اعلیٰ درجہ کے زبان داں جانتے ہیں کہ کسی چیز کے لئے کسی لفظ کا اگر انتخاب کیا جاتا ہے تو اگر وہ آدمی حقیقت شناس ہے، نبض شناس ہے اور زبان پر اس کو پوری قدرت ہے تو وہ ایسا لفظ انتخاب

کرتا جو اس کی پوری تصویر کھینچ دے۔ اور اگر وہ چاہتا ہے کہ اس کی حقارت پیدا ہو تو ایسا لفظ لاتا ہے کہ اس سے حقارت پیدا ہو جائے، اگر تعریف کرنا چاہتا ہے تو ایسا لفظ لاتا ہے جس سے اس کی عظمت پیدا ہو، عزت پیدا ہو۔

اللہ تعالیٰ زبانوں کا، الفاظ کا خالق ہے، معانی و حقائق کا خالق ہے اور ادیبوں، شاعروں اور بڑے بڑے اہل کمال کا خالق ہے، وہ اس عیب کو کسی اور لفظ سے تعبیر کر سکتا ہے۔ لیکن دیکھئے یہ ہم کو سبق دیا گیا ہے کہ ہمیشہ جاہلیت سے ڈریں، کہ وہ جو زمانہ باقی رہنے کے قابل نہیں تھا، خدا جانے کس وقت اس پر اللہ کا عذاب آجاتا، اللہ تعالیٰ نے بڑا رحم و کرم فرمایا، انسانیت پر رحم فرمایا کہ عرب کے اس دور میں اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے محبوب، سب سے بڑے پیغمبر کو پیدا کیا۔ لیکن اس زمانہ کا جب ذکر آتا ہے اور قرآن شریف میں اس کی صفت آتی ہے تو جاہلیت کے لفظ سے آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بڑے جلال سے ارشاد فرمایا "اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ" یہ اسلام کے قانون کو نہیں مانتے اور شریعت کے فیصلہ کو تسلیم نہیں کرتے تو کیا یہ لوگ جاہلیت کے فیصلہ کو چاہتے ہیں۔

یہاں پر دیکھئے اس غصہ کا اظہار کرنے کیلئے کتنا سخت لفظ آنا چاہئے تھا، مگر اللہ تبارک و تعالیٰ کی نگاہ میں اور قرآن کریم کی زبان میں "جہالت" اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کو "جاہلیت" کہا گیا۔

اسلام کی صحت کی دلیل یہ ہے کہ (کفر) "جاہلیت" اور اس کے پورے ماحول، اس کے تمام متعلقات اس کی تمام خصوصیات اور شعائر سے نفرت پیدا ہو جائے، اس

کی طرف واپسی اور اس میں مبتلا ہو جانے کے تصور سے آدمی کو تکلیف ہو، اور ایمان کی پختگی یہ ہے کہ وہ کفر (زمانہ جاہلیت) کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ کام کے مقابلہ میں موت کو زیادہ پسند کرتا ہو۔

"اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ" کیا جاہلیت کے رسم ورواج کو چاہتے ہیں کیا جاہلیت کے ترجیح وانتخاب کو چاہتے ہیں؟ جاہلیت کے فیصلہ کو چاہتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ حکم کے معنی صرف فیصلہ کے نہیں، بلکہ ترجیح واختیار کے بھی آتے ہیں، یعنی آدمی کسی چیز کو اختیار کرتا ہے جو قوت محرکہ ہوتی ہے جو اسکی دلیل ہوتی ہے وہ بھی اسکے اندر شامل ہوتی ہے، کیا جاہلیت کا فیصلہ قبول کریں گے، جاہلیت نے جس چیز کو ترجیح دی ہے، اختیار کیا ہے اس کو اختیار کریں گے اس پر چلیں گے؟ یہ جائز نہیں۔(۱)

قرآن مجید

"مجموعی حیثیت بھی وہ معجزہ ہے اور انفرادی حیثیت سے بھی،
یعنی ایک ایک آیت بھی اس کا الگ معجزہ ہے بلکہ اگر میں
(عربی زبان کے ایک طالب علم کی حیثیت سے)
یہ کہوں کہ اس کا ایک یک لفظ بھی مستقل معجزہ ہے
تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے!"

(۱) ا۔ کل مسلمان اور مکمل اسلام تلخیص از ص ۷ تا ص ۲۷ ۲۔ مدارس ومکاتب کا قیام سب سے ضروری چیز (غیر مطبوعہ تقریر) ص ۴-۶ ۳۔ اسلام کے قلعے ص ۳۶-۳۷ مشترک اخذ وتلخیص

امت مسلمہ کو قرآنی انتباہ

لَاتَرْکَنُوْا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ، وَمَالَکُمْ مِنْ دُوْنِ اللہِ مِنْ اَوْلِیَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ.

"(اے مسلمانو!) ان ظالموں کی طرف مت جھکو، کبھی تم کو دوزخ کی آگ جلاوے اور (اس وقت) خدا کے سوا تمہارا کوئی رفاقت کرنے والا نہ ہو، پھر حمایت تو تمہاری ذرا بھی نہ ہو۔" (سورہ ہود:)

تمہارا دل مائل ہونے نہ پائے

ہم میں اکثر عربی جانتے ہیں لیکن بعض دفعہ زبان کا جاننا بلکہ اس سے بھی زیادہ زبان جاننے کا احساس و شعور اور دعویٰ حجاب بن جاتا ہے، مفہوم صحیح تک رسائی سے۔

اس آیت کا جو زور ہے اس کی وجہ سے ہمیں کہنا پڑا کہ ہماری عربی فہمی حجاب بن سکتی ہے، آیت کے ہر لفظ کے معنی ہمیں معلوم ہیں لیکن آیت کی جو روح ہے اس کا جو اعجاز ہے اور لفظ کی جو قوت ہے اس کا سمجھنا آسان نہیں۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ تمہارا دل مائل نہ ہونے پائے، تمہارے اندر قلبی

رجحان نہ ہونے پائے ان لوگوں کی طرف جنھوں نے ظلم کا شیوہ اختیار کیا ہے، جن کی زندگی سیدھے راستے سے ہٹی ہوئی ہے اور جو خدا سے بُعد اختیار کئے ہوئے ہیں فَتَمَسَّكُمُ النَّارَ، ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آگ کی لپٹ تم تک بھی پہونچ جائے گی آگ تم کو بھی چھولے گی وَمَالَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللهِ مِنْ اَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ. اور پھر اللہ کی ولایت سے محروم کر دیئے جاؤ گے اور کوئی تمہاری مدد بھی نہیں کر سکے گا۔

ہمارے ذہن میں یہ ہے کہ شریعت کی اصطلاح میں، احکام شرعی میں اور دین کی زبان میں دو ہی چیزیں ہیں مثلاً یہ کفر ہے یہ ایمان ہے، یہ حلال ہے یہ حرام ہے، یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے، لیکن ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے علاوہ بھی کچھ چیزیں ہیں جن کو بعض دفعہ حرام اور کفر کہنا مشکل ہوگا لیکن وہ چیزیں دو خانوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں، ایک وہ جو اللہ کو پسند ہیں اور دوسری وہ جو اللہ کو ناپسند ہیں، یہ اصول قرآن مجید کے مطالعہ سے، کتاب و سنت کے علم سے، مزاج نبوی کے جاننے سے، صحابہ کرامؓ کے طرز فکر سے اور سوچنے سمجھنے کے پیمانہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ علاوہ کفر و ایمان کے، علاوہ حلال و حرام کے اور علاوہ جائز و ناجائز کے بھی کچھ چیزیں ہیں اور وہ کیا ہیں؟ وہ ہیں رہنے سہنے کا طریقہ، صورت اور شکل، شعار اور پہچان اور دنیا میں تجمل و زینت کے اسباب کے اقسام۔

مطالبہ کیا ہے؟

جس وقت حضورؐ کی بعثت ہوئی اور اسلام آیا تو مطالبہ صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ دعوتِ ایمانی اختیار کرو، اس پر ایمان لاؤ اور اس کے قائل ہو، شرک سے توبہ کرو اور

کفر سے بچو، بلکہ ایک پوری تہذیب بھی دی گئی، ایک پورا طرز زندگی بھی ملا، اور مسلمانوں سے کہا گیا کہ یہ وضع اختیار کرو، اس پر اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی و رحمت کی نگاہ پڑتی ہے اور ان سے بچو کہ یہ راندۂ درگاہ اور مغضوب علیہم قوموں کا شعار ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے تخریب کا کام لیا اور جن پر اللہ کا عتاب ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بھی یہ تعلیم دی ہے کہ تم بھی ان کو قابل نفرت سمجھو۔

یہ بہت بڑا دین کا ایک نکتہ میں بیان کر رہا ہوں جس پر بہت سے اچھے لوگوں کی نظر نہیں ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں فرض و واجب تو نہیں ہیں، اس سے کفر و فسق تو لازم نہیں آتا، آپ جب کسی ذمہ دار اور مفتی صاحب سے پوچھیں گے اور ان کو فتویٰ دینا اور حکم شرعی بیان کرنا ہو تو یہی کہے گا کہ یہ نہ کفر ہے نہ شرک، لیکن اس کے بعد پھر وہ چیز ہیں جو اللہ تعالیٰ کی معتوب قوموں، اور نعمت اسلام کا انکار اور ناقدری کرنے والی قوم اور اپنی جگہ پر مستقل رہنے والی قوم اور نفس پرست و دنیا پرست، دولت پرست، اقتدار پرست اور خواہشات نفس کی پیروی کرنے والوں کا شعار ہیں، اور اس میں ان کی وضع وصورت بھی نظر آتی ہے، کہ جو دولت ایمان سے محروم ہیں اور بعثت نبوی کے وقت بھی محروم رہیں اور برابر ان کا سلسلہ جاری ہے یا ان کے بعد جو نسلیں پیدا ہوئیں، انھوں نے وہ قدیم راستہ اختیار کیا ان سب کی وضع وصورت میں داخل ہے۔

ایک مسلمان جو دینی مزاج پیدا کرنا چاہتا ہے اور صرف احکام ظاہری کا پابند نہیں بلکہ واقعی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور حضورؐ کی دعاؤں کا مستحق بننا چاہتا ہے اور اس کو یہ

خیال ہے کہ اللہ کے رسول کو ہمیں اپنی صورت دکھانی ہوگی، یا اس کو خیال ہے کہ قبر میں فرشتے آئیں گے، سوال وجواب کریں گے یا پھر میدانِ حشر کا کوئی تصور اس کے سامنے ہے اگر یہ بھی نہیں تو کم از کم اتنا سمجھتا ہے کہ خدا کے یہاں اس کے تاثرات کا، جذبات کا، پسندیدگی وناپسندیدگی کے اظہار کا پورا ذخیرہ موجود ہے، اس میں اور آنکھوں سے دیکھ لینے میں کوئی فرق نہیں، جہاں تک تعلق ہے حجت اور قطعیت کا تو کتاب وسنت کے مطالعہ سے احادیث اور سیرت نبوی کے ذخیرہ سے جو باتیں بدرجہ یقین ہم تک پہونچ گئی ہیں ان میں اور مشاہدہ میں کوئی فرق نہیں اور ہونا بھی یہی چاہئے، ایمان کی کمزوری ہے کہ اس میں فرق سمجھے، تو ایسے شخص سے مطالبہ ہے کہ وہ غیر مسلموں کی، مذہبی اقدام کی، اسلام سے نفرت کرنے والوں، اسلام کے خلاف محاذ جنگ قائم کرنے والوں اور اسلام کی تہذیب ومعاشرت کو تحقیر کی نظر سے دیکھنے والوں کی تہذیب اور شکل وصورت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے۔

اور میں اس کو محض جزوی مسئلہ، محض نفلی چیز اور محض کمالی چیز نہیں سمجھتا کہ اللہ جس کو توفیق دے یہ بھی کرے۔ یہ بھی کرلے، نہیں میرے نزدیک نماز، روزہ اور حج وزکوۃ (ارکان اربعہ) کا مقام اپنی جگہ پر ہے، عقائد کا مقام اپنی جگہ پر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ غیر مسلموں کی وضع وہیئت، غیر مسلموں کی تمدن وتھذیب اور اقدار ومعیار (جن کو عربی میں القیم والمثل) اور انگریزی میں IDEAL AND VALUES کہتے ہیں) ان سے بھی مسلمانوں کے دل میں نفرت ہونی چاہئے، بُعد ہونا چاہئے۔ ان سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

آیت کا مفہوم

یہ اس آیت کا مفہوم ہے ”وَلَا تَرْکَنُوْا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ“ اگر ان کی طرف میلان ہو جائے، مثلاً آپ ان کو احترام اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے لگیں، آپ کسی انگریز کو کسی امریکن کو، کسی یورپین کو (جبکہ وہ پورا مجسمہ ہو اپنی تہذیب کا اور جبکہ وہ کسی انٹرویو کے لئے نکل رہا ہو، یا آفس کو جا رہا ہو) آپ نے اگر اس کی طرف اس طرح نظر اٹھائی کہ بھائی ترقی یافتہ آدمی تو یہ ہے، متمدن آدمی تو یہ ہے، معاشرت تو یہ ہے، دیکھئے صبح کو دیر میں اٹھتے ہیں اس کے بعد داڑھی بناتے ہیں، نہاتے ہیں، اس کے بعد نئی پوشاک پہنتے ہیں، پھر ناشتہ کرتے ہیں اور پھر آفس جاتے ہیں، یونیورسٹی جاتے ہیں، یہ ہے انضباط، یہ ہے باقاعدگی، یہ ہے ڈسپلن، یہ ہے زندگی گزارنے کا نمونہ۔ آپ یاد رکھئے اگر آپ کے دل میں یہ خیالات آگئے تو اس وقت اگر کوئی دیکھنے والی آنکھ ہو، کوئی صاحب کشف ہو، تو وہ دیکھے گا کہ آپ کے ایمان میں خلل پڑ گیا۔

ہم سے یہ مطالبہ ہے، صاف سن لیجئے اور خاص طور پر طالبان علوم نبوت سے یہ مطالبہ ہے، کہ صرف یہی نہیں کہ وہ نمازوں کی پابندی کریں، اور صرف فعل حرام اور منہیات سے اجتناب کریں بلکہ یہ بھی کہ وہ اپنے اس دین پر اور اس تمدن و تہذیب پر فخر کریں جو اللہ کا رسول ﷺ لایا اور صحابہ کرامؓ نے کر کے دکھایا۔(۱)

(۱) ماخوذ باختصار از تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ ر دسمبر ۱۹۸۸ء

نعمت اسلام پر شکر اور قوم موسیٰؑ کی تقلید سے اجتناب

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ.

"اور جب تمہارے رب نے تم کو آگاہ کیا کہ اگر تم شکر کروگے تو میں تمھیں زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کروگے تو یاد رکھو کہ میرا عذاب بھی سخت ہے۔"

اللہ تعالیٰ کے یہاں شکر کی بڑی قدردانی اور اس کا بڑا مقام ہے۔ حق تعالیٰ شکر پر بے انتہا دولتوں سے نوازتے ہیں۔ اللہ کی ذات بے نیاز ہے۔ اس کی مبارک صفات میں سے ایک صفت اور اسم "شکور" بھی ہے کہ شکر پر اللہ کے یہاں سے نعمتوں کی زیادتی ہوتی۔ اور ناشکری پر سلبِ نعمت کا خطرہ ہوتا ہے۔

یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ "اگر تم شکر کروگے تو میں تمھیں زیادہ دوں گا۔ اور اگر ناشکری کروگے تو یاد رکھو میرا عذاب بھی سخت ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جب دوسری قوموں کی کوئی بات دیکھتا ہے جس میں بڑی رونق ہوتی ہے، دھوم دھام ہوتی ہے، جی لگنے کا اور دلچسپی کا سامان ہوتا ہے تو شیطان ایسے موقع پر حملہ کرتا ہے، اور مسلمانوں کے اندر لالچ پیدا کردیتا ہے کہ ہمارے پاس بھی ایسی کوئی چیز ہوتی، دنیا کی کتنی قومیں ہیں جو عقیدہ توحید اور اسلام کی

نعمت سے محروم ہیں۔ وہ میلے ٹھیلے کرتی ہیں کوئی درخت کو پوجتا ہے، کوئی بتوں کے اوپر چڑھاوا چڑھاتا ہے، کھانے پکتے ہیں، جشن ہوتے ہیں، دلچسپی اور دل لگی کا سامان ہوتا ہے۔ بعض قومیں اس موقع پر پھسل گئیں اور شیطان کے حملہ کا شکار ہو گئیں۔ اور انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا (بعض نے زبان حال سے اور بعض نے اپنی زبان قال سے) کہ کاش ہمارے پاس بھی کوئی ایسی چیز ہوتی!

دنیا کی بیسوں قوموں نے خدا کے سوا بت بنائے، کسی نے قومیت کو بت بنالیا، کسی نے ملک کو بت بنالیا ہے، کسی نے زبان کو بت بنالیا ہے، کسے نے اپنے آباواجداد کی کہانیوں اور تاریخ کو بت بنالیا ہے اور کسی نے رنگ ونسل کو بت بنالیا ہے، لیکن اللہ نے مسلمانوں کو ان تمام بتوں سے محفوظ رکھا، ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہم ہمیشہ اسلام پر فخر کریں اور اسلام کے سوا کسی چیز کو لالچ اور رشک کی نظر سے نہ دیکھیں کہ کاش ہم کو بھی یہ چیز ملتی!

قومِ موسیٰؑ کا عبرت انگیز واقعہ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل کا ایک عبرت انگیز واقعہ بیان کیا ہے جس میں ہم مسلمانوں کے لئے بہت بڑا سبق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ بنی اسرائیل کو اپنی صحیح معرفت عطا فرمائی اور توحید کی اس دولت سے نوازا جس سے بڑی کوئی دولت نہیں۔ ان کے اندر ایمان پیدا کیا، تاکہ وہ یہ سمجھیں کہ اللہ کے سوا اس دنیا میں کوئی پرستش اور بندگی کے لائق نہیں اور اس کے سوا دنیا میں کسی کی حکومت نہیں۔ لیکن وہ ایسے ناقدر دان اور

نادان تھے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰؑ ان (بنی اسرائیل) کو لے جارہے تھے "فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰی اَصْنَامٍ لَّهُمْ" (وہ ایسے لوگوں کے پاس سے ہو کر گزرے کہ جو اپنے بتوں کے سامنے جھکے ہوئے تھے) انھوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جو ایک میلہ لگائے ہوئے ہیں، بازار لگا ہوا ہے، دوکانیں سجی ہوئی ہیں، اور ہر طبقہ کے لوگ موجود ہیں، کچھ وہاں بت اور خود ساختہ معبود ہیں، وہاں عبادت بھی ہو رہی ہے اور تفریح بھی ہو رہی ہے۔ ایک جشن ہے، ایک رونق ہے، اس رونق کو دیکھ کر بنی اسرائیل کے "منھ میں پانی" بھر آیا، انھوں نے بے اختیار کہا: یا موسیٰ (اجْعَلْ لَّنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ) اے موسیٰ (یہ کتنی رونق کی چیز ہے) ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی خدا تجویز کر دیجئے۔ جیسا کہ ان کے پاس ہے، جو آنکھوں سے نظر آتا ہو۔ اور اس کے قدموں میں گر سکیں، ہمارے دلوں کو اس سے کچھ تفریح حاصل ہو، اور جسمانی طور پر جسم کو مزا اور لطف آئے "اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ" ہمارے لئے بھی کوئی ایسا معبود تجویز کر دیجئے جیسے مشرکین کے کئی معبود ہیں۔

اپنے وقت کے موحد اعظم موسیٰ علیہ السلام کا جلال اپنے پورے عروج پر آگیا، بولے: اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ" تم پرلے درجہ کے نالائق اور پرلے درجہ کے ناقدرے اور پرلے درجہ کے جاہل اور احسان فراموش ہو، اتنے دنوں تک تمھیں سبق پڑھایا اور تم کو اس گندگی سے نکالا، تمہارے لئے اللہ کے یہاں سے من وسلوی اتری، اور تم یہ کہتے ہو کہ ہمارے لئے ایسا جشن اور میلہ لائیے، تمہاری عقل پر پتھر پڑے ہیں، تمھیں نظر نہیں آتا؟ "اِنَّ هٰؤُلَاءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوْا

يَعْمَلُوْنَ" یہ لوگ جس شغل میں پھنسے ہوئے ہیں وہ برباد ہونے والا ہے اور جو یہ کام کرتے ہیں سب بیہودہ ہیں" تمھیں معلوم ہے کیا ہونے والا ہے، یہ سب ملیا میٹ ہو جائے گا، یہ تھوڑی دیر کی تفریح ہے، ہم تمھیں خدا کے دروازے، آستانہ پر لائے، تمہاری تربیت کی اور تمھارا حال یہ ہے کہ ایک منظر تم نے دیکھا، ایک رونق تم نے دیکھی، سب بھول گئے، اتنے دنوں تک جو سبق پڑھا تھا وہ یکسر فراموش کر گئے۔ غیرتِ نبوی کیسے اس کو برداشت کر سکتی تھی؟

حضرت موسیٰ کو جلال آ گیا، آنا ہی چاہئے تھا اس لئے کہ وہ پیغمبر بھی ہیں، کہا "اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ. اِنَّ هٰٓؤُلَاءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ" ارے یہ جو ہے ان سب پر جھاڑو پھر جانے والی ہے۔ یہاں "متبر" کا جو لفظ ہے کوئی دوسرا لفظ اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اس میں جو تشدید ہے اور اس میں جو زور پیدا ہوا ہے، غصہ سا معلوم ہو رہا ہے، وہ "ان هولاء هالك" ان هؤلاء فاسد" ان هؤلاء فان" میں نہیں ہو سکتا "ان هؤلاء متبر" کوئی چیز نہیں، ارے اس پر جھاڑو پھر جانے والی ہے، جھاڑو کا لفظ ہم قصداً لائے کہ اس میں بھی ثقیل حروف ہیں اور کسی حد تک وہ صوتی طور پر بھی (کہیں صوتی طور پر بھی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ جلال اور جو تاثر ہے وہ ظاہر کرے یعنی حرفی بناوٹ کافی نہیں ہوتی بلکہ صوت کی بھی اس میں ضرورت ہوتی ہے) اگر "متبر" کے علاوہ کوئی لفظ کہتے ہلکا پھلکا، تو یہ بات پیدا نہ ہوتی بلکہ غصے سے ارے تمھیں اس کی تمنا ہے؟" اِنَّ هٰٓؤُلَاءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"۔

اس کے بعد انھوں نے ذرا سمجھا کر کہا: "اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهاً وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ

عَلَی العٰلَمِینَ" اللہ کے بندو! خدا تمہارے حال پر رحم کرے۔ خدا تمھیں عقل اور سمجھ دے "اَغَیۡرَ اللّٰہِ اَبۡغِیۡکُمۡ اِلٰھاً" کیا میں خدا کو چھوڑ کر کوئی اور معبود تمہارے لئے تلاش کروں؟ "وَّھُوَ فَضَّلَکُمۡ عَلَی العٰلَمِیۡن" حالانکہ اس نے تمھیں تمام دنیا پر (اسی عقیدہ توحید کی بنا پر) فضیلت بخشی ہے! اور تم یہ کہتے ہو کہ اس فضیلت دینے والے، احسان کرنے والے خدا کو چھوڑ کر جس نے فرعون کی غلامی سے تم کو نجات دی، میں کوئی عاجز اور بے اختیار خدا تمہارے سامنے لے آؤں؟

یہ بڑی عبرت کی بات ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمارے سامنے یہ مثال اس لئے دی کہ ہم اس سے عبرت لیں اور اسلامی معاشرہ کو ایسا بنادیں کہ مزاجاً، طبعاً اور قدرۃً اس کو گناہوں سے نفرت ہو اور اس کو ہر ایسی دعوت سے وحشت ہو جس سے کہ آسمانی تعلیمات اور دینی احکام اور دین پر عمل اور شریعت اسلامی مغلوب ہوتی ہو۔ اور بالکل بے لگام بے مہار زندگی کی دعوت دی جائے تو وہ آپے میں نہ رہے اور اس کو نفرت وحقارت سے بلکہ غیظ وغضب کے ساتھ ٹھکرادے۔

اس لئے ہم مسلمانوں کو اسلام پر فخر کرنا چاہئے، اور اسلام کو سب سے بڑی دولت سمجھنا چاہئے، اسلام کی نسبت کو، اسلام کی دعوت کو، اسلام کی چیزوں کو سب سے بڑھ کر سمجھنا چاہئے۔(۱)

(۱) ا۔ تحفہ مشرق ص ۱۶۔۲۷۔ ۲۔ تعمیر حیات ۲۵ر جولائی ۱۹۸۶ء

۳۔ اسلام مکمل دین ص ۳۵۔۳۷۔ ۴۔ تفسیر سورہ مریم غیر مطبوعہ سے مشترک طور پر ماخوذ ہے۔

قومِ سبا کے قصہ سے سبق

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرىً ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْر سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّاماً آمِنِيْنَ. فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ. اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْر.

(سورہ سبا: ۱۸-۱۹)

"اور ہم نے ان (قوم سبا) کی اور (شام کی) ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دی، (ایک دوسرے کے متصل) دیہات بنائے تھے، جو سامنے نظر آتے تھے اور ان میں آمد و رفت کا اندازہ مقرر کر دیا تھا، کہ رات دن بے خوف و خطر چلتے رہو، تو انھوں نے دعا کی کہ اے پروردگار ہمارے سفروں میں دوری پیدا کر دے اور اس سے انھوں نے اپنے حق میں ظلم کیا، تو ہم نے (انھیں نابود کر کے) ان کے افسانے بنا دیئے، اور انھیں بالکل منتشر کر دیا، اس میں ہر صابر و شاکر کے لئے نشانیاں ہیں۔"

قرآن مجید میں اللہ نے پچھلی امتوں کے قصے، گذری ہوئی تہذیبوں کی حکایات، اور مٹی ہوئی سوسائٹیوں کے واقعات بطور عبرت و نصیحت بیان کئے ہیں تاکہ ہم ان سے درس عبرت لیں اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے مثالیں بیان کی ہیں۔ مختلف

نمونے پیش کئے ہیں اس لئے کہ ان میں عبرت کا سامان اور سبق ہے۔

ایک جغرافیائی اور تاریخی نسب نامہ

مذکورہ بالا قرآنی آیات میں ان کا ایک جغرافیائی اور تاریخی نسب نامہ ہے، اس میں پوری انسانی سوسائٹی کے لئے، ہر اسلامی و غیر اسلامی ملک کے لئے عبرت کا سامان ہے۔ ان آیات نے ہمارے سامنے ایک زندہ جاوید عالمی حقیقت بیان کی ہے۔ اور ایسی نفسیاتی انسانی حقیقت پیش کی ہے جو ہم سے غور و فکر اور مطالعہ کی طالب ہے۔

وہ یہ کہ انسان کی فطری کمزوری ہے کہ وہ راحت و آرام، سکون واطمینان کے تسلسل اور ایک ہی قسم کی چیزوں سے (خواہ وہ کتنی ہی لذت بخش اور راحت رساں ہو) اکتا جاتا ہے، اور تبدیلی چاہتا ہے، چاہے یہ تبدیلی اس کے برخلاف اور سخت آزمائشوں میں مبتلا کر دینے والی ہو، اسی کو قرآن مجید نے "بطر" کے بلیغ لفظ سے ادا کیا ہے:

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا. (سورہ قصص: ۱۵۸)

اور ہم نے بہت سی بستیوں کو ہلاک کر ڈالا جو اپنی (فراخی) معیشت میں اترا رہی تھیں۔

ہمارے سامنے قوم سبا کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، یہ ایسا پائیدار واقعہ ہے جو انسانی طبیعت کے پہلوؤں میں ایک ایسے دقیق و عمیق پہلو کو نمایاں کرتا ہے جس کو ہمیں نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ اس سے عبرت حاصل کرنا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے گذشتہ قوموں کے واقعات اور قصے عبرت آموزی اور نصیحت پذیری کے لئے بیان کئے ہیں۔ فرمایا: "لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَاب" ان کے قصے میں عقلمندوں کے لئے عبرت ہے۔ (یوسف: ۱۱۱)

اور "فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ" ان سے یہ قصے بیان کرو تاکہ وہ فکر

کریں۔(اعراف:۱۷۶)

قرآن مجید انسانی تہذیب و معاشرت کی تاریخ کی کتاب نہیں ہے، وہ گذشتہ قوموں کے واقعات، تمدن و معاشرت کی کیفیات، اور تہذیب و ثقافت کے قصے عبرت کے لئے ذکر کرتا ہے، جن میں کچھ عجیب مماثلت پائی جاتی ہے، جن پر ماہرین نفسیات اورانسانی تاریخ کے ارباب فن و اہل کمال کو غور کرنا چاہیے، اسی طرح قائدین ملت،اوراصحاب تحقیق کے لئے لائق توجہ ہے کہ حکمت الٰہی ہمارے سامنے زندگی سے بھرپور ایک سورہ پیش کرتی ہے، جس کے خدوخال بالکل واضح، اور جس سے قوم سبا کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے، جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ قوم فراخی معشیت، فارغ البالی اور خوشحالی کے کس درجہ میں داخل ہو گئی تھی، جس کی انسان تمنا کرتا رہتا ہے، فاتحین جس کی راہ میں جہاد کرتے پھرتے ہیں، اور بانیان سلطنت جس کے حصول کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهُ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ.

(سورہ سبا:۱۵-۱۶)

اہل سبا کے لئے ان کے مقام بودوباش میں ایک نشانی تھی، (یعنی) دو باغ، ایک داہنی طرف اور ایک بائیں طرف، اپنے پروردگار کا رزق کھاؤ اور شکر کرو، (یہاں تمہارے لئے رہنے کو یہ) پاکیزہ شہر ہے اور (وہاں بخشنے کو) خدائے غفار، توانھوں نے (شکر گزاری سے) منھ پھیر لیا، پس ہم نے ان پر زور کا سیلاب چھوڑ دیا۔ اور انھیں دو باغوں کے بدلے دو ایسے باغ دیئے جن کے میوے بدمزہ تھے اور جن میں کچھ تو جھاؤ تھا،اور تھوڑی سی بیریاں۔

قرآن مجید انسان کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے اور مرض کی جگہ متعین کر دیتا ہے، اس مصیبت سے کیوں وہ دوچار ہوئے، یہ سعادت وکامرانی کیوں اللہ نے ان سے سلب کر لی، یہ عیش وعشرت کے سامان جو بادشاہوں کے لئے قابل رشک تھے کیوں ختم کر دیئے گئے، جس طرح استاد اپنے معمولی شاگرد کا ہاتھ پکڑ کر حروف تہجی پر رکھتا ہے، اسی طرح قرآن قاری کا ہاتھ رکھ رہا ہے اور کہہ رہا ہے:۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بَارَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرُ، سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا آمِنِيْنَ. (سبا:۱۸)

اور ہم نے ان کی اور (شام کی) ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دی (ایک دوسرے متصل) دیہات بنائے تھے جو سامنے نظر آرہے تھے اور ان میں آمد ورفت کا اندازہ مقرر کر دیا تھا کہ رات دن بے خوف وخطر چلتے رہو۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ قوم سبا کے مکانات بہت پر فضا مقام پر تھے، اس کی ہوا نہایت لطیف وسبک تھی، کسی آفت وبیماری کا وہاں گزر نہیں ہوتا تھا، اگر کوئی اجنبی آتا اور اس کے کپڑوں میں کھٹمل وچھر بھی آجاتے تو فوراً یہاں پہنچ کر ختم ہو جاتے، اسی طرح کوئی بھی موذی جانور نہ رہنے پاتا، اللہ تعالیٰ نے ان کے اور ملک شام کے درمیان دیہات بنائے تھے، جو سامنے نظر آتے تھے، سب ایک دوسرے سے متصل تھے اور آمد ورفت کا اندازہ مقرر تھا، وہاں کے مسافروں کو نہ زادوراحلہ کی پریشانی ہوتی تھی نہ سنسان جگہ شب گزاری کی زحمت، اور نہ دشمن کا خوف وخطر، جہاں قیام کرتے، پھل وپانی سے خاطر ہوتی، ایک گاؤں میں اگر قیلولہ کرتے تو دوسرے میں شب گزاری، (کیونکہ آمد ورفت کا اندازہ اسی طرح ضرورت کے مطابق تھا)

یہ قوم سبا کی کہانی ہے

یہ قوم سبا کی کہانی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا تھا، سفر نہایت آسان اور پر راحت بنادیا تھا، فاصلے قریب کر دیئے تھے، لیکن انھوں نے اس نعمت کی ناشکری کی، یہ انسان کی فطری کمزوری ہے، ہونا یہ چاہئے تھا کہ اس بیش بہا نعمت کی قدر کیجاتی، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے زبان تر رہتی، سراپا شکر و سپاس ہو جاتے، لیکن مانگا اس کے برعکس: قرآن کہتا ہے:-

"فَقَالُوْا رَبَّنَابَاعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا" پھر وہ کہنے لگے اے پروردگار ہمارے سفروں میں درازی کردے۔ یہ کوئی سفر ہے کہ ہم کھاتے پیتے، مزے اڑاتے، بات کرتے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں؟ ہم یہ نہیں چاہتے ہم تو تھکا دینے والے سفر چاہتے ہیں، ہم وحشت ناک صحراء، لمبے چوڑے مکان چاہتے ہیں، ہم تقشّف چاہتے ہیں، ہم خطرہ مول لینا چاہتے ہیں۔

نتیجہ کیا ہوا؟ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اللہ نے ان سے وہ سب نعمتیں سلب کرلیں اور ان کو ملکوں میں تتر بتر کر دیا اور ان کو تاریخ کا افسانہ بنادیا۔

"فَجَعَلْنَاهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ" پھر ہم نے افسانہ بنادیا اور ان کو بالکل تتر بتر کر دیا۔

بسا اوقات انسان اس واقعہ کو معمولی سمجھنے لگتا ہے، اس شک میں پڑ جاتا ہے کہ کیسے انسانی فطرت ایسی مسخ ہو گئی تھی، قوم سبا جیسی تمدن و معاشرت اور آسائش زندگی سے لبریز قوم کی فطرت اتنا اس میں فساد و بگاڑ آ گیا تھا، ایسا انحراف ان میں پیدا ہو گیا تھا، بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی، لیکن قرآن نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے اور

قرآن مجید اللہ و رسول کی وہ کتاب ہے جس پر ہوا و ہوس کا پر تو بھی نہیں پڑا۔ جو کچھ ہے وحی الٰہی ہے اور حقیقت پر مبنی ہے۔

قرآن مجید نے قوم سبا کا قصہ بیان کیا ہے، اللہ تعالیٰ خبیر و دانا اور حکیم و علیم ہے، وہ جانتا ہے کہ اس وقت سر پھری قومیں موجود ہیں۔ جو اسی طریق کار کو اپنا رہی ہیں اور اسی راہ پر چل رہی ہیں، فقر و فاقہ کی خواہاں ہیں، خطرات و پریشانیوں کی متمنی ہیں، سختی اور تقشّف کی آرزو مند ہیں، یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ وہ ان نعمتوں کی فراوانی سے اکتا گئی ہیں۔ اور گمراہ کن پروپیگنڈوں، سیاسی و اجتماعی اور خارجی عوامل کے اثر سے وہ تنگی اور فقر و فاقہ کی زندگی کی طرف آنا چاہتی ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن مجید نے اس واقعہ کو ریکارڈ رکھا ہے۔ تاریخ کا ریکارڈ اس سے خالی ہے۔ اس لئے قرآن مجید کا راستہ تاریخ کے مقابلہ میں کچھ اور ہی ہے۔ تاریخ ان قصوں کا ریکارڈ رکھتی ہے جن کا تعلق سرکار دربار سے ہو، وزرائے سلطنت اور ایوانِ حکومت سے ہو اور جنگوں سے ہو، انسانیت کی فلاح و بہبود کے واقعات اور ایسی حکایات جن سے عبرت ہو، سبق اور نصیحت ہو، وہ تاریخ کے موضوع سے خارج ہیں۔

قرآن کا معاملہ اس کے برعکس ہے قوموں کا نشیب و فراز، حکومتوں کا ردو بدل اور فتوحات کی کثرت اس کا موضوع نہیں، قرآن بشری امراض یعنی فطرت انسانی کمزوریوں سے بحث کرتا ہے، جس میں عبرت ہو، ہر جگہ، ہر دور اور ہر زمانہ میں انسان کے لئے جس میں سبق ہو۔(۱)

---

(۱) ا۔ کاروانِ زندگی حصہ سوم ص ۱۴۱۔ ۴۳ ۲۔ نفحات الایمان بین صنعاء عمان (عربی سے ترجمہ مربی محترم مولانا سید عبداللہ محمد الحسنی صاحب ندوی۔ (غیر مطبوعہ)

حیات بعد الموت کی وسعت

اَوْكَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا، قَالَ اَنّٰى يُحْىٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا، فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَه، قَالَ كَمْ لَبِثْتَ، قَالَ لَبِثْتُ يَوْماً اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ، قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ، وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْماً، فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ.

(البقرہ:۲۵۹)

کیا تو نے اس شخص کو نہ دیکھا جس کا گذر ایک شہر پر ہوا جو اپنی چھتوں پر گر پڑا تھا، اس نے کہا کہ مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو کیسے زندہ کرے گا پھر اللہ نے اس شخص کو سو سال تک مردہ رکھا، پھر اٹھایا (اور اس سے) کہا کہ تو کتنی دیر یہاں رہا اس نے کہا کہ ایک دن یا ایک دن سے کم رہا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ تو سو برس رہا، اب اپنا کھانا اور پینا دیکھ (جو اب تک) سڑا نہیں ہے، اور اپنے گدھے کو دیکھ اور ہم نے تم کو لوگوں کے لئے نمونہ بنانا چاہا، اور ہڈیوں کو دیکھ کہ ہم ان کو کس طرح ابھار کر جوڑ دیتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھا دیتے ہیں، پھر جب اس پر یہ حال ظاہر ہوا تو کہہ اٹھا کہ مجھ کو معلوم ہے کہ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

قرآن حکیم میں اپنے محدود و ناقص غور و فکر اور ناکافی تحقیق و مطالعہ کی روشنی اور تلاوت قرآن کرنے والے ہر مسلمان کو قرآن فہمی کی جو توفیق ملتی ہے اس کے پیش

نظر میرا عقیدہ ہے کہ قرآن کریم کی یہ آیات اپنے اندر اس سے کہیں زیادہ گہری معنویت، وسیع مفاہیم و مطالب اور دور رس امکانات و مضمرات رکھتی ہیں، جتنی کہ مفسرین کرام اپنے اپنے زمانوں میں ان کو پیش کر سکے ہیں۔ اور جتنا کہ اہل علم نے اپنے حالات اور تحقیقات کی روشنی میں سمجھا ہے۔

میں قرآن مجید کا طالب علم ہوں اور اس کے معانی اور اشاروں کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ مذکورہ بالا آیت میں اگرچہ ایک معین واقعہ بتایا گیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت دکھائی کہ کھانا جو چند گھنٹے ہی کھلی فضا میں رہنے پر خراب اور بگڑ جاتا ہے، سو سال رکھا رہا، اور خراب نہیں ہوا، میرے خیال میں یہاں صرف جسمانی و مادی زندگی کی واپسی ہی کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس میں معنوی وروحانی زندگی، باطنی نشاۃ ثانیہ اور اس تاریخی کردار کی واپسی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جسے کسی امت و معاشرہ یا قوم و ملک نے انجام دیا ہے اور اس پیغام کی تازہ کاری اور حیات آفرینی کی طرف بھی لطیف اشارہ ہے۔ جس کی یہ امت حامل تھی، اسی طرح اس میں اس پختہ ایمان و عقیدہ کے احیاء کا امکان بھی ظاہر کیا گیا ہے جو کبھی اس امت کی رگ وپے میں گرم لہو کی طرح دوڑ رہا تھا۔ اور جو پھر سرد پڑ گیا، اور اس فتح و ظفر کی بازگشت کی طرف بھی اشارہ موجود ہے جو کبھی اس مسلمان ملک و قوم کو حاصل تھی۔ تو گویا اس واقعہ کے اندر ایک گہرا اشارہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین و پیغام کو بھی کبھی کبھی سو سال تک مردہ ہو جانے کے بعد اور اس قوم کے اس کے ساتھ ربط و تعلق اور حمیت وحمایت کے طویل عرصہ تک کمزور ہو جانے کے بعد

دوبارہ دونوں کو حیات و تازگی دے سکتا ہے اور دیتا ہے، جب کھانا ایسی معمولی چیز کو سو سال تک بغیر بگڑے قائم رکھ سکتا ہے تو اپنے دین کو سو سال کی ناسازگار حالات رکھنے والی مدت گذرنے پر صحیح اور تر و تازہ رکھ سکتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ آیت کریمہ ان سب پہلوؤں پر مشتمل ہے اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس ملک کی قسمت پر مہر لگ چکی ہے اور اس کے لئے خدانخواستہ یہ دائمی فیصلہ ہو چکا ہے کہ وہ غیر اسلامی زندگی گذارتا رہے گا۔ (اشارہ استنبول و ترکی کی طرف ہے کہ اسی ملک میں خطاب فرمارہے ہیں) اور ہمیشہ جاہلیت کی پستی میں پڑا رہے گا۔

پھر اللہ تعالیٰ اشارہ و لطیفہ غیبی کے طور پر فرماتے ہیں "اُنْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّه" کہ "اپنے کھانے پینے کے سامان کو دیکھو کہ وہ خراب نہیں ہوا" اور جب ایک زمانہ گذرنے کے باوجود کھانا اور پانی خراب نہیں ہو سکتے تو وہ آسمانی و ربانی، ابدی و آفاقی پیغامات کس طرح خراب اور از کار رفتہ ہو سکتے ہیں جن پر حیاتِ انسانی کا دار و مدار، انسانیت کا انحصار ہے اور جن سے اس کا وقار و اعتبار قائم ہے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَؤُفٌ الرَّحِيْم.
(بقرہ: ۱۴۳)

اور اللہ تعالیٰ ایسے نہیں ہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع کردیں، واقعی اللہ تعالیٰ تو لوگوں پر بہت ہی شفیق مہربان ہیں۔

ہمارے دلوں میں امید و آرزو کو زندہ کرتی ہے

یہ آیت شریفہ ہمارے دلوں میں امید و آرزو کو زندہ کرتی ہے اور ہمارا اعتماد بحال کرتی ہے اور ہمارے سرد جذبات، ناکام امیدوں اور تمناؤں کو از سرِ نو پیدا کرتی ہے۔اور قیاس آرائیوں اور بدشگونیوں کو دور کرتی ہے۔ کیونکہ جب اللہ کی قدرت سے خورد ونوش کا سامان عرصہ دراز تک خراب نہیں ہو سکتا اور یہ عمارت و محلات شاہی گردش ولیل ونہار کے برخلاف عرصے تک قائم رہ سکتے ہیں۔ تو یہ قوم اسلام کے ساتھ کیوں نہیں قائم رہ سکتی؟ جو ان تعمیرات و محلات اور ان تمدنی مظاہر و مآثر کے مقابلہ میں کہیں زیادہ طاقتور و بااثر، انسانیت کے لئے نافع و مفید اور صالح و صحیح، انسانی زندگی کے لئے ضروری و ناگزیر ہے۔

میرے نزدیک قرآن مجید کی یہ آیت ہم کو یہ بشارت سناتی ہے کہ وہ قوم اور ملک (جس نے مغرب کی چھاتی پر صدیوں کو دودلی ہے اور اسلام کا جھنڈا بلند رکھا) پھر زندہ و تابندہ ہو جائے گا۔

"تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ." (آل عمران: ۲۷)۔(۱)

---

(۱) ۱۔ کاروان زندگی حصہ چہارم ص ۱۶۷-۱۶۹

۲۔ تعمیر حیات ۱۰/۶/۱۹۸۱ء سے مشترک ماخوذ ہے۔

آئندہ نسلوں اور پسماندگان کے صحیح العقیدہ مسلمان رہنے کی ضمانت

اور

جیتے جی اس کا اطمینان ویقین ضروری ہے

"اَمْ کُنْتُمْ شُھَدَاءَ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْت، اِذْ قَالَ لِبَنِیْہِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ، قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰھَکَ وَاِلٰہَ آبَائِکَ اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْمَاعِیْلَ وَاِسْحَاقَ اِلٰھاً وَّاحِداً وَّنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ."

"بھلا جس وقت یعقوب وفات پانے لگے تو تم اس وقت موجود تھے، جب انھوں نے اپنے بیٹے سے پوچھا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ تو انھوں نے کہا کہ آپ معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے اور ہم اسی کے حکم بردار ہیں۔" (البقرہ: ۱۳۳)

ایک پیغمبر کے انتقال کے وقت کا واقعہ

قرآن مجید کی یہ آیت جو پہلے ہی پارے کی آیت ہے اور اس کا ترجمہ عام طور پر قرآن مجید کے ترجمے میں موجود ہے، خدا کے فضل سے، اللہ تعالیٰ مترجمین کو جزائے

خیر دے وہ ان ترجموں کے ذریعے سے پڑھتے ہیں اور جو براہِ راست عربی زبان سے واقف ہیں وہ خود ان کو پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ لیکن بہت کم غور کرنے کی نوبت آئی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اس اہتمام کے ساتھ اگر یہ لفظ غیر شایان شان اور بے ادبی کے نہ ہوں تو میں کہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کو بیان کرنے کو کیوں ترجیح عطا فرمائی اور اللہ تعالیٰ جس کی شان یہ ہے کہ جو چیز بھی اس سے نسبت رکھتی ہے وہ ضروری ہے، معنوی ہے، مناسب حال ہے، مناسب وقت ہے اور فطرت کا تقاضا ہے، اس میں اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جاسکتا ہے اور بہت سے خطروں سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص غور نہ کرے تو کہے گا کہ ایک پیغمبر کے انتقال کے وقت کا واقعہ بیان کیا جارہا ہے، اس کی قانونی، علمی، تاریخی، تہذیبی اور معنوی طور پر کیا اہمیت ہے؟ لیکن اللہ تعالیٰ جس چیز کا انتخاب فرمائے اور اپنے اس کلام میں جس کو قیامت تک باقی رہنا ہے اور دنیا کے تمام کلمہ گو انسانوں کو ہی نہیں بلکہ جن کو اللہ تعالیٰ توفیق دے۔ باتوفیق انسان کو پڑھنا ہے، بار بار پڑھنا ہے تو اللہ تعالیٰ انہی چیزوں کا ذکر فرمائے گا جن میں غور کرنے کا مواد ہے، غور کرنے کا سامان ہے اور جن میں ہزاروں عبرتیں اور حکمتیں ہیں، دنیا میں سبھی دنیا سے جاتے ہیں سب جانیوالے ہیں، جن کی جتنی بھی زندگی ہے بہر حال اسے اس دنیا کو الوداع کہنا ہے، پیغمبروں کے لئے بھی یہی ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ: حضورؐ کا نام لیکر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ محمدؐ کون ہیں؟ اللہ کے رسول ہیں **قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ** آپ سے

پہلے جو پیغمبر تھے وہ دنیا سے چلے گئے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کو بھی ایک مرتبہ دنیا کو الوداع کہنا ہے۔ اور رخصت ہونا ہے اور اس مقام قرب میں جانا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے مقدر اور مختص فرمادیا ہے کہ اللہ کے ایک پیغمبر کے انتقال کا ایک واقعہ اس کو قیامت تک کے لئے کیوں دوام اور عمومیت بخشی جارہی ہے اور اس کو قابل توجہ قرار دیا گیا ہے، یہ سوچنے کی بات ہے مگر بہت سی چیزیں جو بہت آسان معلوم ہوتی ہیں اور ان میں کوئی ایسی عقدہ کشائی نہیں ہوتی تو ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے، ہم میں سے اکثر لوگوں کا معاملہ بھی یہی ہے کہ ہم نے غور نہیں کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس واقعہ کو کیوں بیان فرمارہا ہے۔

وصیت نامہ

مسلمانوں کو خطاب کرکے قرآن مجید کے پڑھنے والوں کو خطاب کرکے (اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ) "اَمْ کُنْتُمْ شُھَدَاءَ اِذْ حَضَرَ الْمَوْتُ" کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کا آخری وقت آیا۔ یہ قرآن مجید کا طریقہ بیان اور خاص اسلوب ہے جب کسی چیز کو مستحضر کرنا اور اسے آنکھوں کے سامنے لانا چاہتا ہے تاکہ وہ مشاہدہ بن جائے تو اس طرح خطاب فرماتا ہے کہ تم اس وقت تھے جب یعقوبؑ کا آخری وقت آیا، ان کا دمِ واپسیں تھا۔ اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ. جبکہ انھوں نے اپنے لڑکوں سے کہا کہ تم مجھے یہ بتادو کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کروں گے۔

اب یہیں سے آپ سوچئے کہ معاملہ ہے حضرت یعقوبؑ کا اور یعقوبؑ کون ہیں ؟ یعقوبؑ ابن اسحاقؑ ابن ابراہیمؑ نبی کے بیٹے اور نبی کے بھتیجے حضرت اسماعیلؑ کے بھتیجے اور حضرت اسحاقؑ کے بیٹے ہیں۔ یعقوب ابن اسحاقؑ ابن ابراہیمؑ اور ان کے والد نبی ہیں، ان کے چچا نبی ہیں، ان کے دادا نبی ہیں اور وہ کیسے نبی ہیں۔ ابراہیم خلیل اللہ جن کو اللہ اپنا دوست کہتا ہے۔ ابراہیم خلیل اللہ کے پوتے ہیں۔ اسماعیلؑ جو سید الانبیاء سید المرسلین رسول اللہ ﷺ کے جد امجد ہیں ان کے بھتیجے ہیں اور خود پیغمبر ہیں اور خود پیغمبر کے باپ بھی ہیں اور پیغمبر کی اولاد بھی ہیں، یوسفؑ خدا کے پیغمبر ہیں ان کے صاحبزادے ہیں، کیا ماحول ہے اس گھر کا۔ اس کا آپ ذرا خیال کیجئے کسی عالم کے، کسی شیخ وقت، کسی مصلح یہاں تک کہ کسی واعظ کے، کسی پڑھے لکھے مسلمان کے متعلق بھی یہ خیال نہیں ہو تا کہ وہ اپنے انتقال کے وقت یہ بات پوچھے گا۔ اللہ تعالیٰ کا نام ان کو سکھلایا گیا ہے، کلمہ پڑھتے ہیں، اپنے کو مسلمان کہتے ہیں، سب کے نام مسلمان کے سے ہیں اور پھر اس میں جو لوگ بلوغ کو پہنچ گئے ہیں یا اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے، گھروں کے ماحول پر دینی فضا چھائی ہوئی ہے، وہ مسجدوں میں جاتے ہیں نماز پڑھتے ہیں اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنے ماں باپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اپنے گھر میں اللہ اور رسول ہی کا ذکر سنتے ہیں تو ان سے اس کے پوچھنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ پوچھنے کی باتیں بہت ہیں اور سب جانتے ہیں اگر دنیا میں وصیت ناموں ہی کو جمع کیا جائے تو ایک بہت بڑا کتب خانہ تیار ہو جائے، تاریخ اور ادبیات اور انسانی ضروریات اور انسانی تقاضوں کا ایک بہت بڑا مرقع سامنے آجائے یہ کام اگر کسی کو

فرصت ہو تو یہ کر سکتا ہے کہ کتابوں میں مو قر طبقہ کے لوگوں کی جو وصیتیں درج ہیں ان کو جمع کر دے۔ علماء مشائخ و مصلحین اور داعیوں، والیان ریاست اور اہل حکومت کی وصیتوں کو یکجا جمع کرے تو انسانی احساسات اور انسانی عقل و دانائی کا اور اپنی اولاد سے، ورثاء سے تعلق کا ایک ایسا نقشہ سامنے آجائے کہ اس سے نفسیات انسانی کے بڑے عجائبات کے انکشافات سامنے آجائیں اور معلوم ہو کہ انسان میں قدر مشترک کتنا ہے، ان کی وصیت اکثر نہیں سینکڑوں نہیں ہزاروں نہیں لاکھوں انسانوں نے کی۔ یہی دیکھے گا بچوں کو جمع کیا اور کہا کہ دیکھو سب سے زیادہ جو کان میں پڑی ہے اور کتابوں میں دیکھی ہوئی ہے کہ جانے والے باپ نے، صبر کرنیوالے باپ نے جو دنیا سے رخصت ہونے والا ہے اور پابہ رکاب ہے اس نے اپنے بچوں کو جمع کیا۔ سب شریف زادے، سب اچھے خاندان کے لوگ اور ان میں کئی پڑھے لکھے اور ان میں کئی تربیت یافتہ، ان سے عام طور پر ہم نے جو کتابوں میں دیکھا وہ یہ کہ ان سے کہدو کہ بیٹو لڑنا نہیں، اتحاد کے اور شرافت کے ساتھ رہنا یا یہ ملتا ہے کہ دیکھو بیٹو، فلاں جگہ میں نے رقم دبا رکھی تمہارے لئے، ابھی تک بتایا نہیں تھا، فلاں جگہ تم کھودنا تم کو وہاں خزانہ ملے گا۔ وہاں دفینہ ہے یا یہ کہا کہ دیکھو ہمارا اتنا قرض دوسروں پر آتا ہے لکھ لو اس کو، فلاں فلاں آدمیوں کے ذمہ ہماری اتنی اتنی رقم ہے اس کو وصول کر لینا اور یہ دستاویز ہے، ان کا اقرار نامہ یہ دکھانا یا بہت زیادہ اگر احتیاط اور تقویٰ ہوا ہو تو یہ کہا کہ دیکھو بیٹو۔ میرے بچو اور میری آنکھوں کے تارو! اور پیارو! مجھ پر تمہارے باپ پر اتنے لوگوں کا مطالبہ ہے، قرض ہے، اور اس کو بھولنا نہیں، جن کو بہت خدا کا ڈر ہے متقی

لوگ ہیں وہ یہ کہتے ہیں، یہ کس طرح کی وصیت ہے سوچئے آپ ذرا سا اپنے ذہن کو حاضر کر کے اور اس وقت کو سامنے لا کر۔ یہ ہیں کون جن سے بات ہو رہی ہے؟ یہ نبی زادے ہیں، ولی زادے نہیں! ولی زادے بڑی چیز سمجھے جاتے ہیں، بزرگ زادے بڑی چیز سمجھے جاتے ہیں، عالم زادے بڑی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ تو اس پر ہمارا ایمان ہونا چاہئے اگر ہمارا ایمان اس پر نہیں تو ہمارا ایمان ناقص ہے۔ کہ پیغمبر زادے ہیں ان سے بڑھ کر اس وقت نوع انسانی میں کسی کو نہیں کہا جا سکتا ہے اور پوری روئے زمین پر ان سے بڑھ کر قابل احترام، قابل محبت اور قابل اعتماد کوئی اور انسانی مجموعہ نہیں ہو سکتا۔ نبی کے بیٹے کے بھتیجے، نبی کی پوتے سب کے سب ہیں۔

اور انھوں نے اپنے گھروں میں دیکھا کیا ہے۔ اپنے گھروں میں دیکھا ہے کہ نمازیں ہو رہی ہیں، اللہ تعالیٰ کا نام لیا جا رہا ہے، ذکر ہو رہا ہے، دعاؤں میں رویا جا رہا ہے، اپنی ماؤں کو دیکھا انھوں نے کہ بڑے گڑگڑا کر اپنے لئے، ان کے لئے دعائیں کر رہی ہیں اور ان گھروں میں خدا کے نام کے سوا کوئی نام نہیں لیا گیا۔ سنا ہی نہیں انھوں نے کہ دنیا میں کوئی اور بھی ہے اور اس کائنات پر اثر رکھتا ہے اور وہ نفع وضرر کا مالک ہے اور اس سے کچھ مانگا جا سکتا ہے، کچھ اس سے امیدیں کی جا سکتی ہیں توحید کے سوا کوئی عقیدہ، نماز روزہ کے سوا کوئی عبادت اور اللہ کے خوف و محبت کے سوا انھوں نے کوئی دعوت سنی ہی نہیں! لیکن کیا بات ہے۔

عشق است و ہزار بدگمانی

سارا معاملہ اہمیت کے احساس کا ہے

جب یقین ہوتا ہے، آدمی کو اہمیت ہوتی ہے کسی چیز کی تو وہ پھر معقولات اور عقلی چیزوں اور مفروضات اور قیاسات پر عمل نہیں کرتا، یہی فرق ہے اگر آدمی بیمار ہے واقعی بیمار ہے تو وہ ساری احتیاطیں اٹھ جاتی ہیں، کتنا ہی وہ غیور ہو اور کتنا ہی وہ خوددار ہو، کتنا ہی وہ ضابط ہو، کتنا ہی صابر اور متحمل ہو، وہ کہہ دیتا ہے، اپنے لڑکوں سے اپنے عزیزوں سے کہ ہمیں یہ تکلیف ہے، ڈاکٹر کو بلالو، حکیم کو دکھاؤ، اسی طریقے سے اگر کوئی بھوکا ہوتا ہے واقعی اگر بھوک ہے تو پھر وہاں پر غیرت نہیں چلتی کہ ہم کس منہ سے کہیں کہ کھانا لاؤ، کھانے کا وقت ہو گیا ہے، بڑے بڑے امیر زادے امیر اور نواب زادے اور والیان ریاست اور حکماء اور جوان سب چیزوں سے بالاتر سمجھے جاتے ہیں وہ بھی ایسے موقع پر اپنی بھوک کا احساس ظاہر کر دیتے ہیں تو سارا معاملہ اہمیت کے احساس کا ہے تو بتائیے کہ حضرت یعقوبؑ نے کیوں اپنے لڑکوں کو جمع کیا اور کیا ان سے پوچھا؟

آخری وقت اور تھوڑا ہی وقت ہے۔ بات کرنے کا۔ اس کو اس دنیا سے جانے والے خود بھی سمجھتے ہیں اور وہ خدا کا پیغمبر جو مُلْهَمْ مِنَ اللهِ ہوتا ہے، جس پر وحی نازل ہوتی ہے، اس کو کیوں نہ اس احساس ہوگا کہ بس اب چند ہی منٹ کے بعد دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں، ان بیٹوں، پوتوں کو بلا کر ان سے بات کرنے کی، بات کیا ہو سکتی تھی؟ تو ہماری سمجھ میں تو یہی آتی ہے اور یہ ہم نے دیکھا کہ کتابوں میں وصیت ناموں میں جانے والے کے گفتگو کے ریکارڈ اگر ہوں تو ریکارڈ، ورنہ جن لوگوں نے

دیکھا ہے جن کو اتفاق ہوا ہے سب جانتے ہیں کہ یہی کہا گیا ہے کہ دیکھو بھائی مل جل کر رہنا، صلح و آشتی کے سلیقے اور تہذیب کے ساتھ رہنا، اپنی ماں کا حق جو میں چھوڑ کر جا رہا ہوں خیال رکھنا، عزیزوں کا خیال رکھنا، صلہ رحمی کا خیال رکھنا ہے۔

ہزاروں برس سینکڑوں برس سے یہ دور چل رہا ہے کہ ایسے موقع پر ان باتوں کا اطمینان حاصل کیا جاتا ہے لیکن کیا بات ہے، بات یہی ہے کہ جو دل سے لگی ہوتی ہے جس کی اہمیت ہوتی ہے اور جس کو آدمی فیصلہ کن سمجھتا ہے، جس کو سمجھتا ہے کہ یہ چیز دائمی سعادت یا دائمی شقاوت کا سبب ہے، اس کی طرف پہلے توجہ کرتا ہے، سارا معاملہ کسی چیز کے انتخاب میں اہمیت کے احساس کا ہے۔

اپنے بچوں کے دین و ایمان کی حفاظت، دین و ایمان کی معرفت اور پھر اس کی حفاظت اور پھر اس پر غیرت اور پھر اس پر زندگی گذارنے اور اس پر دنیا سے رخصت ہونے کے کام کو۔ سب سے زیادہ اہمیت دیں اس کے لئے اس سے بہتر واقعہ نہیں ہو سکتا جو میں نے آپ کو سنایا۔ یعقوبؑ نے اپنے بچوں کو ان کے پوتے بھی ہوں گے اس لئے کہ بڑی عمر میں ان کا انتقال ہوا ہو گا اور اس زمانے میں بھی لمبی عمریں ہوتی تھیں، گھر بھرا ہو گا اس میں بیٹے، پوتے، نواسے بھانجے اور بھتیجے ان سب کو شامل سمجھئے عربی کا لفظ لِبَنِيهِ جو ہے ان سب پر مشتمل ہے۔ تو "اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ" کیا اے قرآن کے پڑھنے والو! کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کا آخری وقت آیا اور موت سامنے آکر کھڑی ہو گئی، گویا بالکل دم واپسیں تھا۔ (اِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ؟) انھوں نے اپنے بچوں سے کہا کہ بیٹو! میرے

جگر کے ٹکڑو! لخت ہائے جگر! نور نظر! یہ بتادو ایک بات میں سننا چاہتا ہوں، ایک بات کا اطمینان لیکر دنیا سے جانا چاہتا ہوں، کوئی بات قرآن میں اس کے علاوہ کہی نہیں گئی اور ان کی تاریخ میں اور سیرت میں بھی نہیں ملے گی اور صحف سماوی میں بھی نہیں ملے گی کہ انھوں نے اس وقت جب بالکل یہ سمجھئے کہ چند سانسوں کا معاملہ تھا، کتنی سانسیں اور باقی ہیں "مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ" کہ تم میرے بعد عبادت کس کی کرو گے؟ سر کس کے سامنے جھکاؤ گے۔

میں آپ سے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ گویا بالکل دیکھ رہا ہوں اور سن رہا ہوں کہ دنیا میں یہ بات کوئی شخص بھی کہیں کہے گا اور یعقوب نے یہ بات کہی، تو قرآن مجید نے اس کا ذکر نہیں کیا تو اس میں بڑی حکمتیں ہیں اس کے جواب میں پہلے انھوں نے یہ کہا ہوگا لیکن غیرت توحید نے اور نبوت کے شرف اور اعزاز نے اس کی وجہ سے اس کا محل نہیں تھا کہ کوئی بیچ میں بات اور آتی، اللہ تعالیٰ نے فوراً ان کا جواب نقل کر دیا یعنی خدا کی خود سے جو توحید کی وحدانیت ہے اس نے گوارہ نہیں کیا کہ ان کے سوال ان کے جواب کے درمیان کوئی اور بات آجائے مگر میں قیاساً کہتا ہوں کہ بالکل ممکن ہے کہ انھوں نے یہ کہا ہوگا کہ ابا جان دادا جان نانا جان! یہ بھی پوچھنے کی بات ہے، آپ نے ہمیں سکھایا کیا تھا اور ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کیا اور اس کے گھر میں ہوتا کیا ہے اور ہم کس کی اولاد ہیں۔ ہماری رگوں میں کس کا خون ہے۔ ارے ہم سے آپ پوچھ رہے ہیں یہ تو کہیں کافر قبیلے سے پوچھا جائے اور ہم کون ہیں، ہم آپ کے پروردہ آپ ہی کے جگر کے ٹکڑے آپ ہی کے جسموں کے ٹکڑے ہیں اور

ہمارے متعلق تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے کہا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی غیرت توحید نے اتنا فصل بھی گوارہ نہ کیا کہ ان سوال وجواب کے درمیان فوراً نقل کر دیا "نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ آبَائِكَ. (۱)

یہی ہر مسلمان کی شان ہونی چاہئے

انھوں نے کہا کہ ابا جان! دادا جان! نانا جان، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے یہ بھی کوئی ڈرانے کی بات ہے، ہماری رگوں میں ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، کا خون ہے، آپ نے ہمیں شرک سے نفرت دلائی، کفر سے نفرت دلائی، ہم مر جانا گوارہ کریں گے، لیکن کفر وشرک میں مبتلا ہونا پسند نہیں کریں گے، آپ اطمینان سے دنیا سے جایئے۔ "نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ آبَائِكَ" ہم آپ کے معبود کی پرستش کریں گے، آپ کے بزرگوں، آپ کے پرکھوں، آپ کے باپ، چچا، دادا کے معبود (اللہ) کی ہم پرستش کریں گے۔ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ آبَائِكَ اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمَاعِيْلَ وَاِسْحَاقَ اِلٰهًا وَّاحِداً وَّنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ." ہم سب اس کے فرماں بردار ہیں، تب ان کو اطمینان ہوا۔

یہی ہر مسلمان کی شان ہونی چاہئے، اپنے متعلق بھی ہمیشہ ڈرتا رہے، اپنے ایمان کی خیر مناتا رہے، اسی لئے دعا کرتا رہے کہ ہمارا ایمان سلامت رہے، ہمارا خاتمہ ایمان پر ہو، اور اپنی اولاد کے متعلق بھی اطمینان حاصل کرلے یہ ہماری زندگی میں بھی اور ہمارے بعد بھی اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کے آستانہ پر سر نہیں جھکائے گی، یہ اطمینان، یہ گارنٹی (GUARANTEE) سب سے زیادہ ضروری ہے، یہ گارنٹی آدمی کو

(۱) تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵ /اگست ۱۹۹۴ء

حاصل کر لینی چاہئے، ایمان کے ساتھ کفر اور کفر کی چیزوں سے نفرت بھی ضروری ہے۔ "فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ" اللہ تعالیٰ اس کو مقدم رکھتا ہے کہ جو سرکش شیطان کا انکار کرے گا اور اسکو ٹھکرا دے گا، (REJECT) کر دے گا اور اللہ پر ایمان لائے گا، تو اس نے اللہ کے کڑے کو مضبوط پکڑ لیا تو "فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ" بھی ضروری ہے اور "لا الٰہ الا اللہ" میں نفی پہلے ہے، اثبات بعد میں ہے، نہیں ہے کوئی معبود، نہیں ہے، وہ جو پورے طور پر محبوب بنایا جائے، مقصود بنایا جائے، مطلوب بنایا جائے، معبود بنایا جائے "الا اللہ" پہلے نفی ہے، پھر اثبات ہے، ایسے ہی نفی واثبات پر ہم کو بھی قائم رہنا چاہئے۔ (۱)

یہ ہے مسلمانوں کے ذہنوں کو ڈھالنے والا سانچہ، ایمان کی قیمت پہچاننے کا امتحان و معیار، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس واقعہ کا ذکر کر کے اس کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا کہ ہر نسل کا مسلمان بلکہ ہر نسل کا انسان پڑھے اور اس سے سبق لے، اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو بیان کر کے تاریخ نہیں سنائی ہے، قرآن تاریخ کی کتاب نہیں ہے، تاریخ ہے لیکن وہ تاریخ کیلئے نہیں، یہاں پر ہمیں بتایا کہ اس طرح مسلمان کے ذہن کو کام کرنا چاہئے۔ (۲)

---

(۱) تحفہ مشرق ص ۴۸ تا ص ۵۰۔ (۲) آئندہ نسلوں کے ایمان کی حفاظت ص ۲۱۔ ۲۲

نہ خدا ہی ملا......نہ وصالِ صنم

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُاللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ. فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اِطْمَاَنَّ بِهٖ. وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَالدُّنْيَا وَالاٰخِرَةِ. ذٰلِكَ هُوَالْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ.

(سورۃ الحج۔۱۱)

اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کنارے پر (کھڑے) ہو کر خدا کی عبادت کرتے ہیں اگر ان کو کوئی دنیاوی فائدہ پہنچے تو اسکے سبب مطمئن ہو جائیں، اور اگر کوئی آفت پڑے تو منہ کے بل لوٹ جائیں (یعنی پھر کافر ہو جائیں) انھوں نے دنیا میں بھی نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی، یہی تو نقصان صریح ہے۔

یہ قرآن مجید کے اعجاز اور اس کی تصویر کشی کا اعلیٰ نمونہ ہے، یہ آیت کیا ہے؟ ایک مستقل معجزہ، یہ فرد کی بھی تصویر ہے اور جماعتوں کی بھی، قوموں اور ملتوں کی بھی، عربی میں ”من“ کا اطلاق فرد اور جماعت سب پر ہوتا ہے، لوگوں میں سے ایسے لوگ بھی ہیں، جو خدا کی بندگی کرتے ہیں بالکل کنارے پر کھڑے ہو کر...... ”بندگی کرتے ہیں“ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ خالی نماز پڑھتے ہیں، اور عبادت کرتے ہیں، اس کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ خدا کی فرمانبرداری اور اسلامی احکام کی پابندی عین سرحدی لکیر پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں، جو اسلام و جاہلیت اور کفر و ایمان کے

درمیان کھینچی گئی ہے، "علی حرف" کی بلاغت ملاحظہ ہو، اس صورت حال کی اگر کیمرے سے بھی تصویر لی جائے اور بڑے سے بڑا مصور اور نقاش بھی اس کی تصویر کشی کرے تو ایسی بولتی ہوئی تصویر نہیں کھینچ سکتا، ان کی دوربینی اور احتیاط کی پوری تصویر اس چھوٹے سے جملے میں آگئی، وہ ایسی جگہ کھڑے ہوتے ہیں، جہاں سے ان کے لئے دوسرے محاذ پر منتقل ہو جانا، ایک منطقہ سے دوسرے منطقہ پر پہونچ جانا ہر وقت ممکن رہے اور اس میں ذرا بھی دیر نہ لگے، وہ جما کر پاؤں بھی نہیں رکھتے کہ اٹھانے میں کچھ دیر لگے۔ وہ پھول کی طرح پاؤں رکھتے ہیں کہ ہوا کے ایک جھونکے میں اور حالات میں ادنیٰ سی تبدیلی واقع ہونے پر وہ دوسری جگہ کھڑے نظر آئیں، ان کا ہاتھ زمانے کی نبض پر رہتا ہے، اور ان کی دوربین نگاہیں حکومت، سوسائٹی اور وقت کے اقتدار کے چشم وابرو کے اشارے کو دیکھتی رہتی ہیں، ان کا دماغ سود وزیاں اور نفع و نقصان کے موازنے سے ایک لمحہ کے لئے غافل نہیں ہوتا۔

اگر زمانہ ان کے موقف و مسلک اور ان کے مقام و محل کے مطابق ہوتا ہے تو ان سے بڑھ کر اپنے مسلک کا پرجوش وکیل اور اس کی خدمت میں منہمک کوئی نظر نہیں آتا اور وہ پورے سکون قلب اور اعتماد نفس کے ساتھ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔

"فَاِنْ اَصَابَهُ خَيْرُ نِ اطْمَاَنَّ بِهِ"

اور اگر حالات ذرا بھی ناسازگار ہوتے ہیں، اور وہ حکومت کے، سوسائٹی اور عوام کے تیور بدلے ہوئے دیکھتے ہیں تو وہ فوراً اپنا مسلک تبدیل کر دیتے ہیں، اور اپنے مسلک کی "تہمت" سے بھی بچتے ہیں۔ ان کو اپنی وضع قطع، اپنے عقائد و خیالات اپنی

تہذیب و معاشرت اور اپنی زبان و کلچر بلکہ اپنی قومیت کو بھی تبدیل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

اس ابن الوقت گروہ کو دیکھ کر یہ آیت جس طرح سمجھ میں آتی ہے اور اس کی بلاغت و اعجاز جس طرح نمایاں ہوتا ہے، وہ بڑی سی بڑی تفسیر سے اس طرح نمایاں نہیں ہوتا، خطرے اور شبہہ سے بچنے کے لئے اس ابن الوقت گروہ کے انتظامات اور اس کی احتیاط دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، جب شعائر اسلامی کے اظہار سے کوئی مادی فائدہ حاصل ہوتا ہے یا وہ دولت و وجاہت کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے، یا حکومت و اقتدار اس کے بغیر نہیں مل سکتا تو شعائر اسلامی کا ان سے زیادہ اظہار کرنے والا کوئی نہیں، اور اگر ان کے اظہار میں ادنیٰ درجہ کا خطرہ متصور ہوتا ہے، یا اس کی وجہ سے کم سے کم ادنیٰ درجہ کی قربانی دینی پڑتی ہے، تو پھر ان شعائر اسلامی کو بلکہ بنیادی عقائد تک کو وہ سلام کرتے ہیں، اور ان سے اپنا رشتہ ناطہ توڑ لیتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ آمَنَّا بِاللّٰهِ فَإِذَآ أُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ. وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ أَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعَالَمِيْنَ. (سورہ عنکبوت۔۱۱)

اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا پر ایمان لے آئے، جب ان کو خدا کے راستے میں کوئی ایذا پہونچتی ہے تو لوگوں کی ایذا کو یوں سمجھتے ہیں، جیسے خدا کا عذاب، اور اگر تمہارے پروردگار کی طرف سے مدد پہونچے تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے، کیا جو اہل عالم کے سینے میں ہے، خدا اس سے واقف نہیں؟

اگر وہ نسبت سرخروئی اور سرفرازی کا باعث ہوتی ہے، تو اپنی قدیم تاریخ، اپنے

اسلاف اور اپنے دور ماضی کو یاد دلاتے ہیں، اور کہیں نہ کہیں سے وہ اپنا تعلق نکال لیتے ہیں۔ "وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ" لیکن اللہ تعالیٰ کو حقیقت حال معلوم ہے۔ "اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعَالَمِيْنَ". ع

اس طور پر ان زمانہ سازوں کا انجام برا ہوتا ہے، اور کسی گروہ میں ان کی وقعت نہیں ہوتی اسی لئے فرمایا گیا ہے۔ "خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ". شاعر نے شاید اسی موقعہ کے لئے کہا ہے۔ ع

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم

نہ اِدھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

جب حالات سازگار ہوں اور ہوا موافق چل رہی ہو، جب کسی مسلک پر قائم رہنے پر انعام ملتا ہو اور پھول برسائے جاتے ہوں، جب کسی قوم و جماعت کا ستارۂ اقبال بلند ہو اور اس کا بخت یاور، جب کسی جماعت میں شرکت باعث اعزاز ہو اور سرمایۂ افتخار، تو اس وقت اس مسلک پر قائم رہنا اور اس عقیدے کا اظہار کرنا کوئی بہادری اور مردانگی نہیں، لیکن جب حالات ناسازگار ہوں اور باد مخالف تیز و تند چل رہی ہو، جب بڑے بڑے جوانمردوں کے قدم اکھڑ رہے ہوں، جب کسی اصول اور عقیدے کو اختیار کرنا دار و رسن کو دعوت دینے کے مرادف ہو، جب کسی قوم کے تنزل کا زمانہ ہو، اقبال نے اس سے منہ موڑ لیا ہو، اور زمانہ کی نگاہیں اس سے پھری ہوئی ہوں، اس وقت اس مسلک پر ثبات و استقامت اور اس جماعت سے انتساب و نسبت بڑے شیر مردوں کا کام اور بڑی وفاداری اور نمک حلالی کی بات ہے۔

اسلام پر قائم رہنا، اس سے اپنی نسبت قائم کرنا اور علانیہ اس کے شعائر کا اظہار

اس وقت بھی سعادت و فخر کی بات ہے، اور اس میں اس وقت بھی مزا ہے، جب حالات اس کے لئے سازگار ہوں اور جب مسلمانوں کی کامیابی کا دور اور دنیا میں اسلام کا دور دورہ ہو اور کسی معاملہ میں ان کو ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑتا ہو، لیکن امتحان و آزمائش کے موقعہ پر وفاداری اور جاں نثاری میں جو لذت ہے وہ لذت کسی چیز میں نہیں، یہ وہ وقت ہے، جب حق پر قائم رہنے والوں، حق و صداقت کی تبلیغ کرنے والوں، اور اپنے عقیدے و ضمیر کے خاطر مفادات، اور اعزازات کی قربانی کرنے والوں کو اس دنیا ہی میں جنت کا مزا آنے لگتا ہے، اور ان کے بدن کے روئیں روئیں سے خدا کی حمد و شکر کا ترانہ بلند ہوتا ہے۔ اقبال نے شاید اسی موقعہ کے لئے کہا تھا۔ ع

بہشتے بہر پاکان حرم ہست   بہشتے بہر ارباب ہمم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش   بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست(۱)

---

(۱) ماخوذ از مطبوعہ تقریر "دو انسانی چہرے قرآنی مرقع میں۔" ص ۲۰ تا ۲۴

"میں سوچنے لگا کہ میری آج کی تقریر کا موضوع کیا ہو، مجھے احساس ہوا کہ گفتگو کا دائرہ تنگ اور موقع نازک ہے، ایسے وقت میں قرآن نے میری دستگیری کی اور قرآن ہمیشہ ہی متحیر اور پریشان آدمی کی دستگیری......اور......رہنمائی کرتا ہے، اسے خدا کا الہام اور اس کی توفیق کہئے کہ استاذ عبدالرزاق فیاض نے اپنی شیریں اور گونجنے والی آواز میں نماز سے پہلے سورہ انبیاء کی تلاوت کی تھی، میں نے اسی سورہ کی ایک آیت "لقد أنزلنا الیکم کتابا فیہ ذکرکم افلا تعقلون" کو لے لیا اور اس آیت کریمہ نے گفتگو کا ایک وسیع میدان میرے سامنے کر دیا، ایسی گفتگو جو دلوں کو چھوتی تھی، زندگی سے جس کا گہرا تعلق تھا اور جو صورت حال پر منطبق بھی ہوتی تھی۔"

قصص وواقعات

"قرآن مجید کے بعد:

میں:

تاریخ انسانی کا، اقوام و ملل کی تاریخ کا بھی، امتِ اسلامیہ کی تاریخ کا بھی تہذیبوں، فلسفوں، سلطنتوں اور اصلاحی، تربیتی اور انقلابی تحریکات و مساعی کی تاریخ کا بھی۔ ایک حقیر طالب علم ہوں......

میں:

تاریخ کو قرآن مجید کی تفسیر کہنے کی جرأت تو نہیں کر سکتا لیکن قرآن کی تصدیق ضرور کہوں گا، یعنی قرآن مجید میں سننِ الٰہیہ کا جو تذکرہ ہے اور کہا گیا ہے:- ﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيلاً وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَحْوِيلاً﴾ (فاطر: ۴۳)"آپ اللہ کے دستور کو کبھی بدلتا ہوا نہ پائیں گے، اور نہ آپ اللہ کے دستور کو متغیر ہوتا ہوا دیکھیں گے"۔

تاریخ :- ایک شاہد عینی کے طورپراس کا دستاویزی ثبوت پیش کرتی ہے، اور دکھاتی ہے کہ اقوام و ملل، تہذیبوں اور حکومتوں کی تاریخ میں بھی، اور افراد کی زندگی میں بھی کس طرح قرآن مجید کی بیان کی ہوئی سننِ الٰہیہ کا ظہور ہوتا رہا ہے، ہو رہا ہے، اور ہوتا رہے گا، قرآن مجید میں افراد سے لے کر انسانی گروہوں اور ملتوں اور قوموں کی زندگی تک میں تعلیماتِ آسمانی اور فطرتِ انسانی دونوں سے انحراف کے جو نتائج بیان کئے گئے ہیں، اور ان کی پیشین گوئی کی ہے، وہ کس طرح صحیح ہوئے ہیں، اور کس کس طرح ان کا ظہور ہوا ہے؟"۔

(حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی)

حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ

(جیل کے ساتھیوں کو توحید کا وعظ)

”ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ. اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ. وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِيْ اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ.“

”یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھائی ہیں، جو لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، میں ان کا مذہب چھوڑے ہوئے ہوں، اور اپنے باپ دادا ابراہیمؑ و اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کے مذہب پر چلتا ہوں“۔

(یوسف: ۳۷-۳۸)

جب حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس دو قیدی جیل خانہ کے خواب کی تعبیر پوچھنے گئے تو انھوں نے فرمایا: ”ذلکما مما علمنی ربی“ یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائی ہیں!

آغاز گفتگو کا حسین پیرایہ

گفتگو کا آغاز کس حسین پیرایہ سے کیا گیا ہے، اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے، ایک اعلیٰ درجہ کی بات کے لئے گفتگو کا پیرایہ بھی اعلیٰ درجہ کا ہونا چاہئے، آداب کلام میں

اس کی بڑی اہمیت ہے، اگر ایسا نہ ہو تو بات کا حسن ختم ہو جاتا ہے، جس طرح ایک پُر شکوہ اور حسین عمارت کے لئے ضروری ہے کہ اس کا پھاٹک بھی دیدہ زیب اور عالیشان ہو جس کو دیکھتے ہی عمارت کی اہمیت معلوم ہو اور آدمی اندر داخل ہونے میں سہولت و مسرت محسوس کرے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی گفتگو کا آغاز اس طرح فرمایا کہ پہلے تو ان کو مطمئن کیا کہ وہ ان خوابوں کی تعبیر دے سکتے ہیں، اور جس مقصد سے یہ لوگ ان کے پاس آئے ہیں، اس میں ان کو کامیابی ہوگی، انھوں نے انتخاب میں کوئی غلطی نہیں کی ہے وہ صحیح منزل پر آگئے ہیں، جس شخص سے انھوں نے رجوع کیا ہے وہ اس کام کا اہل ہے جس کی انھیں ضرورت ہے، اور جو ان کو اس ذہنی الجھن سے نکال کر صحیح طریقۂ عمل بتا سکتا ہے۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ ایک ضرورت مند یہ چاہتا ہے کہ اس کی ضرورت جلد سے جلد پوری ہو جائے، ایک مریض جب کسی معالج کے پاس جائے کہ وہ اس کے مرض کی تشخیص کر کے دوا تجویز کرے اور وہ معالج ٹال مٹول کرنے لگے یا یہ کہنے لگے میں کتابیں دیکھ کر بتا سکوں گا، ذرا میں فلاں ڈاکٹر، فلاں حکیم سے مشورہ کرلوں تو مریض کا دل ٹوٹ جائے گا، اور وہ مایوس ہو کر واپس چلا جائے گا، اور شاید دوبارہ کبھی اس معالج کی طرف رخ بھی نہ کرے، لہٰذا گفتگو کا پہلا جزو یہ ہوتا ہے کہ طالب حاجت کے دل میں اعتماد پیدا کر دیا جائے کہ وہ جس کے پاس آیا ہے، وہ کاربر آری کی صلاحیت رکھتا ہے، اور اس کی ضرورت پوری ہو جائے گی، **"قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ"** فرمایا: جو کھانا تم کو ملنے والا ہے وہ آنے نہیں پائے گا کہ

میں اس سے پہلے تم کو ان کی تعبیر بتادوں گا، یعنی ان کی ضرورت بلا تاخیر پوری کر دی جائے گی، اس طرح کہ وہ جو پوچھنا چاہتے ہیں، اس کا جواب ان کو بعجلت مل جائے گا، ظاہر ہے کہ وہ دونوں قیدی تھے، اور جیل خانہ کے قوانین کے پابند، زیادہ دیر تک حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے، لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تمھارا کھانا (جو آیا کرتا ہے) پہونچنے بھی نہ پائے گا کہ میں تم کو خواب کی تعبیر بتا کر رخصت کر دوں گا۔

دعوت کی طرف روئے سخن

یہ نبی کا کلام تھا اور اس میں ایک طرح کی خود ستائی کی بو تھی، اس میں اپنی تعریف کی بو نکلتی تھی اور یہ وہم ہو سکتا تھا، اس لئے انھوں نے فوراً فرمادیا:-

ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِىْ رَبِّىْ. یہ ان باتوں میں سے جو میرے رب نے مجھے سکھائی ہیں۔

آپ اس ماحول کو اپنی نگاہ میں رکھئے جس میں یہ دعوت دی گئی ہے، اس حکیمانہ اسلوب میں جس کی مثال اگر کہیں ملتی ہے تو صرف رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں، لیکن اس کے علاوہ دعوتِ دین اور داعیانِ دین کی طویل تاریخ میں مجھے اس سے زیادہ نازک ماحول نہیں نظر آتا اور نہ اس سے زیادہ لطیف پیرایۂ بیان ملتا ہے، جہاں سے بات شروع کی ہے، "**لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖ**" سے آیت "**ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِىْ رَبِّىْ.**" تک پڑھئے، اور دیکھئے کس طرح رب کے لفظ سے توحید کے وعظ کا راستہ نکال لیا ہے کیا اس سے زیادہ سہل، لطیف، قابل قبول اور تیزی سے بات کا رخ بدلا جا سکتا

ہے؟ گویا وہ فرمارہے ہیں میں تمھاری اس موقع پر مدد تو کر سکتا ہوں، مجھے اللہ نے یہ علم عطا فرمایا ہے، لیکن یہ علم کیوں عطا کیا ہے؟ "اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ"۔ یہ میری ذہانت کا نتیجہ نہیں ہے، میری نجابت کا بھی یہ نتیجہ نہیں...... حالانکہ یہ دونوں چیزیں موجود تھیں اور بدرجۂ کمال و جمال، لیکن انھوں نے فرمایا "اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَھُمْ بِالْآخِرَةِ ھُمْ کَافِرُوْنَ" اس علم کا اضافہ اس لئے ہوا کہ میں نے اس قوم کی ملت چھوڑ دی جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتی اور آخرت کی منکر تھی "وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِیْ اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْحَاقَ وَیَعْقُوْبَ" اور اس کے بعد انھوں نے وہیں سے توحید کے وعظ کا مدخل پیدا کر لیا، عزیزو! تم جس کو بڑا مسئلہ سمجھ رہے ہو اور جو مشکل تم کو یہاں لے کر آئی ہے، اس سے بڑی مشکل در پیش ہے، وہ ہے عقیدہ، یہ خواب جو تم نے دیکھا، خواب تو خواب ہی ہوتا ہے، لیکن معاملہ بیداری کا ہے، معاملہ زندگی کے مستقبل کا ہے، معاملہ ابدی اور دائمی زندگی کا ہے، مان لو تم کو خواب کی تعبیر دینے والا دنیا میں، کوئی بھی نہ ملے تب بھی کوئی بڑا نقصان نہیں، لیکن اس خواب ہستی کی تعبیر دینے والا اگر کوئی نہ ملا کہ دنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے؟ کائنات کا فاطر و خالق کون ہے؟ اس کی صحیح معرفت نہ ملی تو اصل خطرہ یہ ہے، پھر انھوں نے اتنا ہی Dose دیا جتنا Dose دینا چاہئے تھا، وہ جانتے تھے کہ یہ غرض لے کر آئے ہیں، ان کو ایک ذہنی پریشانی ہے، یہ اتنا صبر نہیں کر سکتے کہ ان کو ایک یا دو گھنٹہ تبلیغ کروں، اس لئے انھوں نے بالکل صحیح احساس تناسب کے ساتھ جو ایک حاذق طبیعت رکھتا ہے اور ایک داعی حکیم رکھتا ہے، اتنا ہی ڈوز دیا جتنے ڈوز کے وہ محتمل تھے۔

دل کا دروازہ کبھی کبھی کھلتا ہے

آپ اس تناسب کو دیکھئے، اس میں جمال یوسفی پورے طور پر عیاں ہے، اس میں نہ کمی ہے نہ زیادتی، ناپ تول کر جہاں رُک جانا چاہئے وہاں رُک گئے، یعنی توحید کی پوری بات کہی لیکن اس کو اتنا دراز نہیں کیا کہ وہ لوگ یہ کہنے لگتے کہ آپ اگر خواب کی تعبیر دے سکتے ہیں تو دیجئے، ورنہ پھر فرصت سے آئیں گے۔ حضرت یوسفؑ نے دیکھا کہ ان کے دل و دماغ کا دروازہ کھلا ہے، اور دل کا دروازہ کبھی کبھی کھلتا ہے، قسمت سے کھلتا ہے، کبھی کسی غرض سے کھلتا ہے، کبھی کسی پریشانی سے کھلتا ہے، اس دروازہ سے جو اصل پیغام ہے وہ داخل کر دینا چاہئے، لیکن وہ پیغام اس سبک روحی کے ساتھ داخل ہو کہ وہ دروازے بند نہ ہو جائیں اور احتجاجاً بند نہ ہو جائیں، میں تو حیران رہ جاتا ہوں اور افسوس ہے کہ یہ پورا حصہ بائبل سے حذف ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کس کی تصنیف ہے اور قرآن کس کا نازل کیا ہوا ہے، ان کو خوب اندازہ تھا کہ یہ کتنی بات کے محتمل ہو سکتے ہیں، اتنی ہی بات انھوں نے کہی، مریض چاہتا ہے کہ اس کو اس کے درد کا مداوا جلد مل جائے تو انھوں نے کہا "قَبْلَ اَنْ یَّاْتِیَکُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهٖ" تمھارا راشن جو مقرر ہے اس کے آنے سے پہلے تعبیر دے دوں گا، مخاطب کو یہی دوا اطمینان چاہئیں، اس کی دوا مل سکتی ہے یا نہیں؟ اور جلد ملتی ہے یا نہیں؟ اس درمیان میں توحید کا وعظ کہہ دیا۔(۱)

(۱) "حدیث پاکستان" از ص ۱۴۷ تا ص ۱۴۸۔ "دعوت و تبلیغ کا معجزانہ اسلوب" ص ۵۱ تا ص ۵۴ سے مشترک اخذ و تلخیص۔

حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کا قصہ

اور ایمان کی قدر و قیمت

فَانطَلَقَا حَتّٰی إِذَا لَقِيَا غُلٰماً فَقَتَلَهُ. قَالَ أَقَتَلْتَ نَفساً زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفسٍ. لَقَدْ جِئْتَ شَيْئاً نُكراً. ...... أَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَاناً وَّكُفراً. فَأَرَدْنَا أَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْراً مِّنْهُ زَكوٰةً وَأَقْرَبَ رُحْماً. (الکہف۔ ۷۴-۸۰-۸۲)

مجھے صرف چند باتیں عرض کرنی ہیں ایک تو یہ کہ اگر میں آپ سے کوئی معاہدہ کرتا تو یہ کرتا کہ آپ اس احساس و شعور کو زندہ رکھیں کہ ایمان جان سے زیادہ عزیز ہے، ایمان جان سے زیادہ پیارا ہے۔ اور ہم یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ بچہ کی جان سے، اس کی صحت سے، اس کا ایمان زیادہ عزیز ہے، ایمان زیادہ قیمتی ہے۔

اس کے لئے میں آپ کے سامنے قرآن کریم کی دو آیتوں سے استدلال کرتا ہوں، اور جب بھی پڑھتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے، اور وہ حیرت ختم نہیں ہوتی، لیکن مجھے اندیشہ بلکہ میرا احساس یہ ہے کہ بہت کم لوگوں نے اس سے صحیح نتیجہ نکالا

ہے، اسلاف کرام اور مفسرین عظام کا ذہن بیشک ان چیزوں کی طرف گیا ہوگا، جہاں ہمارا ذہن جا نہیں سکتا، لیکن آج کے پڑھنے والے بہت کم یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔

قرآن مجید کی سورۂ کہف میں آخر یہ قصہ بیان کیا گیا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک لڑکے کی جان لے لی، اور وہ بھی ایک اولوالعزم اور ایک عظیم الشان پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موجودگی اور رفاقت میں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے جب پوچھا کہ آپ نے بچہ کے ساتھ یہ کیا معاملہ کیا؟ اس کا کیا جرم تھا؟ اور کیا وہ جرم ایسا تھا کہ اس کی جان لے لی جائے؟ حضرت خضرؑ نے کہا کہ اس کے ماں باپ دونوں صاحب ایمان اور نیک تھے۔ اور یہ بچہ فتنہ بننے والا تھا۔ اگر یہ زندہ رہ جاتا تو اپنے ماں باپ کے ایمان کے لئے خطرہ بنتا، تو میں نے اس لئے ان کو اس خطرہ سے بچا لیا اور اس کی جان لے لی کہ اللہ اور اولاد دے گا، آج کہیں پوری دنیائے اسلام میں بڑی سے بڑی آزاد حکومت اور شرعی حکومت بھی اس پر عمل نہیں کر سکتی، آپ سب جانتے ہیں کہ محض اس خطرے سے کہ یہ بچہ کبھی فتنہ بن جائے گا (اور بہت سے بچے فتنہ بن رہے ہیں، اور ہم دیکھ رہے ہیں) اس کی جان لینے کی اجازت نہیں، اور جان لینا تو جان لینا ہے۔ کوئی اور بہت بڑی سزا معصومیت کی حالت میں نہیں دی جا سکتی، اور یہاں سوال پیدا ہوگا کہ پھر قرآن کریم نے قیامت تک کے لئے اس قصہ کو سورۂ کہف میں داخل کر کے اُسے زندہ جاوید کیوں بنا دیا؟ یہ کہ قیامت تک پڑھا جائے گا۔ تو اس نے ایسا اس لئے کیا تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ ایمان کی یہ قیمت ہے۔ اگرچہ آج اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ اور تشریعی طور پر اس پر عمل کرنا حرام بھی ہے اور قتل ناحق ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اسے قرآن مجید کی سورۂ کہف میں بیان فرما رہا ہے، اُسے ایک

پیغمبر اور اس کے رفیق کا (جن کا کم سے کم درجہ اولیاء اللہ کا ہوگا) فعل بتایا جارہا ہے۔ آخر اس کی حکمت کیا ہے؟

حکمت یہی ہے کہ ہم آپ سوچیں کہ ایمان وہ قیمتی چیز ہے کہ اس کے لئے حضرت خضر علیہ السلام نے (جو بڑے فقیر، بڑی عارف باللہ اور بڑے صاحب بصیرت اور مقبول عند اللہ تھے) یہ کام کیا کہ اس بچے کی جان لے لی، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ قصہ سنایا۔ اور قرآن مجید میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ تاکہ پڑھنے والے یہ سمجھیں کہ ایمان اتنی بڑی چیز ہے کہ اس کے لئے جو چیز خطرہ بننے والی ہے، اس خطرہ کو بھی دور کرنا چاہئے، چاہے وہ کیسی ہی پیاری اور عزیز کیوں نہ ہو، مگر ہم لوگ اس طرح نہیں سوچتے۔

قرآن کریم کا یہ اعجاز اور الہامی نکتہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس قصہ میں بیان فرمایا ہے، کہ حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام ایک بستی میں گئے اور وہاں انھوں نے دیکھا کہ ایک دیوار مسمار ہونے والی ہے، اس موقع پر وہ زبان حال سے گویا کہہ رہے تھے کہ ہم پردیسی ہیں اور ہماری ضیافت ہونی چاہئے اور زبان قال سے بھی جیسا کہ قرآن مجید سے اشارہ معلوم ہوتا ہے لیکن پوری بستی میں کسی نے خبر نہیں لی، اور کھانا پیش نہیں کیا، اور وہ بھوکے رہے، مگر دیوار جو گر رہی تھی حضرت خضر علیہ السلام اس کے سنبھالنے میں لگ گئے اور آپ جانتے ہیں کہ گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنا کتنا مشکل ہوتا ہے، حیرت کی بات ہے کہ کہاں سے وہ مسالہ لائے، اور انھوں نے کتنی محنت کی ہوگی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا عجب تضاد ہے، جنھوں نے کھانے تک کی خبر نہیں لی، ہم سے کھانے کو نہیں پوچھا، ان کا کہاں سے یہ حق تھا اور کیسا احسان تھا کہ آپ نے

اس دیوار کو جس کی مرمت میں وہ مزدور لگاتے، پیسے خرچ کرتے اور خود توجہ کرتے۔ آپ نے اس دیوار کو سنبھال دیا تو انھوں نے کہا۔

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌلَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحاً. فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَا اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِنْ رَّبِّكَ۔ (سورۂ کہف)

یہ دیوار دو یتیم بچوں کی تھی جن کا باپ نیک تھا، یہ دیوار اگر گر جاتی تو جو خزانہ اندر دبا ہوا تھا وہ کھل جاتا، سامنے آجاتا اور لوگ لوٹ لے جاتے، اور ان کو غربت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اور ان کے پاس کچھ نہ رہتا۔ ایک طرف جان لی ایمان کے خطرے سے، ایک طرف دیوار سنبھالی ایمان کی فضیلت کی وجہ سے، یعنی وہ خود بھی نہیں بلکہ ان کے باپ نیک تھے معلوم نہیں ان کے انتقال کو کتنا زمانہ ہو گیا تھا۔

لیکن حضرت خضر علیہ السلام نے اس ایمان کی اتنی قیمت جانی کہ اس دیوار کو سنبھالا، اور اس کو کھڑا اور ٹھیک کر دیا۔ اور وہ خزانہ دبا رہا۔

یہ دونوں واقعے اللہ تعالیٰ نے ایک ہی سورۃ میں اوراوپر نیچے بیان کئے تاکہ آپ کو ایمان و کفر کا فرق معلوم ہو، ایک طرف ایمان کی یہ قیمت کہ جو بچہ خطرہ بننے والا تھا اس کو ختم کر دیا، اور ایک طرف ایمان کی یہ قیمت کہ جن کا باپ نیک تھا ابھی ان کا وقت نہیں آیا تھا۔ ابھی وہ سنِ بلوغ کو نہیں پہنچے تھے اور وہ دو یتیم بچے تھے، ان کا باپ چونکہ صاحب ایمان تھا، اور نیک تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ایمان کی قدر دانی میں دیوار سنبھالنے کا انتظام فرمایا اور الہام کے ذریعہ حضرت خضر علیہ السلام نے وہ دیوار سنبھال لی۔

ایمان کو جان پر مقدم سمجھنا ایمان کا تقاضا ہے

بس میں یہ کہتا ہوں کہ اس سے آپ ایمان کی قیمت سمجھئے اب یہ حکم نہیں ہے کہ جس کو آدمی سمجھے اس کو اس طرح ختم کردے بلکہ، بہتر یہ ہے کہ اگر خطرہ سمجھے تو اس کو اس دیوار کی طرح سنبھالے، جو گر رہی تھی ویسے ہی اپنی اولاد کو اور آئندہ آنے والی نسل کو گرتی ہوئی دیوار کی طرح کھڑا کردے، اس کو مضبوط بنائے، مستحکم کرے، مسئلہ صرف اتنا ہے کہ اگر ہمارے ذہن اور ہمارے عقیدے نے اس کو قبول کرلیا، کہ ایمان جان سے زیادہ عزیز ہے تو پھر علاج و معالجہ اور کپڑے بنانے اور اس کی پوشاک کا خیال کرنے اور پھر آگے بڑھ کر اعلیٰ تعلیم دلانا، ان سب سے زیادہ ضروری یہ ہوگا کہ ان کے دل میں ایمان بٹھایا جائے، ان کے علاج و معالجہ سے، کپڑے بنانے سے، انھیں دعائیں دینے سے، اور انھیں دیکھ کر خوش ہونے سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ ان کے ایمان کا تحفظ کرے، اور ایسا انتظام کرے کہ ایمان جانے نہ پائے، آخری بات میری طرف سے یاد رکھئے کہ ایمان جان سے زیادہ عزیز ہے(۱)۔

---

(۱) ماخوذ از۔ تعمیر حیات لکھنؤ۔ ۱۰/ اگست ۱۹۹۸ء

قرآن ایک صاف شفاف آئینہ ہے

جس میں افراد اور قومیں اپنا چہرہ دیکھتی اور اپنا مقام پہچانتی ہیں

میں نے ایک عزیز دوست سے سورۃ الانبیاء کی تلاوت سنی تو اس کی ایک عبرت آموز آیت نے میرے ذہن میں بے شمار معانی کے دریچے کھول دیئے۔ ارشاد باری ہے:-

لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ. اَفَلَا تَعقِلُوْنَ.
(الانبیاء۔۱۰)

ہم نے تمھاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی ہے، جس میں تمھارا تذکرہ ہے تو تم غور کیوں نہیں کرتے۔؟

یہ آیت ہمیں...... بتاتی ہے کہ قرآن ایک صاف شفاف، سچا، وفادار و دیانت دار آئینہ ہے، جس میں ہر شخص اپنے خدوخال دیکھ سکتا ہے، معاشرہ میں اپنا مقام پہچان سکتا ہے، اور خدا کے نزدیک اپنا مرتبہ معلوم کر سکتا ہے، کیونکہ قرآن انسانوں کے اخلاق و صفات بیان کرتا ہے، اور اس میں انسانیت کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہر طرح کے نمونہ کی تصویریں موجود ہیں۔ "فِيْهِ ذِكْرُكُمْ" "یعنی اس کتاب میں تمھارا بیان ہے، تمھارے حالات و اوصاف مذکور ہیں، جیسا کہ بہت سے علماء نے سمجھا ہے، سلف

قرآن کو ایک زندہ، بولنے والی اور زندگی سے لبریز کتاب تصور کرتے تھے، ان کے نزدیک قرآن کوئی تاریخی اور آثار قدیمہ کی چیز نہیں تھی، جو صرف ماضی اور اگلے وقتوں کے لوگوں سے بحث کرتی ہو اور جس کا زندہ لوگوں سے، بدلتی ہوئی انسانی زندگی اور انسانیت کے ان بے شمار ولا محدود نمونوں سے جو ہر زمان ومکان میں موجود رہتے ہیں کوئی تعلق نہ ہو۔

ہمارے اسلاف اپنے اخلاق واوصاف اور اپنے اندرون کو بخوبی جانتے تھے، ہر چیز ان کے سامنے روشن اور عیاں ہوتی تھی، وہ اسی قرآن سے رہنمائی حاصل کرتے تھے، اسی عجیب وغریب کتاب میں اپنے چہرے ڈھونڈتے اور اپنے اخلاق واطوار کی سچی اور صحیح تصویر تلاش کرتے تھے، اور بہت آسانی سے خود کو اس کتاب میں پا جاتے تھے، اور پہچان لیتے تھے، اگر ذکر خیر ہوتا تو خدا کا شکر ادا کرتے اور کچھ اور ہوتا تو استغفار کرتے اور اپنی اصلاح کی کوشش کرتے تھے۔

حضرت احنف بن قیسؒ کا واقعہ

اس آیت کی تلاوت پر مجھے سیدنا احنف بن قیس کا ایک واقعہ یاد آیا، حضرت احنف بن قیس کبار تابعین میں سے ہیں، سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے مخصوص ترین اصحاب میں ان کا شمار ہے، حلم میں ضرب المثل تھے، مگر اس کے باوجود جب غصہ ہو جاتے تو ان کی غیرت وحمیت میں جوش آجاتا، لوگ کہتے تھے کہ جب احنف کو غصہ آتا ہے تو ان کے ساتھ ایک لاکھ تلواریں غضبناک ہو جاتی ہیں، یہ واقعہ میں نے ابو عبداللہ محمد بن النصر المروزی (متوفی ۲۹۴ھ) کی تصنیف "قیام اللیل" میں

پڑھا ہے، مصنف امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور گمان غالب ہے کہ اس کتاب کی تالیف آپ ہی کے شہر بغداد میں ہوئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک روز حضرت احنف بن قیس تشریف فرما تھے کہ انھوں نے کسی کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا تو چونک پڑے اور فرمایا، ذرا قرآن مجید لانا میں اپنا ذکر تلاش کروں اور معلوم کروں کہ میں کس کے ساتھ ہوں اور کس سے مشابہ ہوں۔

قرآن مجید کھولا تو اس آیت پر نظر پڑی جس میں کچھ لوگوں کے متعلق ارشاد ہے:-

كَانُوْا قَلِيْلاً مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ. وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ. وَفِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ. (الذاریات۔ ۱۷۔ ۱۹)

رات کے تھوڑے سے حصے میں سوتے تھے، اور اوقات سحر میں بخشش مانگا کرتے تھے، اور ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے دونوں کا حق ہوتا تھا۔

پھر یہ آیت گزری:-

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفاً وَّطَمَعاً وَّمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ. (السجدہ۔ ۱۶)

ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں، (اور) وہ اپنے پروردگار کو خوف و امید سے پکارتے ہیں، اور جو مال ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

پھر ان کے سامنے ایک گروہ آیا جس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّداً وَّقِيَاماً. (الفرقان۔ ۶۴)

اور جو اپنے پروردگار کے آگے سجدہ کر کے عجز وادب سے کھڑے رہ کر راتیں بسر کرتے ہیں۔

پھر ان کا گذر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کا قرآن مجید میں اس طرح ذکر ہے:-

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ. وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ. (آل عمران۔۱۳۴)

جو آسودگی اور تنگی میں (اپنا مال خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں، اور غصہ کو روکتے ہیں، اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں، اور خدا نیکو کاروں کو دوست رکھتا ہے۔

پھر ان کے سامنے کچھ نمونے آئے جن کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:-

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ. وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (الحشر۔۹)

اور دوسروں کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں، خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو، اور جو شخص حرص نفس سے بچالیا گیا تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں۔

پھر یہ آیت سامنے آئی:-

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ. وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوْا الصَّلٰوةَ. وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ. (الشوریٰ۔۳۷۔۳۸)

اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے پرہیز کرتے ہیں، اور جب غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں، اور جو اپنے پروردگار کا فرمان قبول کرتے ہیں، اور نماز پڑھتے ہیں، اور اپنے کام آپس کے مشورے سے کرتے ہیں، اور جو مال ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

پھر رک گئے اور فرمایا، اے اللہ! یہاں تو میں اپنے آپ کو نہیں پا رہا ہوں اور

دوسری جگہ تلاش کرنا شروع کیا تو ایک جماعت کا تذکرہ دیکھا:-

إِنَّهُمْ كَانُوٓا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ. وَيَقُوْلُوْنَ أَئِنَّا لَتَارِكُوٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ. (الصّٰفّٰت۔۳۵۔۳۶)

ان کا یہ حال تھا کہ جب ان سے کہا جاتا تھا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں تو غرور کرتے تھے، اور کہتے تھے بھلا ہم ایک دیوانہ شاعر کے کہنے سے کہیں اپنے معبودوں کو چھوڑ دینے والے ہیں۔

پھر ان کا ذکر گزرا:-

وَإِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ.

(الزمر۔۴۵)

اور جب تنہا خدا کا ذکر کیا جاتا ہے، تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں، اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے، خوش ہو جاتے ہیں۔

پھر ان لوگوں کا تذکرہ سامنے آیا جن سے سوال کیا جائے گا:

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ. قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ. وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ. وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ. وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ. حَتّٰٓى اَتٰنَا الْيَقِيْنُ.

(المدثر۔۴۲۔۴۷)

(سوال ہوگا) تم دوزخ میں کیوں پڑے، وہ جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے، اور نہ فقیروں کو کھانا کھلاتے تھے، اور اہل باطل کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے، اور روز جزا کو جھٹلاتے تھے، یہاں تک کہ ہمیں موت آ گئی۔

پھر ٹھہر گئے اور فرمایا: اے اللہ میں تیری بارگاہ میں ان لوگوں سے براءت ظاہر کرتا ہوں، اس کے بعد ورق الٹتے رہے، اور تلاش کرتے رہے، آخر کار جب اس آیت پر نظر پڑی

وَآخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلاً صَالِحاً وَّاٰخَرَ سَيِّئاً. عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ. إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (التوبہ۔ ۱۰۲)

اور کچھ لوگ اور ہیں کہ اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں، انھوں نے اچھے اور برے عملوں کو ملا جلا دیا تھا، قریب ہے کہ خدا ان پر مہربانی سے توجہ فرمائے بیشک خدا بخشنے والا مہربان ہے(۱)۔

تو فرمانے لگے: "خداوندا! میں انھیں لوگوں میں سے ہوں(۲)"۔

ہم بھی اپنا تذکرہ تلاش کریں

آیئے ہم بھی اپنا ذکر اور اپنی تصویر پوری دیانت داری اور سنجیدگی سے قرآن میں تلاش کریں قرآن بشیر بھی ہے، اور نذیر بھی، صالحین کے ساتھ کفار و مشرکین کا بھی تذکرہ اس میں موجود ہے، قرآن افراد اور جماعتوں دونوں کی تصویر کشی کرتا ہے۔ ارشاد ہے:-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ. وَإِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ. وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ. وَإِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ. وَلَبِئْسَ الْمِهَادَ. (البقرۃ۔ ۲۰۴۔ ۲۰۶)

اور کوئی شخص تو ایسا ہے جس کی گفتگو دنیا کی زندگی میں تم کو دل کش معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے مافی الضمیر پر خدا کو گواہ بناتا ہے، حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے اور جب پیٹھ پھیر کر چلا جاتا ہے(۱) تو زمین میں دوڑتا پھرتا ہے تاکہ اس میں فتنہ انگیزی کرے، اور کھیتی کو (برباد) اور (انسانوں اور حیوانوں کی) نسل کو نابود کردے اور خدا فتنہ انگیزی کو پسند نہیں کرتا اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ خدا سے خوف کرو، تو غرور اسکو گناہ میں پھنسا دیتا ہے، سو ایسے کو جہنم سزاوار ہے، اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

---

(۱) آیات کا ترجمہ مولانا فتح محمد صاحب کے ترجمہ قرآن سے برائے نام فرق کے ساتھ منقول ہے۔
(۲) کتاب قیام اللیل طبع ملتان ۱۳۲۰ھ ص ۱۳۔ (۳) بعض لوگوں نے "تولّی" کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ جب اس کو حکومت اور اقتدار حاصل ہوتا ہے۔

پھر اس کے بعد ارشاد ہے:-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللهِ وَاللهُ رَؤُوْفٌ بِالْعِبَاد. (البقرة-۲۰۷)

اور کوئی شخص ایسا ہے کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اپنی جان بیچ ڈالتا ہے، اور خدا بندوں پر بہربان ہے۔

ایک جماعت کا ذکر اس طرح ہے:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِي سَبِيْلِ اللهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ. ذَالِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ. وَاللهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ. (المائدہ-۵۴)

اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا، تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا، جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں، اور جو مومنون کے حق میں نرمی کریں، اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں، خدا کی راہ میں جہاد کریں، اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں، یہ خدا کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے، اور خدا بڑی کشائش والا، اور جاننے والا ہے۔

ایک دوسری جماعت کا تذکرہ اس طرح ہے:-

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْا اللهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلاً. (الاحزاب-۲۳)

مومنوں میں کتنے ہی ایسے شخص ہیں، جو اقرار انھوں نے خدا سے کیا تھا، اس کو سچ کر دکھایا، تو ان میں بعض ایسے ہیں، جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے، اور بعض ایسے ہیں جو انتظار کر رہے ہیں، اور انھوں نے (اپنے قول کو) ذرا بھی نہیں بدلا۔

شکر اور احسان شناسی کی ترغیب دلاتے ہوئے قرآن اور ان کے متبعین کا ذکر کرتا ہے، اور ناشکری، احسان فراموشی، غرور اور حسن سلوک کا جواب بد سلوکی سے دینے کی مذمت کرتے ہوئے، اور اس کے انجام بد سے ڈراتے ہوئے فرماتا ہے:-

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللهِ كُفْراً وَّأَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَالْبَوَارِ.

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے خدا کے احسان کو ناشکری سے بدل دیا، اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں اتارا۔

اور اس کی مثال ایک بستی سے دیتا ہے، جس نے خدا کی نعمتوں کو فراموش کر دیا۔ اور جس کے افراد اپنی خوشحالی پر اترانے لگے، ارشاد ہوتا ہے:-

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَداً مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ. (النحل۔ ۱۱۲)

اور خدا ایک بستی کی مثال بیان فرماتا ہے کہ (ہر طرح) امن چین سے بستی تھی، ہر طرف سے رزق بافراغت چلا آتا تھا، مگر ان لوگوں نے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کی، تو خدا نے ان کے اعمال کے سبب ان کو بھوک اور خوف کا لباس پہنا کر (ناشکری کا) مزہ چکھادیا۔

یہ لازوال انسانی نمونے ہیں

یہ انسانی اور اخلاقی نمونے جو قرآن نے مختلف ناموں سے پیش کئے ہیں کہیں کسی مطلق العنان فرمانروا کے نام سے مثلاً فرعون، کہیں کسی سرکش وزیر یا امیر کے نام سے مثلاً ہامان، کہیں کسی متکبر اور بخیل سرمایہ دار کے نام سے مثلاً قارون، کہیں کسی ظالم و جابر قوم کے نام سے مثلاً عاد، کہیں کسی مشہور اور ماہر صنعت قوم کے نام سے مثلاً ثمود، یہ تمام لازوال انسانی نمونے ہیں، جو کسی زمان و مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، اور یہ تمام نمونے انسانی فطرت کے مختلف کمزور پہلوؤں اور گوشوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے ان افراد اور جماعتوں کے انجام پر بھی روشنی ڈالی ہے اور صفائی کے ساتھ کہا ہے کہ جو بھی ان کے نقش قدم پر چلے گا اور ان کو اپنا رہنما اور قائد تسلیم کرے گا، اس کا انجام بھی وہی ہوگا جو ان افراد اور جماعتوں کا ہوا۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ. وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَراً مَّقْدُوْراً. (الاحزاب ۳۸)

جو لوگ پہلے گذر چکے ہیں ان میں بھی خدا کا یہی دستور رہا ہے، اور خدا کا حکم مقرر ہو چکا ہے۔(۱)

---

(۱) ماخوذ از دریائے کابل سے دریائے یرموک تک۔ ص ۲۰۳ تا ۲۱۳۔